مصلحین امت

از

ڈاکٹر احمد امین

ترجمہ

شیخ نذیر حسین ایم۔ اے

مصلحینِ امت

از

ڈاکٹر احمد امین

ترجمہ

شیخ نذیر حسین ایم۔ اے

مکتبہ علمیہ لیک روڈ۔ لاہور

-/6

مُصلحینِ اُمّت

از

ڈاکٹر احمد امین

ترجمہ

شیخ نذیر حسین ایم۔اے

مکتبہ علمیہ۔ لیک روڈ۔ لاہور

فہرست مضامین

نمبر شمار		
۱	مقدمہ مصنف	۷
۲	محمد بن عبدالوہاب	۱۱
۳	مدحت پاشا	۲۵
۴	سید جمال الدین افغانی	۵۱
۵	سر سید احمد خاں	۹۵
۶	سید امیر علی	
۷	خیر الدین پاشا تونسی	۱۱۳
۸	علی مبارک پاشا	۱۳۹
۹	عبداللہ ندیم	
۱۰	سید عبدالرحمٰن الکواکبی	
۱۱	شیخ محمد عبدہ	۱۹۹
۱۲	خاتمہ کلام	۲۴۷

دیباچہ مترجم

ڈاکٹر احمد امین عصر حاضر کے مشہور مصری مصنف اور ادیب تھے انہوں نے ایک غریب گھرانے میں جنم لیا تھا۔ ان کے باپ نے ان کی اچھی طرح تربیت کی اور اعلیٰ تعلیم دلائی۔ احمد امین نے مدرسۃ القضاء الشرعیہ میں تعلیم پا کر محکمہ شرعیہ میں بطور قاضی ملازمت کر لی چونکہ لکھنے پڑھنے کی طرف شروع ہی سے میلان تھا اس لئے محکمہ شرعیہ میں زیادہ دیر تک دل نہ لگا اور وہ جامعہ مصریہ میں عربی ادب کے استاد بن کر آ گئے اور ترقی کرتے کرتے پرنسپل کے عہدہ تک پہنچ گئے

وہ خالص علمی آدمی تھے ساری عمر مصر کی مشہور انجمن الجنۃ التالیف والترجمہ والنشر کے صدر رہے۔ اس انجمن نے عالم عرب کی ذہنی بیداری میں جو اہم حصہ لیا ہے وہ محتاج بیان نہیں یہ انجمن آج تک ڈیڑھ سو کے قریب کتابیں شائع کر چکی ہے جن میں نادر مخطوطات کی اشاعت کے علاوہ مغربی تصانیف کے تراجم بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹر احمد امین کا علمی کارنامہ ایک عوامی یونیورسٹی (جامعہ شعبیہ) کا قیام ہے جس میں رات کو مفت تعلیم دی جاتی ہے اس یونیورسٹی کا مقصد مصروف اور کم پڑھے لکھے لوگوں میں تعلیم کی اشاعت ہے یونیورسٹی سے اب تک ہزاروں آدمی مستفید ہو چکے ہیں۔

ان کی کتابوں فجر الاسلام (۱ جلد) ۔ ضحی الاسلام (۳ جلد) اور ظہر الاسلام (۴ جلد) نے عالم گیر شہرت حاصل کی ہے یہ عہد اسلام کی علمی اور فکری تاریخ ہے جس میں واقعات سے نتائج مستنبط کئے گئے ہیں۔ حیاتی اُن کی خود نوشت سوانح ہے۔

زیر نظر اوراق ان کی مشہور کتاب زعماء الاصلاح فی عصر الحدیث کا اردو ترجمہ ہے کتاب کا موضوع ان مصلح راہنماؤں کے حالات ہیں جنہوں نے گذشتہ دو صدیوں میں عالم اسلام کی خدمت کی ہے۔ مختلف

رہنماؤں نے اپنے زمانہ کے احوال وظروف اور اپنے ملک کے مزاج وطبیعت اور ثقافت کے مطابق دعوت اصلاح دی۔ کسی نے عقیدہ کی اصلاح اور خالص دین کی دعوت دی۔ کسی نے مسلمانوں کی پستی کا علاج تعلیم بتلایا تو کسی نے نظام حکومت کی اصلاح کی صدا لگائی۔ اپنے مشن کو کامیاب بنانے کے لئے ہر ایک نے جان کی بازی لگا دی اور اس راہ میں وہ مصائب برداشت کئے جو اولو العزم افراد ہی برداشت کر سکتے ہیں۔ کسی کو ملحد اور خائن سمجھا گیا۔ کسی کو حکومت وقت کا باغی قرار دیا گیا کسی کو دیس نکالا ملا تو کسی کو قتل کیا گیا۔ یہ اکابر آج زندہ نہیں ہیں لیکن ان کے کارنامے ہمارے لئے نمونہ عمل ہیں۔

اس کتاب کا میں نے امکان بھر بامحاورہ ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہوں اس کا فیصلہ قارئین کرام ہی کر سکیں گے۔

نذیر حسین

۳۰ اپریل ۱۹۶۳ء

(نوٹ) مرحوم مصنف کو اردو زبان سے عدم واقفیت کے باعث ہندوستان کی عظیم شخصیتوں اور نامور افراد کا علم نہیں ہو سکا۔ انہوں نے سید امیر علی اور سرسید احمد کے متعلق انگریزی زبان میں کچھ حالات وکوائف پڑھے
؛ ور ان کے وہی حالات وکوائف عربی زبان میں منتقل کرائے جو انگریزی
مصنفین کی کتابوں میں پڑھے تھے۔ : ناشر

مقدمۂ مصنف

پہلی چار صدیوں میں عالم اسلام نے اخلاقی۔ علمی اور تمدنی لحاظ سے حیرت انگیز ترقی کر کے سارے جہان کی سیادت حاصل کر لی تھی۔

جنگ و امن دونوں حالتوں میں اس کا پلہ بھاری رہتا تھا۔ مسلمانوں نے فارس۔ یونان اور روم کے تمام علوم سمیٹ لئے تھے ان علوم کے امتزاج اور آمیزش سے ایک نئی تہذیب کی بنیاد پڑی جس کے رنگا رنگ کے مظاہر بغداد۔ دمشق۔ قاہرہ۔ قیروان اور قرطبہ تھے۔ یہاں علم و فن اور تجارت و صنعت کی گرم بازاری تھی۔ دور دور سے لوگ اخذ و استفادہ کیلئے آیا کرتے تھے۔ عقیدہ، قول و فعل کی ہر شخص کو آزادی حاصل تھی، اس دینی آزادی میں عیسائی۔ یہودی۔ مجوسی اور مختلف مذاہب کے پیروکار یکساں طور پر شریک تھے

اس ترقی کے بعد تنزل کے اسباب بھی پیدا ہونے لگے۔ عالم اسلام کو ایسے حوادث سے دوچار ہونا پڑا جن سے تنزل رکنے کی بجائے بڑھتا چلا گیا۔ پہلے تو خانہ بدوش ترک قبائل نے عالم اسلام پر یورش کر دی یہ لوگ سوائے جنگ و قتال کے رحمدلی، علم۔ تمدن اور قوانین سلطنت سے یکسر نا آشنا تھے خلفاء ان کو بعض خدمات کی سرانجام دہی کے لئے ملازم رکھ لیتے تھے آہستہ آہستہ یہ لوگ سلطنت کے سفید و سیاہ کے مالک بن گئے ترک مسلمان ہوئے تو ان کا دل مسلمان نہ تھا۔[1] انہوں نے مسلمانوں سے برادرانہ سلوک کی بجائے ان کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ علم اور تمدن میں ترقی کا تو کیا ذکر یہ لوگ علم اور تہذیب کے جانی دشمن تھے۔

صلیبی سورماؤں نے ایشیا کوچک کو تاخت و تاراج کر کے بیت المقدس مسلمانوں سے چھین لیا اس پر بھی یورپ سے لشکروں کے لشکر برابر چلے آ رہے تھے۔ عالم اسلام نے ہر ممکن طریقے سے مقابلہ کی کوشش کی ان کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لئے اپنے جان و مال اور

[1] سب ترکوں کے متعلق مصنف کا یہ کہنا ایک قسم کی زیادتی ہے۔ مترجم

علم و فن کی بازی لگا دی۔

ساتویں صدی ہجری میں مغلوں نے چنگیز خاں اور اس کے خلیفہ ہلاکو خاں کی سرکردگی میں عالم اسلام کے بڑے حصہ کو زیر و زبر کر دیا۔ تاتاریوں کا مطمح نظر فتوحات اور ملک گیری نہ تھا بلکہ لوٹ مار کے علاوہ تباہی و بربادی بھی تھا۔ بغداد جس سے سارے جہان کی رونق و زینت قائم تھی لوٹ کر برباد کر دیا گیا۔ باشندوں کو قتل کیا گیا یہ بپتا اکیلے بغداد کی نہ تھی بلکہ اس مصیبت میں تمام عالم شریک تھا۔

اسلامی دنیا ان مصائب سے ابھی جانبر نہ ہو سکی تھی کہ نویں صدی ہجری میں تیمور لنگ نے چنگیز خاں اور ہلاکو کے دور کی یاد تازہ کر دی۔ لوگوں کو قتل کیا گیا اور شہروں کو تباہ و برباد کر کے خاک سیاہ کر دیا گیا۔

اس کے بعد عثمانی ترکوں کا عہد آیا یہ لوگ نڈر اور بہادر تھے لیکن عدل پسند نہ تھے حکومت کے کاروبار کی نسبت جنگ و قتال سے دلچسپی رکھتے تھے علم اور تمدن سے انہیں زیادہ رغبت نہ تھی بلکہ ملک گیری کے فن میں مہارت رکھتے تھے جوں جوں وقت گذرتا گیا عالم اسلام جہالت ظلم اور افلاس کے گڑھے میں گرتا گیا موسیو فولینی (VOLNEY) ایک فرانسیسی سیاح تھا جس نے اٹھارھویں صدی کے اواخر میں مصر اور شام میں چار سال گذارے تھے وہ لکھتا ہے کہ دیگر ترکی مقبوضات کی طرح یہاں بھی جہالت کا دور دورہ ہے اس سے علم و فن اور صنعت و حرفت بری طرح متاثر ہوئے ہیں اگر کسی کی گھڑی بگڑ۔۔۔ جائے تو مقامی باشندہ اسے درست نہیں کر سکتا۔

مصری حکومت حساب اور فزکس کی تعلیم دیتے ہوئے ڈرتی تھی آخر شیخ محمد الانبابی جامع ازہر کے شیخ سے فتویٰ پوچھا کہ کیا مسلمانوں کے لئے الجبرا۔ حساب۔ علم ہیئت۔ کیمسٹری اور دوسرے علوم و فنون کی تعلیم جائز ہے تو شیخ نے ڈرتے ڈرتے ان علوم کے جواز کا فتویٰ دے دیا گویا کہ مسلمانوں کو کبھی ان علوم سے سابقہ نہ پڑا تھا اور انہوں نے اختراع اور ایجاد میں کوئی حصہ نہ لیا تھا۔

ترکی کے علاوہ عالم اسلام یورپ سے الگ تھلگ رہ کر زندگی بسر کر رہا تھا مسلمانوں اور یورپی باشندوں کے درمیان ثقافتی۔ علمی اور صنعتی روابط نہ تھے کہ ایک دوسرے سے اخذ و استفادہ کرتا صلیبی جنگوں کے بعد سے عالم اسلام نے بیرونی اثرات کے تمام دروازے اپنے اوپر بند کر لئے تھے علمی ترقی رک چکی تھی بعض فقہی۔ نحوی صرفی کتب کی ورق گردانی کا نام علم رہ گیا تھا۔

صنعتوں میں کوئی اختراع اور ایجاد نہ تھی نہ پرانی چیزوں میں پختگی رہ گئی تھی جنگی آلات اور حربی فنون پرانی ڈگر پر قائم تھے شہریوں اور دیہاتیوں کا حکومت اور فوج کے کاروبار میں کوئی عمل دخل نہ تھا۔ انتظامی اور سیاسی امور میں ملکی باشندوں سے کوئی رائے نہ لی جاتی تھی۔ حاکموں امیروں اور والیوں کی خواہشات کا پورا کرنا ان کا کام رہ گیا تھا رعیت کا فرض تھا کہ حکام کی خواہشات کی تکمیل کے لئے اپنے گاڑھے پسینے سے کمائی ہوئی دولت صرف کر دیں آستانہ (قسطنطنیہ) کا جو مرکز خلافت تھا مصر شام عراق اور حجاز کے صوبوں سے برائے نام تعلق تھا مسلسل استبداد نے خلافت کی سطح کچل کر رکھ دی تھی علم چند دینی کتابوں کا پڑھنا پڑھانا۔ ان کے جملوں کی تشریح اور ترکیب یا متن کا حفظ کرنا یا شرح لکھنا اور شرح پر حاشیہ چڑھانا رہ گیا تھا۔ رہے علوم دینیہ تو ان میں معمولی حساب کے علاوہ جس سے وراثت کے مسائل کے حل میں مدد مل سکے یا علم ہیئت جس سے اوقات نماز کا تعین ہو سکے اور کسی علم کا پتہ نہ تھا۔

سیاست امراء اور ان کی جماعتوں کی بازیگاہ تھی ہر گروہ دوسرے گروہ کے زوال کا خواہاں ہوتا اور اس کو گرانے کی فکر ہی رہتا ملک کا اللہ والی تھا۔ حاکم کا کام جلب زر رہ گیا تھا۔ حکومت والی اور سپاہی کے نام سے عام رعایا لرزہ براندام رہتی تھی بلکہ اسکا دوسرا نام ظلم و ستم تھا۔

یہ امر حیرت انگیز ہے کہ تمام باشندے تقدیر پر شاکر ہو کر بیٹھے ہوئے تھے خواب غفلت میں مدہوش اور ہر قسم کی اصلاح سے نفور تھے جب عوام کی اصلاح کا ارادہ کیا جاتا تو فوجی طبقہ بھڑک اٹھتا شرعی قاضیوں کی اصلاح کا خیال آتا تو غضب ناک ہو جاتے مختصر طور پر سارا عالم اسلام اس بوڑھے شخص کی طرح تھا جسکو حوادث زمانہ۔ قانون کے بگاڑ حکام کے استبداد۔ عام بے حسی اور رضا بالقضاء کے عقیدہ نے زرد نزار کر رکھا ہو بقول عربی شاعر

"معاملات کو قسمت کے سپرد کر کے بے فکر ہو کر سو جا"

مذہب سے اس کی روح رخصت ہو چکی تھی صرف ظاہری شعائر رہ گئے تھے جو نہ دل کو گرما سکتے تھے اور نہ روح میں بالیدگی پیدا کر سکتے تھے خرافات اور اوہام کا دور دورہ تھا تصوف ایک قسم کا ورزشی کھیل بن گیا تھا سعی اور جدوجہد کی ضرورت نہ تھی قبروں کی پرستش کی جاتی اور اولیاء اللہ کا وسیلہ ڈھونڈا جاتا جو عمل میں کامیابی اور فتح میں کامرانی کا ذریعہ سمجھے جاتے گلیاں اور بازار

دجالوں اور شعبدہ بازوں سے بھرے ہوئے تھے۔

یہ تو تھا مشرق کا حال لیکن مغرب ان مصائب سے محفوظ رہا تھا۔ صلیبی جنگوں کے بعد یورپ نے خواب گراں سے انگڑائی لی تھی اور ایسی تہذیب اور تمدن کو جنم دیا تھا جس کی بنیاد علم اور آزادی پر تھی، صنعت و حرفت میں اس کا ہر قدم آگے پڑتا تھا امریکہ وغیرہ کی دریافت سے دولت کی ریل پیل ہو چلی تھی قوانین جنگ میں اختراعات عمل میں آئی تھیں۔ بڑے بڑے جہاز تیار ہو رہے تھے پھر یورپ قوت کے نشہ میں جدید آلات اور اسلحہ جات سے مسلح ہو کر مشرق پر پل پڑا اور بہت سے علاقے ہتھیا لئے جب کسی مشرقی ملک پر غاصبانہ قبضہ کیا جاتا تو اپنی مصلحتوں کے پیش نظر اس کو پوری طاقت سے قابو میں رکھا جاتا اور مفتوحہ ممالک کا انصرام اپنی مرضی سے کیا جاتا۔

اس سختی اور دباؤ نے مشرق کی خوابیدہ روح کو بیدار کیا جسکا طبعی نتیجہ ان مصلح راہنماؤں کا ظہور ہے جو اپنی قوم کے مصائب اور آلام سے باخبر تھے جنکی نبض مرض کے اسباب جنکا فکر اسکے علاج میں لگا رہتا تھا ہر مصلح مرض کے اسباب کو اپنے مخصوص زاویہ نگاہ سے دیکھتا اور اس کے ازالہ کی تدابیر سوچتا بنا بریں مختلف رہنماؤں نے اپنے زمانہ کے احوال و ظروف اور اپنے ملک کے مزاج و طبیعت اور ثقافت کے مطابق دعوت اصلاح دی ہر ایک نے امکان بھر کوشش کی اور اس راہ میں وہ مصائب برداشت کئے جو اولوالعزم افراد ہی برداشت کر سکتے ہیں۔ بہتوں کو دیس نکالا ملا۔ بہت سے قتل ہوئے بہتوں کو خیانت کا الزام دیا گیا اگر کسی نے جنس اور مذہب سے قطع نظر کر کے قوم کے ہر طبقہ کیلئے مساوی عدل کا مطالبہ کیا تو اسے مسلمانوں کا مخالف اور دشمن سمجھا گیا اگر کسی نے فوج کی جدید تنظیم کا نعرہ لگایا تو اسے یورپ پرستی کا طعنہ دیا گیا۔ اگر کسی نے مجلس شوریٰ کے قیام کے لئے آواز بلند کی تو اسے سلطان کا باغی اور انقلاب برپا کرنے والا خیال کیا گیا اگر کسی نے عقیدہ کی اصلاح اور خالص دین کی دعوت دی تو اسے ملحد سمجھا گیا لیکن یہ لوگ صبر سے اپنے کام میں لگے رہے یہ بزرگ اپنے مشن کو اپنی زندگی سے زیادہ عزیز سمجھتے تھے اسکو کامیاب بنانے کیلئے انہوں نے کسی تکلیف کی پرواہ نہ کی ان کے افکار اور خیالات ان کی موت کے بعد زندہ اور سرگرم عمل ہیں انکا اصلاحی کام مکمل ہو چکا ہے مشرق مغرب کے ساتھ ساتھ ترقی کے راستہ پر تیزی سے گامزن ہے جس سے یورپ حیرت زدہ ہے۔

ان مصلح رہنماؤں کا ہم پر حق ہے کہ ان کے تذکار سے ان کی زندگی کے کارناموں کی تجدید کرتے رہیں جدید نسل قرب عہد کے باوجود ان کے کارناموں کو فراموش کر چکی ہے ان کی یاد سے ہم زمانہ حاضر اور مستقبل میں ان کے افکار اور اعمال سے متاثر ہو سکیں گے۔

واللہ الموفق — احمد امین ۱۹۴۸ء

محمد بن عبدالوہاب

۱۱۱۵ — ۱۲۰۶ھ

۱۷۰۳ — ۱۷۹۱ء

آپ وہابی فرقہ کے امام ہیں حجاز کی موجودہ حکومت اُن کے دینی افکار کی حلقہ بگوش ہے
العینیہ نامی شہر میں نشوونما پائی ابتدائی کتابیں حنبلی علماء سے پڑھیں اور تکمیل علم کے لئے مدینہ منورہ گئے اس کے بعد بہت سے شہروں کی سیاحت کی چار سال بصرہ میں رہے پانچ سال بغداد میں گزارے ایک سال کردستان میں اور دو سال ہمدان میں بسر کئے اصفہان جا کر اشراقی فلسفہ اور تصوف کی تعلیم حاصل کی پھر قم چلے گئے وطن واپس آکر آٹھ ماہ عزلت گزیں رہے اس کے بعد لوگوں کو ایک نئی دعوت کیطرف بلانے لگے۔

سب سے اہم مسئلہ جو دوران تعلیم اور سیر و سیاحت ان کے ذہن میں رہا وہ توحید کا تھا جس پر اسلام کی عمارت قائم ہے اور جس کا مظہر لا الٰہ الا اللہ ہے جس سے اسلام اور دوسرے مذاہب میں تفریق کی جاتی ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف مخلصانہ دعوت دی تھی کہ بُت اور آباؤ اجداد اور مذہبی عالم عبادت کے لائق نہیں ہیں۔ اسی نسبت سے محمد بن عبدالوہاب اور ان کے پیروکار اپنے آپ کو موحدین کہنے لگے لیکن ان کے مخالف ان کو وہابی کے نام سے پکارنے لگے یورپ والوں نے بھی یہی لفظ استعمال کیا اس طرح وہابی کا لفظ زبانوں پر چڑھ گیا حجاز کی اقامت اور دیگر بلادِ اسلامیہ کی سیاحت کے دوران انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ مسئلہ توحید جو کہ اسلام کا مابہ الامتیاز مسئلہ ہے ضائع ہو چکا ہے اور اس میں بہت کچھ فساد راہ پا چکا ہے۔

مسئلہ توحید کا بنیادی اعتقاد یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی اس عالم کا پیدا کرنے والا اور حاکم ہے۔ وہی قوانین فطرت کا بنانے والا ہے۔ ان کی فرمانروائی اور معاملات کے در و بست میں کوئی دوسرا ساجھی (شریک) نہیں ہے اس جہان کے چلانے میں اس کو کسی معاون یا ولی کی ضرورت نہیں۔ قضا و قدر کا وہی مالک ہے صرف وہی نفع یا نقصان پہنچا سکتا ہے۔ کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں ہے

لاالٰہ الا اللہ کے یہ معنی ہیں کہ اس عالم میں کوئی دوسرا حاکم اور بادشاہ موجود نہیں ہے جو قوانین فطرت کو اپنی مرضی کے مطابق چلا سکے قوانین بنانے والا وہی ہے عبادت اور تعظیم کے لائق وہی ہے قرآن کا محور بھی یہی تعلیم ہے "کہہ دو کہ اے اہل کتاب آؤ ہم ایک ایسے مسئلہ پر متفق ہو جائیں کہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی دوسرے کی عبادت نہ کریں گے اور نہ کسی کو اس کا شریک ٹھہرائیں گے اور نہ کسی کو اس کے سوا حاجت روا سمجھیں گے اگر وہ نہ مانیں تو کہہ ہم شہادت دیتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں" تو پھر عالم اسلام نے خالص توحید کو چھوڑ کر شرک پرستی کیوں اختیار کر لی تھی؟ اولیاء کے مزار کی زیارت کیلئے سفر اختیار کیا جاتا تھا اور نذرانے چڑھائے جاتے تھے لوگوں کا اعتقاد تھا کہ وہ نفع وضرر پر قادر ہیں تمام ملک میں ان گنت مزار تھے جن کو تکلیف دور کرنے اور نفع حاصل کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا جاتا تھا گویا کہ اللہ تعالیٰ بھی دنیاوی بادشاہوں جیسے بادشاہ ہے جس کا تقرب حاصل کرنے کے لئے مقربان بارگاہ کی ضرورت ہے اور قاعدہ قانون اور انصاف سے بچنے کے لئے اسکی سفارش ضروری ہے یہ تو مشرکین عرب جیسی بات تھی جو کہتے تھے۔

"ہم بتوں کو اس لئے پوجتے ہیں کہ ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کریں اور وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔"

افسوس صد افسوس مسلمانوں نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ نباتات، جمادات کو بھی اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا گیا مدینہ میں ایک قصبہ منفوحہ نامی تھا وہاں کے باشندوں کا اعتقاد تھا کہ جو عورت بھی وہاں کے درخت کا قصد کرے جائے گی اس کو ضرور رشتہ مل جائے گا۔ درعیہ میں ایک غار تھی جس سے برکت حاصل کرنے کے لئے لوگ دور دراز سے آیا کرتے تھے ہر شہر میں اسی قسم کی خرافات پھیلی ہوئی تھیں۔ بصرہ میں حنفی نامی درخت تھا جس سے تبرک حاصل کیا جاتا، گلشتی کے تکیہ میں ایک قفل تھا جس کی نسبت اعتقاد تھا کہ اس کے پانی پینے سے عشق کے مرض سے شفایابی حاصل کی جا سکتی ہے اس طرح ہر شہر اور ہر ملک میں درختوں اور پتھروں کی پرستش کی جاتی تھی ان عقائد کے ساتھ توحید خالص کا کہاں گذر ہو سکتا تھا۔

اس قسم کے خرافات لوگوں کو اکیلے خدا کی عبادت سے روک دیتے تھے نفس انسانی کو ذلیل وخوار کر دیتے تھے اور ترقی کی منزل سے دور کرتے تھے۔

محمد بن عبدالوہاب کا عقیدہ تھا کہ اکیلا اللہ تعالیٰ ہی تمام عقائد کا شارع ہے وہی کسی چیز کو حلال اور حرام کر سکتا ہے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی دوسرے کا کلام قابل حجت نہیں ہے۔ متکلمین کا کلام عقائد کے بارے میں اور فقہاء کی باتیں حلال اور حرام کے متعلق ہمارے لئے قابل سند نہیں ہیں۔ ہمارے پاس کتاب وسنت موجود ہے جو بھی اجتہاد کی شرطیں پوری کرے وہ اجتہاد کر سکتا ہے بلکہ اس کیلئے لازمی ہے کہ احکام کا استخراج کرے۔ وہ کہتے تھے کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہونے سے مسلمان بڑی مصیبت میں مبتلا ہو گئے ہیں اس سے ان کی شخصیت گم اور حِکَم و مصالح کے افہام کی قوت جاتی رہی ہے وہ جامد مقلد بن گئے ہیں جو کسی کتاب کی عبارت یا اپنے جیسے مقلد کے فتویٰ کی تلاش میں رہتے ہیں اب نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ وہ اپنا اصلی مقام کھو کر مختلف فرقوں میں بٹ گئے ہیں ایک دوسرے کو لعن طعن کرتے رہتے ہیں اس مصیبت سے اسی صورت میں چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے کہ ان رسومات اور خرافات کا ابطال کیا جائے اور منبع اوّل سے سیرابی حاصل کی جائے۔

اس قسم کے خیالات خالص توحید کے متعلق ان کے ذہن میں پرورش پا رہے تھے جن کا مصدر صرف کتاب وسنت تھا۔ محمد بن عبدالوہاب کی دعوت کی اساس یہی خالص توحید تھی اور اسی بنیاد پر جزئیات کی عمارت قائم تھی ساتویں ہجری میں سلطان الناصر کے عہد میں حنبلی المذہب کے ایک بڑے عالم گذرے ہیں۔ یہ ابن تیمیہ تھے جو حنبلی ہونے کے باوجود اجتہاد کے پرجوش داعی تھے۔ آپ کتاب اور سنت صحیح کے فہم میں کسی کے مقلد نہ تھے فصیح البیان۔ قوی الاستدلال۔ بہادر اور نڈر تھے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے تھے ان کو اندھیرے قید خانے کی پرواہ نہ تھی نہ کسی سزا اور سختی کی۔ فقہاء اور ارباب تصوف کے دشمن تھے زیارت قبور سے منع کرتے تھے اس ضمن میں انہوں نے بہت سے رسالے لکھے ہیں وہ صرف کتاب وسنت کو مانتے تھے۔ بہت سے مسائل میں انہوں نے امام احمد بن حنبل کی مخالفت بھی کی ہے۔

محمد بن عبدالوہاب امام ابن تیمیہ کے نقش قدم پر چلے ان سے متاثر ہو کر انکی کتابوں کو پڑھنے اور پڑھانے لگے۔ برٹش میوزیم میں ابن تیمیہ کے بہت سے رسائل ابن عبدالوہاب کے لکھے ہوئے موجود ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن تیمیہ ان کے امام۔ مرشد اور فکری اصلاح کے مرکز عقیدت

تھے۔ اجتہاد اور دعوت اصلاح میں ان کے خیالات کے مرہون منت تھے۔

امام ابن تیمیہ کی طرح محمد بن عبدالوہاب نے لوگوں کو رد بدعت کی طرف دعوت دی اور کہا کہ مشائخ۔ اولیاء اور قبور کے واسطہ کو چھوڑ کر سیدھے اللہ کی طرف متوجہ ہوں اور اس کی جناب میں دست سوال دراز کریں کیونکہ اس تک پہنچنے کے لئے کسی توسّل اور سفارش کی ضرورت نہیں وہ اللہ تعالیٰ اور قوانین فطرت کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ مزاروں پر چڑھاوے چڑھانا نذر و نیاز پیش کرنا۔ سجدہ کرنا اور ان سے اعانت مانگنا شرک کی باتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں اور عقیدۂ توحید کے بالکل منافی۔ اسی طرح قبروں کو پختہ کرنا ان پر قبّے بنانا ان کو ریشمی غلافوں سے ڈھانپنا اسلام کے خلاف ہے۔

ابن عبدالوہاب کی اصلاحی دعوت کیا تھی مختلف بدعات۔ عادات اور رسومات کے خلاف اعلان جنگ تھا۔ تعزیہ محفل میلاد۔ عرس عورتوں کا جنازہ کے پیچھے جانا اور اس قسم کے دینی اجتماع جن میں نعت خوانی کے نام پر رقص و سرود ہوتا تھا سخت خلاف تھے۔

(مصر میں محمل کی روانگی پر ایک عظیم الشان اجتماع ہوا کرتا تھا جس میں لوگ محمل کو بوسہ دیا کرتے تھے) ابن عبدالوہاب اس کو بھی بدعت سمجھتے ہیں ان کے خیال میں یہ صرف لکڑیاں تھیں جو کسی کے نفع و نقصان پر قادر نہ تھیں یہ رسومات صحیح اسلام کی روح کے خلاف تھیں۔

انہوں نے اسلام کے اوّلین اور پاکیزہ چشم کی طرف دعوت دی بندے کو اپنے رب تک پہنچنے کے لئے کسی واسطہ یا شریک کی ضرورت نہ تھی لا الٰہ الا اللہ کا یہی مطلب ہے جن کتابوں میں توسل کا ذکر آیا ہے وہ سب عقائد کے لئے ضرر رساں ہیں جیسے دلائل الخیرات اور قصیدہ بردہ وغیرہ کے اشعار

یا اکرم الخلق مالی من الوذ بہ　　سواک عند حلول الحادث العمم

اے معزز ترین انسان میں کس کی پناہ پکڑوں سوائے آپ کے جب کہ مصائب درپیش ہوں

ان لم تکن فی معادی آخذ بیدی　　فضلاً والا فقل یازلۃ القدم

اگر آپ بروز محشر اپنے فضل سے میرے دستگیر نہ ہوں گے تو بدبختی سے میرا کہاں ٹھکانا ہوگا۔

فان من جودک الدنیا اخرتہا　　ومن علومک علم اللوح والقلم

دنیا اور آخرت آپ کے فضل پر قائم ہے لوح و قلم کا علم آپ کے علم میں شامل ہے۔

اس قسم کے اقوال جھوٹے اور فاسد ہیں کیونکہ دنیا اور آخرت میں اعتماد صرف اسی کی ذات پر رکھا جا سکتا ہے اور اسی کی پناہ پکڑی جا سکتی ہے۔

محمد بن عبدالوہاب اور ان کے پیروکار سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کی کمزوری اور بے آبروئی کا سبب عقیدہ کا بگاڑ تھا کیونکہ شروع میں اسلامی عقیدہ ہر قسم کے شرک سے پاک تھا لاالٰہ الااللہ کا مطلب بتوں اور پتھروں سے نفس انسانی کی برتری بڑوں کی پرستش سے پرہیز۔ راہ حق میں موت سے لاپرواہی اور ہر قسم کی سزا سے نڈر ہو کر برائی کو برائی اور اچھائی کو اچھائی سمجھنا تھا اگر انسانی زندگی سچائی کو بلند اور ظلم کو مٹانے کے کام میں نہ آتی تو اس کی قدر وقیمت کیا ہے؟ جاہلیت اور اسلام کے درمیان کونسی چیز مابہ الامتیاز ہوگی اسی عقیدہ کی بدولت تو مسلمانوں نے جنگی مہمیں سر کیں۔ ملک فتح کئے اور فرمانروائی کی، پھر کیا ہوا عقیدہ میں تبدیلی ہوئی تو مسلمان توحید کی بلندی سے شرک کے گڑھے میں آگرے۔ انہوں نے پتھروں۔ درختوں اور قبروں کے بے شمار معبود بنائے یہ بدعقیدگی ان کی زندگی کے ہر شعبہ میں جاری اور ساری ہوگئی کھیتی کسی ولی کی رضا سے سرسبز ہو سکتی تھی اور اس کی ناراضگی سے خشک ہو سکتی تھی سید بدوی کی منت ماننے سے گائے زندہ رہ سکتی تھی۔ مرض۔ فقر وغنا میں روحوں کی خوشی اور ناخوشی کارفرما سمجھی جاتی یہ کمزور انسان جو ہر شجر وحجر اور روح کے سامنے جھک سکتے تھے بھلا کسی ظالم حاکم کے سامنے کیسے ٹھہر سکتے تھے وہ حاکموں اور دولت مندوں کے اسی طرح مطیع اور منقاد ہوگئے جس طرح خشک لکڑیوں اور پتھروں کے آگے سجدہ عبودیت کرتے تھے۔ زمانہ گذرتا گیا معبودوں کی تعداد میں اضافہ کے ساتھ ساتھ لوگوں کی ذلت اور بے آبروئی بھی بڑھتی گئی۔ یہانتک کہ ملت اسلامیہ اپنی سیادت اور عزت نفس ہاتھ سے کھو بیٹھی اسلام کے آخری دور کی اصلاح اسی چیز سے ہو سکتی تھی جس سے اس کے اولین دور کی ہوئی تھی اس کے لئے سادہ اور اصلی اسلام کی طرف لوٹنا ہوگا اس کے لئے شرط تھی کہ کامیابی کی صورت میں ملاطفت سے اور ناکامی کی صورت میں زور سے ان بدعات اور خرافات کا قلع قمع کر دیا جائے اس کے بعد اللہ مالک ہے محمد بن عبدالوہاب نے جدید تمدن اور اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کے موقف کی پرواہ نہ کی۔ اور نہ انہوں نے مادی زندگی کا راستہ اختیار کیا جو ان کے معاصر محمد علی پاشاہ کا شیوہ تھا۔ انہوں نے صرف عقیدہ اور اس کی روح کو اپنی اصلاحی کوششوں کا محور بنایا ان کے نزدیک عقیدہ اور روح

کی بنیاد دل (قلب) پر تھی اگر یہ درست ہو گیا تو سب کچھ درست ہو جائے گا اس کے بگاڑ سے ہر چیز بگڑ جاتی تھی لہذا نجد کے دینی رئیس اور مصر کے دنیاوی رئیس کے درمیان یہ فرق ہونا ایک طبعی امر تھا۔

خالص توحید جو تجسیم اور تشخیص کے ہر شائبہ سے بری ہو اور اس کے ذریعہ ایک آدمی بغیر کسی واسطہ اور وسیلہ کے اپنے رب تک پہنچ سکتا ہو، خاص الخواص لوگوں کی سمجھ میں آسکتی ہے۔ عام لوگوں کے عقیدہ میں تشخیص اور تجسیم کی آمیزش ہو چکی تھی انہوں نے صلحا کو تقرب اور توسل کا ذریعہ بنا رکھا تھا یہ بات زمانہ جاہلیت میں تھی اور اسلامی دور میں بھی اسی کی کارفرمائی جاری رہی۔ مؤرخین روایت کرتے ہیں کہ جب اہل طائف اسلام لائے تو ان کے ہاں بھی بتوں کا ایک کعبہ تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ڈھا دینے کا حکم دیا۔ لوگوں نے آنحضرت صلعم سے درخواست کی کہ ایک ماہ تک بت خانہ کا انہدام ملتوی رکھا جائے تاکہ لوگ بلا کسی ڈر اور خوف کے مسلمان ہو سکیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ مانے اور مغیرہ بن شعبہ اور ابو سفیان بن حرب کو اس کے منہدم کرنے کے لئے مامور کیا۔

حدیث میں آیا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں ایک درخت تھا جس کا نام ذات انواط تھا عرب اپنے ہتھیار اس پر لٹکاتے اس کے گرد اعتکاف کرتے اور طرح طرح سے اسکی تعظیم کیا کرتے تھے، بعض مسلمانوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے چاہا کہ وہ ان کے لئے ایسا درخت بنا دیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس سے منع کر دیا۔

حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو ان کو معلوم ہوا کہ بعض لوگ جاہلی عادتوں کے اختیار کرنے کے لئے بے چین ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک درخت کے نیچے بیعت رضواں کی تھی لوگوں نے وہاں نماز پڑھنی شروع کر دی حضرت عمرؓ کو اس کا پتہ چلا تو انہوں نے اس درخت کے کاٹنے کا حکم دیدیا۔

حضرت عمرؓ نے کعب الاحبار کو فتح بیت المقدس پر جوتے اتارتے اور صخرہ چومتے دیکھا تو کہا اے کعب تم نے یہودیت کی نقل کی ہے۔

اس طرح بعض لوگ توحید خالص سے ہٹتے گئے۔ مادہ اور حس کی قیود سے آزادی حاصل کرلی

اور سبقت الی اللہ عقلی اور ذہنی برتری کی طالب ہے جس کے عام لوگ متحمل نہیں ہو سکتے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم سے پہلے لوگوں نے قبروں کو مساجد بنا لیا تھا تم ایسا نہ کرنا میں تم کو اس سے منع کرتا ہوں۔

لیکن جلد ہی مسلمانوں نے صالحین اور غیر صالحین کی قبروں کو مساجد بنا لیا۔ صحابہ کرام تو کسی مزار کی زیارت کے لئے جایا نہ کرتے تھے لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا اشجار۔ جماد اور مقابر کی مختلف قسموں سے تعظیم ہونے لگی۔

بہت سے مصلحون نے کوشش کی کہ لوگوں کا اس سے رُخ موڑ کر توحید خالص کیطرف کر دیں لیکن ابن تیمیہ کیطرح ان کو تکلیفیں دی گئیں رسوائی کے علاوہ کفر اور الحاد سے بھی متہم کیا گیا۔ ابن تیمیہ نے اس موضوع پر بہت سے رسالے لکھے تھے۔ جن میں قبروں کی زیارت۔ ان سے مدد و استعانت بیت المقدس میں قبہ صخرہ کے گرد طواف۔ خلیل اور مشاہد عسقلان کی حاضری پر نقد و تبصرہ تھا۔ اس کی پاداش میں ان کو قید و بند کی صعوبتوں سے دو چار ہونا پڑا۔ اس کے کئی صدیوں بعد محمد بن عبدالوہاب کا ظہور ہوا اور انہوں نے اسی قسم کی دعوت دی تو ان پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا۔ جب شیخ محمد عبدہ نے توسل۔ شفاعت اور زیارت قبور سے لوگوں کو روکا اور تفسیر کے درس میں یہی دعوت پیش کی تو اس زمانہ کے لوگوں نے ان سے وہ سلوک کیا جس کی یاد ہمارے ذہنوں میں ابھی تک تازہ ہے

یہ محمد بن عبدالوہاب کی دعوت کا جوہر تھا اب اس کا حال سنئے

(۲)

محمد بن عبدالوہاب اپنی اصلاحی دعوت لیکر کھڑے ہوئے تو جزیرہ عرب بڑی حد تک زمانہ جاہلیت کے مشابہ تھا۔ ہر قبیلہ کا ایک امیر تھا۔ یہ احساء کا امیر تھا تو وہ عسیر کا۔ نجد میں کئی امیر تھے امیروں میں چپقلش کے علاوہ کوئی دوسرا علاقہ اور باہمی تعلق نہ تھا اسی طرح شہری اور بدوی میں نزاع برپا تھی۔ بدوی کا بس چلتا تو شہری سے چھین جھپٹ لیتا اگر شہر والوں کا زور چلتا تو بدوؤں کی خوب خبر لی جاتی۔ راستے پُر خطر تھے۔ لوٹ مار کا زور تھا۔ آستانہ کی خلافت برائے نام تھی جس کا کام اشراف مکہ کی

لقریری اور ان کی فوج و سپاہ سے مدد کرتا رہ گیا تھا۔ محمد بن عبدالوہاب نے آغاز دعوت میں نرمی و ملاطفت سے کام لیا اس کے بعد انہوں نے امرائے حجاز اور دیگر ممالک کے علماء کی خدمت میں اپنی دعوت پیش کی۔ بدعت کے مقابلہ پر ان کو آمادہ کیا اور صحیح اسلام کی طرف رجوع کرنے کی درخواست کی۔

اس سے قبل بہت سے مصلح ایسی دعوت دے چکے تھے اور یہ دعوت سلامتی سے گذر گئی تھی۔ بہت سے داعی قید کئے جا چکے تھے اور ان پر کفر اور زندقہ کا الزام لگایا گیا تھا امتداد زمانہ سے لوگ پرانی ڈگر پر چلنے لگے تھے مغرب (شمالی افریقہ) میں شیخ ابوالعباس تیجانی نے ترک بدعت اور مقابر کی زیارت سے لوگوں کو منع کیا تھا لاکھوں لوگ ان کے مرید ہو گئے تھے لیکن امراء نے ان کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ محمد بن عبدالوہاب اصلاحی دعوت لیکر اُٹھے تو سب کی نظریں ان کی طرف لگ گئیں۔ شیخ محمد عبدہ کی دعوت پر بعض لوگوں نے لبیک کہا تھا اور بعضوں نے روگردانی کی تھی پھر معاملہ رفع دفع ہو گیا آخر وہابی دعوت کی کامیابی میں کونسا راز مضمر ہے؟

اس کی بڑی وجہ اس اس زمانے کے ظروف اور احوال ہیں جب محمد بن عبدالوہاب پر عرصۂ زیست تنگ کر دیا گیا تو انہوں نے اپنا وطن عیینہ چھوڑ کر درعیہ میں آل سعود کی پناہ لی وہاں کے امیر محمد بن سعود کی خدمت میں اپنا اصلاحی پروگرام پیش کیا تو امیر نے قبول کر لیا دونوں نے عہد کیا کہ دین صحیح کی حمایت میں بدعت سے لڑیں گے اور جزیرہ عرب میں زبان و تلوار دونوں سے دعوت پھیلائیں گے اس سے دعوتی کام میں عظیم الشان ترقی ہوئی لوگ گروہ در گروہ شریک ہونے لگے۔ بعض امراء کو قوت کے سامنے بھی جھکنا پڑا اس کے داعی جہاں پہنچے بدعت کو مٹا کر اپنی تعلیم پیش کرنے لگے یہاں تک کہ سارا جزیرہ عرب حلقہ بگوش دعوت ہو گیا جب شیخ محمد بن عبدالوہاب اور امیر محمد بن سعود وفات پا گئے تو ان کے لڑکوں نے عہد کر لیا کہ دعوت کی نشر و اشاعت میں اسلاف کی طرح ایک دوسرے سے تعاون کریں گے یہاں تک کہ انہوں نے مکہ و مدینہ پر بھی قبضہ کر لیا۔

سلطنت عثمانیہ کے ہاتھوں حجاز نکلنے لگا تو ترکوں کو خطرے کا احساس ہوا کیونکہ حرمین شریفین کے سبب حجاز اسلام کا ممتاز مرکز تھا اس سے محروم ہونا ایک بڑے خسارے کا پیش خیمہ تھا۔

سلطان محمود نے محمد علی پاشا کے نام فرمان بھیجا کہ ایک لشکر جرار وہابیوں کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا جائے اور اسکے ساتھ تمام اسلامی ممالک میں قاصد بھیجے جن کے ذمہ یہ کام تھا کہ وہابی دعوت

کو ذلیل و رسوا کیا جائے اور وہابیوں کی تکفیر کی جائے علماء نے وہابی تحریک کو نہایت گھناؤنے انداز میں پیش کیا۔ اس بارے میں بکثرت کتابیں لکھی گئیں جس کا مقصد لوگوں کو خوفزدہ اور وہابیوں کو لعن طعن کرنا تھا۔

اس طرح وہابیوں کے خلاف تیغ و قلم سے اعلان جنگ کر دیا گیا لیکن اس سے وہابی تحریک کو فائدہ پہنچا لوگوں کی نظریں ان کی طرف اٹھنے لگیں اور ہر زبان پر ان کا نام تھا جب وہابیوں نے امیر طرسون کی فوجوں کو شکست دے دی تو ان کی عظمت و شان میں اور اضافہ ہو گیا۔

یہ دیکھ کر محمد علی پاشاہ بنفس نفیس ایک جرار لشکر لیکر اور جدید آلات سے مسلح ہو کر وہابیوں کے مقابلہ کے لئے حجاز آیا اور وہابیوں کو شکست فاش دی اس سے وہابیوں کی سیاسی طاقت تو ٹوٹ گئی لیکن دعوت اپنا کام آہستہ آہستہ کرتی رہی عہد حاضر میں سب سے بڑی کامیابی مملکت سعودیہ کا قیام ہے وہابی تحریک کی تاریخ خاصی طویل ہے لیکن ہمیں تو تمام دعوت سے غرض ہے۔

عوام کا دولت عثمانیہ سے تعلق خاطر تھا اور وہ چاہتے تھے کہ سلطنت کے اجزاء متحد اور مضبوط رہیں اس کے علاوہ وہابیوں کے خلاف مذہبی عناصر بھی اپنا کام کر رہے تھے لہٰذا وہابیوں کو شکست ہوئی تو سارے عالم اسلام میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ عوام دعوت کا جوہر سمجھنے سے قاصر رہے تھے عامۃ الناس کی نفرت کا باعث ایک اور سبب بھی تھا وہ یہ تھا کہ وہابی جہاں جاتے وہاں بزور جبر اپنی تعلیمات پھیلاتے جب مکہ میں داخل ہوئے تو بہت سے گنبد ڈھا دیئے جیسے سیدہ خدیجہ کا قبہ مولد النبیؐ اور مولد ابوبکرؓ و علیؓ کے قبے۔ مدینہ شریف گئے تو روضہ مبارک سے بہت سے آلات زیب و زینت اٹھا لئے ان واقعات سے بہت سے لوگوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچی۔

کوئی تو تاریخی آثار کے ضائع ہونے پر افسوس کر رہا تھا اور کوئی اسلامی فن کے کھوئے جانے پر کیونکہ ان کے خیال میں روضہ مبارک مسلمانوں کے جذبات اور دولت عثمانیہ کی شان و شوکت کا مظہر تھا بہر حال اسباب کچھ بھی ہوں اس ناراضگی میں سب مسلمان شامل تھے لیکن وہابیوں کو بدعت کے مٹانے اور اصلی دین کی طرف مراجعت سے غرض تھی۔

انہوں نے دینی تعلیمات کے پھیلانے میں سرگرمی سے کام لیا جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ جہاں انہیں

اقتدار ملا وہاں چوری۔ فسق و فجور اور شراب نوشی کم ہو گئی۔ راستوں میں امن قائم ہو گیا، وہابیوں کو حیات عقلی کی ترقی سے دلچسپی نہ تھی ان کی سرگرمیوں کا دائرہ دینی تعلیم کی اشاعت تک محدود تھا۔ انہیں عصر حاضر کے تقاضوں سے مطلب نہ تھا ان کی غالب اکثریت کا یہ گمان تھا کہ جس ملک میں بدعات کا زور ہو وہ اسلامی ملک نہیں ہے بلکہ دار جہاد ہے جب حجاز میں ابن سعود کو اقتدار حاصل ہوا تو اس کو بھی انہیں معاملات سے سابقہ پڑا اس کا دو طاقتوں سے سامنا تھا (۱) نجدی علماء ابن عبدالوہاب کی تعلیمات پر سختی سے قائم تھے ٹیلیگراف۔ ٹیلیفون موٹر۔ ہوائی جہاز وغیرہ کو بدعت سمجھتے تھے جن کا دین میں گذر نہیں ہو سکتا (۲) جدید تہذیب جو کہ معاملات حکومت میں جدید وسائل کی طالب تھی اس کے لئے ابن سعود کی حکومت نے درمیانی راستہ اختیار کیا دیگر ممالک کے مسلمانوں کو بھی اپنے جیسا مسلمان سمجھا اور دینی تعلیم کے ساتھ دنیاوی تعلیم کی نشر و اشاعت میں دلچسپی لی۔ حکومت کے مختلف شعبوں کی جدید طرز پہ تنظیم کی موٹروں ہوائی جہازوں اور لاسلکی کے استعمال کی اجازت دے دی علماء نجد اور عصر حاضر کی مقتضیات بدوی طبیعتوں اور جدید تمدنی تقاضوں کے درمیان تطبیق دینی حکومت کے لئے کتنا مشکل کام تھا۔

وہابی تحریک صرف حجاز اور جزیرہ عرب تک محدود نہ رہی بلکہ بہت سے اسلامی ملکوں میں پھیل گئی موسم حج دعوت کی اشاعت کا بہترین موقعہ ہوتا دوسرے ممالک سے آتے ہوئے اکابر حجاج کے سامنے دعوت پیش کی جاتی اور قبولیت کی دعوت دی جاتی یہ لوگ جب اپنے ملکوں کو واپس جاتے تو وہاں کے عوام کو دعوت سے روشناس کراتے آج بھی زنجبار میں اس مذہب کے بہت سے حلقہ بگوش پائے جاتے ہیں جو بدعتوں اور اولیاء کے توسل سے منع کرتے ہیں ہندوستان میں سید احمد شہید[۱] یہی دعوت لیکر اٹھے تھے ۱۸۲۲ء میں حج کرنے آئے تو وہابی مذہب اختیار کر لیا وطن واپس جاکر پنجاب میں اپنی دعوت کی خوب اشاعت کی حتیٰ کہ شمالی ہندوستان ان کے حیطۂ اقتدار میں

---

[۱] سید احمد شہید کے متعلق مصنف کا بیان صحیح نہیں ہے۔ سید صاحب نے سکھوں کے خلاف جہاد کیا تھا نہ کہ انگریزوں کے خلاف۔ تفصیل کیلئے سیرت سید احمد شہید (سید ابوالحسن علی ندوی) اور تحریک مجاہدین مؤلفہ مولانا غلام رسول مہر ملاحظہ ہو۔۔۔۔ مترجم

آگیا انہوں نے بدعات اور خرافات کا استیصال کیا بہت سے علماء سے مناظرہ کیا دعوت کے مخالفوں کے خلاف اعلان جنگ کیا اور کہا ہندوستان دارالحرب ہے۔ انگریزی حکومت کو اس تحریک کے دبانے میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا آخر کار انگریزوں نے انہیں مغلوب کر لیا۔

اسی طرح امام سنوسی بھی حج کرنے آئے تھے دعوت کا پیغام سن کر حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے اور واپس جا کر دعوت کی نشر و اشاعت میں لگ گئے اور بلاد مغرب میں ایک خاص طریقہ کی بنیاد رکھی جس کا بعد میں ذکر آئے گا۔

یمن میں ایک بہت بڑے عالم کا ظہور ہوا تھا ان کا نام امام شوکانی تھا ۱۱۷۲ھ میں پیدا ہوئے اگرچہ ان کی ملاقات ابن عبدالوہاب سے نہیں ہو سکی لیکن انہوں نے وہابیوں کے طور طریقہ کو اختیار کیا ایک گرانقدر کتاب نیل الاوطار کے نام سے لکھی جو ابن تیمیہؒ کی منتقی الاخبار[1] کی شرح ہے اور احکامی احادیث کے بارے میں ہے اس میں امام شوکانی نے مجتہدانہ انداز میں احکام شرعیہ کا استنباط کیا ہے (کہیں کہیں) مذاہب اربعہ سے بھی اختلاف کیا ہے آپ تقلید کے مخالف اور اجتہاد کے داعی تھے جس سے معاصر علماء اور ان کے درمیان کلامی جنگ چھڑ گئی۔ صنعا تو اس مخالفت کا مرکز تھا امام شوکانی نے ایک رسالہ (القول المفید فی حکم التقلید) کے نام سے لکھا جس میں عزم زیارت قبور اور ان سے وسیلہ پکڑنے کا بیان تھا۔ نیل الاوطار میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"پختہ قبریں بنانے اور ان پر نقش و نگار کرنے سے بہت سے مفاسد پیدا ہو گئے ہیں جن پر اسلام نوحہ کناں ہے جاہل لوگوں کا قبروں کی نسبت وہی گمان ہے جو کفار کا بتوں کے متعلق تھا اس سے بڑھ کر لوگوں نے سمجھ لیا ہے کہ یہ مزار نفع و نقصان پر قادر ہیں انہوں نے قبروں کو قبلہ مقصد اور کعبۂ حاجات سمجھ رکھا ہے ان سے وہی کچھ مانگتے ہیں جو بندے کو اپنے رب سے مانگنا چاہیئے لوگ مزاروں کی زیارت کرنے جاتے ہیں بوسہ دیتے ہیں اور مدد مانگتے ہیں مختصر طور پر یہ لوگ وہی کام کرتے ہیں جو کفار عرب بتوں سے کرتے تھے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس صریح کفر

---

[1] احکامی احادیث کا مجموعہ ہے جس کے مولف ابن تیمیہ کے دادا تھے۔ مترجم

کو دیکھ کر نہ کوئی غضبناک ہوتا ہے اور نہ کسی عالم۔ متعلم۔ امیر۔ وزیر یا کسی بادشاہ کی رگِ حمیت پھڑکتی ہے ان قبر پرستوں کی بہت کسی باتیں ہم تک پہنچی ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا نام لیکر جھوٹی قسم کھا لیتے ہیں اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ فلاں ولی یا شیخ کا نام لے کر قسم اٹھاؤ تو جھٹ انکار کر دیتے ہیں اور سچی بات کہہ دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں کا شرک عیسائیوں سے بھی بڑھا ہوا ہے

اسے دینی عالمو اور مسلمانوں کے بادشاہو۔ اس سے زیادہ کفر اور کیا ہوگا اور غیر اللہ کی عبادت کے سوا اور کونسی سخت مصیبت مسلمانوں کیلئے ہوگی۔ کونسی برائی قابلِ انکار ہوگی اگر اس صاف اور صریح شرک کو برا نہ سمجھا جائے گا۔"

(نیل الاوطار جلد نمبر ۴ صفحہ نمبر ۱۳۴ طبع امیریہ)

بڑی کٹھن کی زندگی کے بعد امام شوکانی نے ۱۲۵۰ھ میں وفات پائی اور اپنے پیچھے بہت سے شاگرد چھوڑے جو ان کے نقشِ قدم پر چلتے رہے

شیخ محمد عبدہ نے ہوش و تمیز کی آنکھیں کھولیں تو مصر میں ابن عبدالوہاب کی تعلیمات کا شہرہ تھا انہوں نے اس تعلیم کے اصولوں کا عہدِ رسالت سے لے کر عہد ابن تیمیہ اور پھر زمانہ عبدالوہاب تک مطالعہ کیا ان کی بڑی تمنا تھی کہ عمل صالح سے مسلمانوں کی خدمت کریں ان کو اپنے علم و اجتہاد سے پتہ چلا کہ محمد بن عبدالوہاب کی تعلیمات دو بنیادوں پر قائم ہے۔ (۱) بدعت اور شرک کے خلاف اعلان جنگ مثلاً اولیاء اور قبور کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانا (۲) اجتہاد کے دروازہ کو کھولنا جس کو جامد مقلدین نے بند کر رکھا ہے ان دونوں مقاصد کے حصول کے لئے انہوں نے اپنی ساری زندگی وقف کر دی اس بات میں وہ اپنے پیشروؤں سے ممتاز تھے کیونکہ وہ دینی اور دنیاوی ثقافتوں سے بہرہ مند تھے معاملات دنیا سے باخبر تھے انہوں نے دینی تعلیم حاصل کرنے کے علاوہ فرانسیسی ثقافت سے بھی استفادہ کیا تھا اور ملکی سیاست میں بھی حصہ لیا تھا۔ یورپ کے سفروں میں مغربی علماء۔ فلاسفہ اور سیاسی مدبرین سے مل چکے تھے ان کو ایسے معاملات پیش آئے جن سے محمد بن عبدالوہاب کا سابقہ نہ پڑا تھا لہذا انہوں نے اپنے فکر کی بنیاد دین کے علاوہ نفسیات اور اجتماعیات پر بھی رکھی۔ ازہر کے رواق عباسی قرآن پاک کی تفسیر کا درس دیتے تو موقعہ

بموقع زیارت قبور۔ شفاعت اور توسل کی برائیاں ظاہر کرتے مثلاً قرآن پاک کی اس آیت

بعض لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر کئی معبود پکڑ رکھے ہیں جن سے اللہ جیسی محبت کرتے ہیں، لیکن جو لوگ ایمان لائے وہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ محبت رکھتے ہیں، اگر ظالم لوگ عذاب دیکھیں گے تو کہیں گے کہ تمام طاقت اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے اور اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے۔

شیخ محمد عبدہ باطل معبودوں کی دو قسمیں کیا کرتے تھے۔ وہ شفعاء جن کو لوگوں نے اللہ تعالےٰ کے قرب کا ذریعہ ٹھیرا رکھا ہے اور ان سے اپنی مرادیں مانگتے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ جنکی لوگ سوچے سمجھے بغیر تقلید کرتے ہیں شیخ محمد عبدہ ان عقائد کے نفسیاتی نقصانات بیان کرتے کہ ان سے انسانی نفس ذلیل ہوتا ہے۔ لوگ ظالم حاکموں کے سامنے جھکنے لگتے ہیں اور ان میں غیرت کا مادہ فنا ہو جاتا ہے پھر وہ اجتماعی نقصانات گناتے کہ لوگ قوانین فطرت کو چھوڑ کر جن کو اللہ تعالےٰ نے مسبب کے حصول کے لئے اسباب بنایا ہے اولیاء پر اعتماد کرتے ہیں زراعت میں کامیابی کے لئے ہل چلانا۔ اچھا بیج بونا اور پانی دینا شرط ہے اس میں کسی ولی سے مدد مانگنے کی ضرورت نہیں۔ جنگ کے لئے جدید ترین اسلحہ سے مسلح ہونا اور دشمن جیسی جمعیت فراہم کرنا ضروری ہے اہل قبور سے مدد طلب کرنا ضروری نہیں مسلمانوں کی تو یہ شان ہے کہ ساری تیاری کے بعد صرف اللہ تعالیٰ سے مدد کا خواستگار ہو اسی سے دل جمعی کی درخواست مانگے اور اسی سے توفیق طلب کرے اس طرح وہ ان لوگوں کا رد کیا کرتے تھے جو توسل۔ شفاعت اور تقلید کے قائل تھے۔

مولد النبیؐ (عید المیلاد) کے موقعہ مجالس اور محافل پر علماء کی حاضری سے فائدہ اٹھا کر عرض کرتے کہ یہ دھوم دھام کی مجالس میلاد گناہ کی باتیں ہیں، کاش کہ ان پر جو خرچ ہوتا ہے وہ فقراء کی تعلیم پر صرف کیا جائے۔ شیخ دیر تک علماء سے بحث و مناظرہ کرتے رہتے یہاں تک کہ دوسرے علماء کھانا کھانے چلے جاتے اور شیخ اکیلے رہ جاتے

انہوں نے تیسویں پارہ (عم) کی تفسیر نوجوانوں کے لئے لکھی تھی جس میں عبادت مشائخ اور قبور کی برائیاں ظاہر کی ہیں ان کی تمنا تھی کہ اس سے نوجوان صحیح دینی زندگی بسر کر سکیں گے اس راہ میں ان کے دوست اور شاگرد سید محمد رشید رضا، مدیر مجلہ المنار نے انکی بڑی مدد کی ان کا رسالہ

اس دعوت کے لئے وقت تھا جسکی صدائے بازگشت تمام اسلامی ممالک میں سنی جاتی تھی ترکی میں کمالی حکومت نے ان بدعات اور خرافات کے خلاف پورا زور صرف کردیا تکئے اور زاویئے جو دجالوں، مکاروں اور شعبدہ بازوں کی پناہ گاہیں تھے بند کردیئے کمالی تحریک اور ماسبق تحریکوں میں یہ فرق تھا کہ پہلی تحریکوں کی بنیاد دین اور دینی اصلاح پر تھی جبکہ ترکی تحریک کی بناء قومی عقل اور اجتماعی اصلاح پر تھی جس میں دینی اصلاح کی کسی کوشش کو دخل نہ تھا۔

محمد بن عبدالوہاب کے عہد سے لیکر آج تک اس اصلاحی دعوت پر کئی سال گذر چکے ہیں اور بہت سے غازی اور مجاہد شرک اور بدعت کے خلاف اس جنگ میں حصہ لے چکے ہیں لیکن کیا نتیجہ نکلا؟ عوام الناس ابھی تک مشائخ اور قبور سے اپنی مرادیں مانگتے ہیں میلاد کی محفلیں بھی برپا ہوتی ہیں اگرچہ ان کی رونق میں کمی آگئی ہے اس دعوت سے زیادہ تر خاص الخواص اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ متاثر ہوا ہے اپنے آباد اجداد کی طرح یہ بہت کم اپنے مشائخ اور مقابر کی زیارت کے لئے جاتے ہیں اگرچہ اللہ تعالیٰ کی طرف بھی کم متوجہ ہوتے ہیں جسطرح کہ ان کے آباؤ اجداد متوجہ ہوتے تھے۔

اب ہم دوسری دعوت اصلاح کی طرف منتقل ہوتے ہیں جسکا ظہور مدحت پاشا کے ہاتھوں ترکی میں ہوا تھا۔

○

مدحت پاشا

۱۲۳۸ھ ——————— ۱۳۰۱ھ

۱۸۲۲ء ——————— ۱۸۸۴ء

یہ دوسری قسم کے مصلح ہیں۔ محمد بن عبدالوہاب دینی مصلح تھے تو مدحت پاشا اجتماعی مصلح ہیں وہ نجد میں پیدا ہوئے تو یہ استنبول میں ایک کو جدید تمدن اور سیاست سے سروکار نہ تھا تو دوسرے کا اوڑھنا بچھونا سیاست تھی محمد بن عبدالوہاب عقیدہ کی اصلاح کا پیغام لے کر اٹھے تھے ان کی اصلاحی دعوت کا پروگرام عہد رسالت اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے زمانہ کی طرف رجوع تھا اور ان کے اقوال و افعال کی پیروی تھی۔ مدحت پاشا کے پیش نظر جدید تمدن اور زندہ قوموں کے طور طریقے تھے جنکا دقتِ نظر سے مطالعہ کر کے وہ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ انہوں نے حیاتِ اجتماعی و سیاسی کے متعلق کونسا راستہ اختیار کیا ہے کہاں کہاں ٹھوکر کھائی ہے کس طرح ترقی کی ہے تاکہ ہم ان کی خطا و صواب سے فائدہ اٹھا کر اپنے لئے بہترین راہ متعین کریں۔

مدحت پاشا سلطان محمود کے زمانے میں پیدا ہوئے۔ سلطان عبدالمجید کے زمانے میں جوان ہوئے۔ بوڑھے ہوئے تو عبدالعزیز کا زمانہ تھا آخر عبدالحمید کے عہد میں اس جہان سے رخصت ہوئے۔ اس وقت دولت عثمانیہ کا آفتاب لب بام تھا زوال کے آثار ہویدا تھے مملکت کے اطراف سمٹ رہے تھے اور داخلی امور میں بگاڑ پیدا ہو چلا تھا۔

مسلمان اور عیسائی دونوں ظلم و ستم کا شکار تھے مسلمان ڈرتے ڈرتے اصلاح کا نام لب پر لا رہے تھے عیسائیوں کی حمایت میں دول یورپ کمربستہ تھیں وہ دفع ظلم کے بہانے ان کی حمایت کا دم بھرتے ہوئے ملکی معاملات میں دخل دے رہی تھیں اور ان کی آزادی کے لئے کوشاں تھیں ہر روز خلافت کے صوبے ہتھیائے جا رہے تھے نت نئے معاہدات ہوتے جن سے دولت عثمانیہ کے حقوق گھٹتے جاتے اور رعب داب سے کام لے کر نئی شرائط عائد کی جاتیں۔

ہر صوبہ میں حاکم تنگ نظری عیش پرستی اور ظاہری شان و شوکت سے حکومت کر رہے تھے

ان پر کسی قاعدہ اور قانون کی گرفت نہ تھی اور نہ انصاف پسندی انہیں کسی بے انصافی سے روک سکتی تھی وہ سمجھتے کہ رعیت کا کام احکام کی پابندی اور حکام کی طاعت اور لوٹ کھسوٹ پر صبر کرنا ہے حکام چاہتے کہ ان کے طریقِ حکومت اور ظلم پر ان کی مدح سرائی کی جائے جو نہ مانتا وہ باغی سمجھا جاتا جو شکایت کرتا وہ کافر بنتا۔ بہت سے باحمیت لوگ ہجرت کر گئے تھے جو ملک میں ٹھہر گئے تھے وہ ذلت و مسکنت کا شکار تھے صحت اور تعلیم کی طرف توجہ نہ تھی امراض پھیلے ہوئے تھے جہالت کا دور دورہ تھا عیسائیوں سے زیادہ مسلمانوں کا برا حال تھا کیونکہ مغربی اقوام اپنے مشرقی عیسائی بھائیوں کی مدد کے لئے سکول کھول کر تعلیم پھیلا رہی تھیں مسلمان متذبذب تھے کہ ان سکولوں میں تعلیم حاصل کریں یا نہ کریں تعلیم حاصل کرنے سے ان کے دینی جذبات کو ٹھیس پہنچتی تھی اگر دینی روایات کا تحفظ کریں تو جاہل رہ جانے کا اندیشہ تھا۔

لوگ فقر و فاقہ میں مبتلا تھے زراعت میں کوئی نفع نہ تھا۔ صنعتوں کی کساد بازاری تھی غربت اور جہالت نے عقلی اور جسمانی قواؤ کو بے کار کر دیا تھا خرافات نے عقیدہ کو بگاڑ رکھا تھا لوگوں کو عدل و انصاف سے مایوسی تھی زراعت اور صنعت کی طرف کون دھیان دیتا۔

اس کے برخلاف فوجیوں کی قوت اور طاقت بڑھی ہوئی تھی وہ موت کو حقیر سمجھتے تھے۔ اس واسطے ان کی معنوی حالت اچھی تھی لیکن جدید طریقہ پر ان کی تنظیم نہ تھی آلات حرب و رسد اور غذا کا خواطر خواہ انتظام نہ تھا اگر بعض مواقع پر فوج کو فتح مندی نصیب ہوتی تو اس کی بڑی وجہ ان کی ایمانی اور روحانی قوت ہوتی اگرچہ آلات حرب اور سامان رسد ناکافی ہوتا۔ یہ حالت مستقبل کے لئے نیک فال نہ تھی زندہ قومیں ہر روز جدید آلات حرب سے مسلح ہو رہی تھیں اور اپنے نقائص کا ازالہ کر رہی تھیں وہ دشمنوں پر فتح حاصل کرنے کیلئے خفیہ اور ظاہرہ اسباب سے مدد لے رہی تھیں یہ پرانی ڈگر کب تک قائم رہ سکتی تھی؟

دول یورپ نے دولت عثمانیہ کی اس کمزوری کو بھانپ لیا تھا اور سمجھ لیا تھا کہ اب اس کے خاتمہ کا وقت قریب آپہنچا ہے۔ ہر ملک نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے ترکی کو پھنسانے کے لئے ہر حکومت کے اپنے اپنے طریقے تھے خود مرکز خلافت میں ان کے جاسوس اور ہمدرد موجود تھے۔ دولت عثمانیہ مختلف عناصر میں بٹی ہوئی تھی جن کی قومیت، زبان اور مذہب مختلف تھے۔

ہر ایک عنصر کی اپنی دل بستگی تھی اور بیرونی ملکوں سے رابطہ تھا جن سے وہ مدد کے طالب رہتے صحیح معنوں میں نہ کوئی مالی انتظام تھا نہ باضابطہ حکومت تھی نہ فوج تھی۔ نہ متحدہ قومیت جس کے پیش نظر متحدہ نصب العین اور یک جہتی ہوتی۔

سلطان عبدالعزیز کو معاملات کی ابتری کا احساس ہوا تو حالات اور دگرگون ہو گئے۔ اس نے اپنے بھائی عبدالمجید کو ان کی عیش کوشی اسراف پسندی اور معاملات حکومت سے غفلت کی بنا پر آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ اس نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ خلیفہ بننے پر مفاسد کی اصلاح کرے گا۔ قوم کی دستگیری کرے گا۔ ایک بیوی پر اکتفا کرے گا اور حرم سلطانی کے اخراجات کو کم کر دے گا لیکن یہ سب وعدے باد ہوا ثابت ہوئے اس نے بھائی سے بھی زیادہ فضول خرچی اور عیش پرستی شروع کر دی۔ اپنے عہد میں اس نے دو بڑی غلطیاں کی تھیں (۱) مسلمان رعایا کی حوصلہ افزائی کر دہ معاملات حکومت اور مناصب سلطنت کے زیادہ حقدار ہیں اور ان کا درجہ عیسائیوں سے اونچا ہے اس وجہ سے مختلف عناصر میں بغض۔ عناد اور انتقام لینے کی آگ بھڑک اٹھی اور دول یورپ کو مسیحی رعایا کی حفاظت کے بہانے دخل اندازی کا موقعہ مل گیا۔ دوسری غلطی یہ تھی کہ بے جا اسراف اور کم آمدنی کی وجہ سے اسے قرض مانگنا پڑا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سی رقم فوج اور بحری بیڑہ کی اصلاح پر خرچ ہوئی تھی لیکن اس سے زیادہ عظیم الشان محلات کی تعمیر اور اسباب زیب و زینت کی فراہمی پر خرچ ہوا تھا۔ عجیب تر یہ بات ہے کہ جب سعید پاشا والی مصر نے ادھار مانگا تو سلطان نے ایک لمبا چوڑا خط لکھ کر جواب دیا جس میں قرض کے مضر اثرات ملک پر دکھلائے گئے تھے۔ اس سے اجنبیوں کو ملکی معاملات میں دخل دینے کا موقعہ ملا۔ سلطان حد درجہ استبداد پسند تھا۔ جملہ سرکاری اعمال اُس کی ذات میں مرتکز تھے ہر بات کا مرجع اُس کی ذات تھی وہ نہ کسی ناصح کی نصیحت سنتا اور نہ کسی تجربہ کار کی رائے مانتا۔ ذہانت۔ علم۔ وسیع ثقافت۔ معاملات کی گہری واقفیت سے ڈرتا تھا کیونکہ اسکا نتیجہ خود اس کے اعمال کی نگرانی اور اس کے اسراف کا محاسبہ ہوتا۔

سلطان عبدالحمید کا دور آیا تو ایک طنبورے سے ایک نغمہ چھوڑ کر کئی نغمے نکلنے لگے سلطان کو اپنی شخصیت سے ڈر لگنے لگا اُس نے تاریخ میں پڑھ رکھا تھا کہ اس کے بہت سے اجداد تاج و تخت سے محروم کر دیئے گئے یا قتل کئے گئے ابھی ابھی سلطان عبدالعزیز کو معزول کیا گیا تھا۔ بعض کہتے ہیں

کہ اس کو قتل کیا گیا تھا سلطان ڈرتا تھا کہ اسی دور کی یاد تازہ نہ ہو جائے تو کا اپنی شخصیت کی حفاظت کے لئے بے مثل ذہانت۔ مال کثیر اور بڑی سلطنت کے ذرائع سے کام لیتا تھا۔ اخبارات اور مجلات میں ملت اور امت کا ذکر نہ آنے دیا جاتا بلکہ ان میں ذات شاہانہ کا ذکر رہتا جو کہ بڑے بڑے القاب سے ملقب تھی کیونکہ وہ سلطان الاعظم خان الافخم۔ سلطان البرین والبحرین۔ امام الحرمین الشریفین ظل اللہ فی الارض اور محفوف بالطاف الصمدانیہ عنایات الربانیہ تھا۔

کسی کتاب میں الائمۃ من القریش (امام قریش میں سے ہوں گے) مذکور ہوتا تو ضبط کرلی جاتی۔ عقائد فسفیہ کی طباعت ممنوع تھی کیونکہ اس میں ایک فصل امامت اور خلافت کی شروط پر تھی۔ شام۔ عراق اور آستانہ میں جتنی کتابیں چھپتیں ان کے لئے "رخصت جلیلہ" کی شرط تھی۔ مکتب حقوق (لاکالج) میں جتنی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں وہ سب جمع کر کے جلا دی گئیں کیونکہ ان میں ایک ایسا جملہ تھا جس کا یہ مطلب تھا کہ اگر ایک مملکت کا نظام حکومت خراب ہو جائے تو ہمسایہ حکومت کا فرض ہے کہ اسکی اصلاح کا مطالبہ کرے۔ خطیب جمعہ کا خطبہ پڑھتے تو نہ اس میں ظلم سے مناہی کا ذکر ہوتا اور نہ ہی حاکم پر رعیت کے حقوق کا ذکر آتا زیادہ تر اس حدیث پر زور ہوتا کہ اللہ تعالیٰ خوبصورت ہیں اور خوبصورتی پسند کرتے ہیں۔"

جاسوس بے شمار تھے بلکہ فن جاسوسی ترقی کا ذریعہ تھا جب سلطان نماز جمعہ پڑھنے نکلتا تو دس ہزار سپاہ ان کی حفاظت اور اظہار شان وشوکت کے لئے متعین ہوتی قصر سلطانی شعبدہ بازوں اور دجال اور مشائخ سے بھرا ہوا تھا جو خواب کی تعبیر بیان کرنے کیلئے خواب گھڑتے کوئی ان کا مزاحم ہوتا تو اسے قرار واقعی سزا دیتے مشاغل سیاسیہ اور امور سلطنت کا چلن ان فریب کاروں کے خوابوں اور آراء پر تھا۔

اس ماحول میں مدحت پاشا نے زندگی گذاری اور جدوجہد کرتے ہوئے جان دیدی۔

اس ماحول میں اصلاحی کام ازحد مشکل تھا کیونکہ اس کے سانس تک گن لئے جاتے تھے جاسوس اس کی حرکات وسکنات کی نگرانی کرتے تھے وہ ڈائری دیتے وقت اپنی طرف سے بھی بہت کچھ بڑھایا کرتے تھے اس سے ان کے مناصب میں اضافہ ہوتا اور قریب بڑھتا کسی کو ملازمت سے فارغ کر دیا جاتا تو الزام یہ دیا جاتا کہ وہ مکر و فریب کا جال پھیلاتا ہے یا خطرناک کام کر رہا ہے کسی پر صوبے کی آزادی

کے لئے کام کرنے کی تہمت لگائی جاتی اور اس کو دارالخلافت سے دور بھیج دیا جاتا کوئی دستوری کام کرتا تو کہا جاتا کہ یہ تو جمہوریت کا خواہاں ہے وغیرہ وغیرہ ہر قدم پر گھاٹی تھی اور ہر حرکت پر جاسوسوں کے کان لگے رہتے تھے اس بھاری بوجھ کو اولوالعزم انسان ہی اٹھا سکتے ہیں وہ تکالیف کو سمجھنے کے باوجود اپنے کام میں لگے رہتے ہیں وہ اپنے عقیدہ کے تابع ہوتے ہیں نہ کہ اپنے نفس اور اپنے خاندان کے ان کو ایک ہی کام کی دھن لگی رہتی ہے جب کہ دوسرے لوگ جلدی سے آدھا راستہ کاٹ کر واپس چلے آتے ہیں یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے سلامتی کے طلبگار رہتے ہیں پہلی تکلیف ہی سے ان کا ضمیر خوش ہوتا اور تسکین پاتا ہے اللہ دوسروں پر مصائب ڈال دیتے ہیں مدحت پاشا کا شمار ان مجاہدوں میں سے ہے جو باحمیت تھے برائی کو دیکھ نہ سکتے تھے۔ آخری سانس تک مصائب کا بوجھ اٹھائے رکھتے اور آہ کرنا عار سمجھتے۔

○

مدحت پاشا استنبول میں پیدا ہوئے ان کے والد الحاج حافظ محمد دینی عالم تھے۔ بعض صوبوں میں شرعی قاضی کے فرائض بھی انجام دیتے تھے ان کے والد نے انہیں دینی تربیت دی مدحت کی عمر گیارہ سال تھی جبکہ انہوں نے قرآن پاک حفظ کر لیا اور ان کا لقب حافظ پڑ گیا ترکوں میں سے جو کوئی قرآن حفظ کر لیتا ہے اس کو حافظ کہتے ہیں لہذا ان کو حافظ احمد شفیق کے نام سے پکارتے تھے۔ مدحت تو ان کا سرکاری نام تھا۔ دیوانِ ہمایونی سے متعلق ہو کر خط دیوانی سیکھنے لگے اس کے بعد اپنے والد کے ساتھ مختلف جگہوں میں منتقل ہو کر وہاں کے مکاتب میں تعلیم حاصل کی جب ان کے والد آستانہ واپس آئے تو کسی سرکاری کاتب سے مل کر کتابت میں مدد دینے لگے اور خود بھی پڑھنے لگے وقت کا کچھ حصہ محمد الفاتح کی جامع مسجد میں گذارتے اُس وقت جامع مسجد میں جامع ازہر کی طرح حلقات تھے ہر شیخ کا اپنا حلقہ اور شاگردوں کا گروہ ہوتا وہاں انہوں نے عربی زبان۔ فارسی۔ دینی علوم۔ نحو۔ منطق۔ فقہ۔ بلاغت اور فلسفہ جبکہ حکمت بھی کہتے ہیں کی تعلیم پائی بیس برس کی عمر تک اسی شغل میں منہمک رہے یعنی دواوین حکومت میں شاگرد اور جامع محمد الفاتح میں طالب علم

یہ ثقافت جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں بالکل ہلکی سی تھی۔ کیونکہ اس نظام تعلیم میں تاریخ۔ جغرافیہ۔ حساب اور غیر ملکی زبانوں کی تدریس کا انتظام نہ تھا لیکن زمانہ ایک مستعد شاگرد کو درس نظامیہ سے زیادہ سکھلا دیتا

ہے بڑے ہوئے تو ان کو ثقافت کی کمی کا احساس ہوا انہوں نے از خود بہت سی کتابیں مطالعہ کیں۔ جب پینتیس سال کی عمر ہوئی تو سیاسی ضروریات کی بنا پر اجنبی زبان سیکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ملازمت کے دوران میں انہوں نے فرانسیسی زبان سیکھ لی تھی۔ انہوں نے مختلف نظامہائے سیاسی اور اجتماعی کے مطالعہ کی غرض سے یورپ کی سیاحت کی اس سے ان کی علمی ثقافت کو بے حد فائدہ پہنچا ۱۲۷۴ھ میں جبکہ ان کی عمر ۳۳ سال کی تھی سیاحت کی غرض سے رخصت لی۔ رخصت کے ۹ ماہ انہوں نے پیرس۔ لندن۔ وی آنا اور بلجیم میں گذارے۔ یہ سفر ایک قسم کا درس اور استفادہ تھا۔ حکومتیں اپنے مالیات کی کس طرح تنظیم کرتی ہیں۔ سرکاری امور کا کس طرح انتظام و انصرام کرتی ہیں۔ نظام حکومت کیسا ہے۔ رعایا کا بادشاہ سے کیا علاقہ ہے۔ آبادی کے اہم وسائل کون کون سے ہیں وغیرہ وغیرہ مسائل ان کے ذہن میں آتے رہتے تھے جب کسی ملک میں آجاتے تو وہاں کے ارباب حل و عقد سے اسی قسم کے سوالات پوچھتے۔ سیاحت کے دوران انہوں نے فرانسیسی زبان میں مہارت پیدا کر لی جسکو انہوں نے بڑی عمر میں سیکھا تھا اپنی عالی ہمتی اور دینی استقامت کی بدولت اپنے عزائم کی بہت کچھ تکمیل کر لی۔ ان کا مزاج عجیب وغریب واقع ہوا تھا وہ نماز پابندی سے پڑھا کرتے اور اوراد و اذکار میں مصروف رہا کرتے اس کے ساتھ دنیاوی معاملات۔ انقلابات عالم۔ جدید تمدن کے بنیادی اصولوں پر ان کی نظر گہری تھی۔

لوگوں نے دیکھا کہ وہ مخلص ہیں۔ لگی لپٹی رکھے بغیر جو کہنا ہو کہہ دیتے ہیں۔ نیز طبیعت میں سستی اور ڈھیل کو برداشت نہیں کر سکتے فکر و نظر میں مخلص ہیں جبکہ سارا ماحول خود غرض تھا وہ پاشا۔ رشید پاشا اور عالی پاشا کے مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتے تھے ان سے قوت۔ تعمیم اور ملکۂ تنقید سیکھا تھا ان وزراء کے جانشین ان جوہروں سے محروم تھے لہذا مدحت پاشا کی ان سے بن نہ آئی محمد پاشا القبرصلی ان سے کینہ رکھتے تھے جب وہ صدر اعظم بنے تو بلقان میں انقلاب کی آگ بھڑک اٹھی قبرصلی پاشا نے مدحت کو اس آگ میں جھونک دیا کہ شکست کھانے اور مقتول ہونے کی صورت میں ان کو مدحت پاشا سے چھٹکارا مل جائے گا اور اگر ان کو کامیابی نصیب ہوگی تو کوئی بڑی بات نہ ہوگی اس سے ان کا مقصد مدحت سے گلو خلاصی کرانا تھا۔ مدحت پاشا ایک لشکر جرار لے کر بغاوت فرو کرنے گئے انہوں نے پہاڑوں کی چوٹیوں اور غاروں میں نو ماہ بسر کر کے دشمن کو مغلوب کر لیا۔ بغاوت کے چار سرغنوں کے

سر قلم کئے۔ ورنہ ۹۸ افراد قید کر کے آستانہ روانہ کئے۔ اس سے بغاوت کی آگ ٹھنڈی پڑ گئی اور اصلاحات کا نفاذ کر دیا گیا اسطرح لوگوں کی نظریں ان کی طاقت اور دانشمندی پر لگ گئیں۔ جب وہ سربیا اور بلغاریہ کے گورنر بنا کر بھیجے گئے تو لوگوں نے ان کے حسن انتظام کی بے حد تعریف کی۔ انہوں نے وہاں چار سال گذارے ان کا کام مجلتانہ تھا اس اثناء میں انہوں نے مدارس قائم کئے۔ شفا خانے کھولے ایک ہزار میل لمبی سڑکوں کی مرمت کی۔ چودہ سو پل تعمیر کرائے جب سرکاری میزانیہ میں مزید اخراجات کی گنجائش نہ ہوتی تو لوگوں کو اپنی مدد آپ کرنے کو کہتے اور باشندے دل کھول کر چندہ دیتے کیونکہ وہ بہیں اصلاح احوال کی قیمت کا اندازہ تھا وہ چیز جو انہیں دوسرے ترک والیوں سے ممتاز کرتی تھی وہ مسلمان اور مسیحی رعایا میں عدم تفریق تھی وہ سب سے یکساں سلوک کرتے اور انصاف سے پیش آتے باغیوں اور مفسدہ پردازوں کے جانی دشمن تھے ان کی سرکوبی سے نیکوں کو اطمینان اور غلط کاروں کو تنبیہ ہوئی۔ امن و امان اور خوشحالی کا دور دورہ ہوا اور ان کے ایام راحت و اطمینان کے لئے ضرب المثل بن گئے بغیر اس بات کے کہ حکومت کو کوئی مالی بوجھ برداشت کرنا پڑا۔

یہ واقعات آئندہ کے لئے نیک فال تھے جبکہ مملکت کی زمام کار ان کے ہاتھ میں آنیوالی تھی۔

۲

اب دولت عثمانیہ کمزور ہو چکی تھی۔ آخری سلاطین کے زمانہ میں بہت سی مشکلات پیدا ہو چکی تھیں ملک مختلف عناصر میں بٹا ہوا تھا۔۔ مثال کے طور پر بلقان ہی کو لیجئے اس میں بوسینیہ۔ ہرسک۔ سربیا۔ البانیہ۔ یونان۔ بلغاریہ اور رومانیہ کے صوبے شامل تھے۔ اس میں بہت سی قومیں آباد تھیں جن کے مطالب و مقاصد علیحدہ علیحدہ تھے جو بڑی سے بڑی طاقت کی نیند حرام کر سکتی تھیں۔ قومیت کا فتنہ آیا تو ہر ایک قوم کو آزادی کا خیال سوجھنے لگا۔ دولت عثمانیہ تو کس شمار قطار میں تھی جبکہ بیرونی طاقتیں ان عناصر کو برانگیختہ کر رہی تھیں اس کے علاوہ ترکی میں کئی عیسائی فرقے تھے جنکا اپنا اپنا کلیسا تھا ان فرقوں کے درمیان لاانتہا ہی اختلاف تھے ان بکھیڑوں نے مسئلہ شرقیہ کو جنم دیا جسکا مطلب ترکی کی مختلف قوموں کے درمیان نزاع اور دول عظمیٰ کی مطلب برآری کے لئے مداخلت تھی۔

داخلی اور خارجی حالات کی خرابی بہت سے مفکروں کو اصلاح کی دعوت دے رہی تھی اس بارے

ہیں کئی قسم کی اصلاحات پیشِ نظر تھیں جن کو ترک عرفِ عام میں تنظیمات خیریہ کے نام سے پکارتے ہیں سلطان محمود کے زمانے میں خیال تھا کہ ان اصلاحات کے نفاذ سے ملک طاقتور ہو جائے گا اور داخلی اور خارجی مشکلات ناپید ہو جائیں گی اصلاحات کا سب سے مشہور سلسلہ کل خانہ کے نام سے موسوم تھا جسکو ۱۸۳۹ء میں سلطان عبد المجید کے زمانہ میں محمد امین عالی پاشا کی حسن سعی سے نافذ کیا گیا تھا قابلِ ذکر اصلاحات یہ تھیں انفرادی ملکیت کی حمایت جس میں دین اور جنس کا لحاظ نہ ہوگا نظام التزام کا استرداد۔ قانونی لحاظ سے کل رعایا میں مساوات۔ مجرموں کی کھلی سماعت۔ ملازمت کا حصول جس کے لئے کسی دین یا فرقہ کی تخصیص نہ ہوگی۔ غیر مسلموں کا فوج میں بھرتی کیا جانا۔ سرکاری محکموں۔ پولیس۔ انکم ٹیکس۔ مواصلات وغیرہ کی اصلاح۔ خرچ وغیرہ کی جانچ پڑتال۔ ان اصلاحات کے نفاذ کی راہ میں بے شمار مشکلات تھیں۔ سب سے اہم رکاوٹ خود سلطان تھا۔ بہت سے سلاطین یہ سمجھتے تھے کہ وہ من مانی کاروائیاں نہ کر سکیں گے۔ دینی علماء سوالؐ کو ناپسند کرتے تھے اجنبی رعایا کو خیال تھا کہ وہ مراعات سے محروم ہو جائے گی لیکن حکومتوں کو اصلاح حال سرے سے پسند نہ تھی۔ لہذا یہ اصلاحات کاغذ کی زینت بنی رہیں۔

ان حالات میں مدحت پاشا نے اپنی طرف سے اصلاح پیش کی۔ ان کے خیال میں مملکت عثمانیہ کی اصلاح کے لئے جمہوریت موزون تھی جسکا وہ انگلستان اور فرانس میں مشاہدہ کر چکے تھے اس جمہوریت کا مظہر دستورِ اساسی اور ایک پارلیمنٹ کا قیام تھا جس میں مملکت کی تمام قوموں اور صوبوں کی نمائندگی ہوگی۔ دوسرے الفاظ میں ان کا یہ مطلب تھا کہ قوم خود حکمران ہوگی نہ کہ سلطان اور اس کے خود غرض مقربین خاص کی حکومت ہوگی۔ وہ جانتے تھے کہ جس دور سے دولت عثمانیہ گذر رہی ہے تمام یورپی اقوام اس دور سے گذری تھیں۔ ان کی کشتی حیات کو بھنور سے نکالنے والی حریت تھی جس سے قومیں بڑھتی اور پھولتی ہیں۔ نفس میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ ہر فرد کو اپنا حق ملتا ہے اور وہ خود نگر بن جاتا ہے اس سے انصاف ملتا ہے۔ اسی سے دستور بنتا ہے جس سے افراد میں اطمینان اور مساوات پیدا ہوتی ہے ان کے دل جُڑتے ہیں ہر ایک کو قسمت آزمائی کا موقع ملتا ہے۔ فریب کاری پنپ نہیں سکتی۔

انگلستان اور فرانس کو بھی ان مشکلات کا سامنا تھا جن کا ہم سامنا کر رہے ہیں ہماری طرح ان کے افراد بھی ظلم و ستم کا شکار تھے لیکن ان کی حریت پسندی۔ قانون سازی اور حزم و احتیاط نے ان مشکلات پر جلد ہی قابو پا لیا۔ انگلستان کا دستور کے نفاذ سے پہلے اور بعد اور فرانس کا بھی انقلاب سے پہلے اور مابعد یہی حال تھا۔

انہوں نے استبداد کو ملیامیٹ کر دیا۔ اس کی جگہ صحیح آزاد زندگی کو دی۔ اگر ہمارے ہاں سلطان دستور کا اعلان کر دے اور ہم بھی حزم و احتیاط سے سرگرم کار ہوں تو ہماری حکومت اور مالیات میں نظم پیدا ہو سکتا ہے دولت کے مختلف عناصر کو حکومت اور انصاف میں مساوات کا یقین آ سکتا ہے اور وہ اطمینان حاصل کر سکتے ہیں اس سے بیرونی حکومتوں کو ہمارے معاملات میں دخل انداز ہونے کا موقع نہ مل سکے گا بالفرض وہ دخل بھی دیں گی تو رائے عامہ پر زور مخالفت کرے گی۔ اس دستور کی رو سے ہر والی پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ ہوگا یا دوسرے معنوں میں قوم اس سے مواخذہ کرے گی اس سے حاکم کی آنکھیں کھلیں گی اور وہ خواہشات نفس کو چھوڑ کر عدل اختیار کرے گا ورنہ اسے ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔

دستور سے عوام میں تعلیم پھیلتی ہے فراخی اطمینانِ قلب کا باعث ہوتی ہے لوگوں میں عدل و انصاف کا احساس پیدا ہوتا ہے اور وہ بیدار ہونے لگتے ہیں ان کے استعدادی ملکات بروئے کار آتے ہیں اور وہ نشاطِ خاطر سے سرگرم کار ہوتے ہیں جنکو روحِ استبداد نے مردہ کر رکھا ہے۔

دولت عثمانیہ کے حیات ثانیہ کا انحصار اس پر تھا کہ یورپی اقوام کے نظام جمہوری کا مطالعہ کر کے ملک کے احوال و ظروف اور مزاج کے مطابق کوئی سا نظام منتخب کر کے اس کے مطابق قانون بنایا جائے اور پھر اس کی طاقت سے حفاظت کی جائے تاکہ وہ مفسدہ پردازوں کی بازی گاہ نہ بن سکے یہ تھا علاج جو مدحت پاشا نے طویل مطالعہ اور سوچ و فکر کے بعد تجویز کیا تھا۔ اس بارے میں مدحت پاشا اکیلے نہ تھے بلکہ بیشتر نوجوان بھی انکے اصلاحی خیالات کے مؤید تھے اور استبداد کے مخالف ہونیکی وجہ سے ان کے حامی تھے۔ انہوں نے تاریخ سیاست اور یورپی نظام کا بغور مطالعہ کیا تھا ان کی ایک جماعت پیرس میں قائم تھی جس کے سرغنہ مصطفیٰ پاشا فاضل تھے یہ جماعت دولت عثمانیہ کے اعمال و افعال کی محاسب تھی اس کے اصلاح احوال کیلئے کوشاں تھی یہ وہی مصطفیٰ فاضل ہیں جنہوں نے سلطان عبدالعزیز کے نام مشہور مکتوب مفتوح لکھا تھا اور جس کا عربی میں ترجمہ من الأمیر الی السلطان فتحی زغلول پاشا نے کیا تھا امیر سے مراد مصطفیٰ فاضل اور سلطان سے سلطان عبدالعزیز ہیں یہ اپنی قسم کا پہلا مکتوب تھا جو کسی عثمانی امیر نے زور اور صراحت کے ساتھ سلطان کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اس تحریک کا مرکز تعقل و تفکر مدحت پاشا کی ذات تھی اب دستوری نفاذ کا وقت آنے لگا۔ مدحت پاشا اور ان کے ہمنوا جمہوریت۔ دستور اور حریت چاہتے تھے سلطان عبدالعزیز اور انکے حاشیہ بردار اور اعوان و انصار مزاحم تھے ان کو یہ تمام باتیں ناپسند تھیں مدحت کا عقیدہ تھا

کہ قوم کی نجات مجلس شوریٰ ہی سے ہو سکتی ہے اور سلطان عبدالعزیز کو معلوم تھا کہ اس سے وہ اختیارات سے محروم ہو جائیں گے۔ مدحت پاشا قوم کو فرمانروائی ۔ عدل ، مساوات اور اخوت دیکر نفس پرست امراء و سلاطین سے محفوظ اور مختلف عناصر میں اتحاد پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس کے برعکس سلطان عبدالعزیز اور اس کے حاشیہ برداروں اور بہت سے علماء دین اور بعض مدبروں کی رائے تھی کہ پارلیمنٹری نظام حکومت دولت عثمانیہ کے مزاج کے مناسب نہیں کیونکہ ترکی میں کئی قومیں آباد تھیں مسیحی فرقے بعض دول یورپ سے سازباز میں مصروف تھے اور لوگوں میں اتنی سیاسی بیداری نہ پیدا ہوئی تھی کہ وہ شخصی مصالح پر قومی مصالح کو ترجیح دے سکیں ۔

اب یہ جنگ اقتدار کھل کر سامنے آ گئی دونوں گروہوں کے اپنے اپنے حمایتی تھے۔ مدحت پاشا کیساتھ امراء اور جدید نسل کے نوجوان تھے سلطان عبدالعزیز کے ہمنوا محمود پاشا وزیر اعظم تھے جو شاہی خزانہ سے سلطان کی مدد کر رہے تھے رفاہ عامہ کے کاموں پر بہت کم روپیہ خرچ ہوتا زیادہ عیش و عشرت پر خرچ ہوتا علماء کی اکثریت بھی سلطان کی حامی تھی ان کو مال و دولت کا لالچ دیکر ساتھ ملا لیا تھا یہ ہر اصلاحی تحریک کو فتنہ کا نام دے دیتے اور کہتے کہ جابر سلطان فتنہ انگیزی سے زیادہ بہتر ہے ہر پارٹی کے ساتھ اپنے اپنے ادیب ۔ انشاپرداز اور شاعر تھے مدحت پاشا کے ساتھ طبقہ اول کے انشاپرداز تھے جو فرانسیسی اور ترکی زبان میں اخبارات میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ نامق کمال صف اول کے ترکی ادیب تھے جو اسلوب جدید میں آزادی کے نغمے گایا کرتے تھے۔ ان کا اسلوب بیان سادہ مگر خوبصورت ۔ قوی اور واضح تھا دوسرا رجعت پسند ادب تھا جو سلطان کے گن گاتا ۔ حریت پسندوں کی ہجو کرتا ان میں الجوائب کا مدیر اور اسمیں بعض دوسرے لوگ لکھنے والے تھے دول یورپ بھی اس معرکہ میں شریک تھیں ۔ انگلستان مدحت پاشا کے ساتھ تھا چونکہ اسکا اپنا نظام حکومت جمہوری تھا روس کے مصالح اصلاح سے میل نہ کھاتے تھے اس لئے وہ سلطان اور محمود ندیم کا حامی تھا اور اس کا سفیر اگناتیف نامی فتنہ پردازی میں مشغول تھا تاکہ اس کی حکومت کے عزائم کی تکمیل ہو سکے

مدحت پاشا کا پروگرام تھا کہ حکومت کا اسراف انتہائی درجہ تک پہنچ چکا ہے ۔ سلطان محکمہ مالیات سے روپیہ لے کر عیش و عشرت میں ضائع کر رہا ہے ۔ حکومت کا مالی شعبہ عہدوں کو جنس کی طرح بیچ رہا ہے والی (گورنر) صدر اعظم سے اپنا عہدہ خریدتا ہے اور صوبہ میں جا کر لوگوں پر مختلف قسم کے ظلم کر کے روپیہ سمیٹتا

ہے جس کا نتیجہ صوبوں کی ویرانی میں ظاہر ہوتا ہے اور حکومت مصائب میں مبتلا ہو جاتی ہے اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کیلئے ضروری ہے کہ نظامِ حکومت تبدیل کر کے ایک نمائندہ مجلس بنائی جائے اور سیکرٹریوں کو اس کے سامنے جوابدہ سمجھا جائے اس قومی مجلس کے انتخاب میں مذہب اور قوم کا لحاظ نہ رکھا جائے والیوں (گورنروں) کی سخت نگرانی کی جائے تاکہ وہ رعیت کے مصالح سے کھیلنے نہ پائیں۔ یہ سب باتیں ایک حکم میں سمیٹی جا سکتی تھیں اسکا نام دستور تھا۔

یہ تحریک آہستہ آہستہ اپنا کام کرتی تھی۔ لوگوں میں جوش پھیل رہا تھا اور سلطان عبدالعزیز کی پے درپے غلطیاں آگ پر تیل کا کام کر رہی تھیں۔

حوادث کے دباؤ کے نتیجہ میں سلطان نے محمد پاشا ندیم صدر اعظم کو برطرف کر دیا وہ سلطان کا جگری دوست تھا کیونکہ وہ سلطان کو منہ مانگا روپیہ دیا کرتا تھا۔ وہ آستانہ کے روسی سفیر اور علمائے دین کا بھی منظورِ نظر تھا۔ مدحت پاشا وزیر اعظم مقرر کئے گئے۔ ان کو روسی سفیر اور بعض علمائے دین پسند نہ کرتے تھے لیکن وہ اصلاح پسندوں کی آنکھوں کے تارے تھے۔

منصب سنبھالتے ہی انہوں نے جلاوطنوں کو واپس بلا لیا۔ سرکاری میزانیہ کو مضبوط بنیادوں پر قائم کیا اور سلطان عبدالعزیز اور اس کے حاشیہ برداروں پر زندگی دوبھر کر دی کیونکہ ان کے اللوں تللوں کے لئے گنجائش نہ تھی۔ خارجی مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے بعد داخلی اصلاحات کی طرف توجہ کی۔ دور افتادہ علاقوں سے رابطہ قائم کیا۔ عراق کو مرکز سے ملانے کیلئے بغداد اور طرابلس الشام کے درمیان ریلوے لائن بچھانے کا منصوبہ بنایا اس کے لئے ایک فرانسیسی انجینئر کا انتخاب کیا اور اس سے دو لاکھ لیرہ کا ٹھیکہ کیا انگلستان کو راضی کیا کہ وہ اس کے لئے تین لاکھ لیرہ دیگا اور اس کے بدلہ میں ہندوستان سے ڈاک اس ریلوے کے ذریعہ آیا جایا کرے گی۔ بلادِ حجاز میں تار رسانی کا انتظام کیا۔

دمشق اور بغداد کے درمیان ریلوے لائن بچھائی ٹیلیگراف کا انتظام دمشق سے لیکر حجاز اور یمن تک کیا۔ قدس اور جدہ کے درمیان ریلوے لائن تعمیر کرنے کے لئے سامان بھی فراہم کر لیا ان کی رائے میں ان کاموں سے حکومت کا خزانے پر بار نہ پڑ سکتا تھا کیونکہ حاجیوں کی تاروں سے چند سالوں میں انکا خرچ نکل سکتا تھا۔

تول اور باٹ کو اعشاری بنیاد پر قائم کیا اور ملک کے مختلف حصوں میں ان کو رواج دیا۔ خدیو

اسمٰعیل کو اجازت دی گئی تھی کہ وہ بیرونی طاقتوں سے قرض حاصل کر سکتا ہے آپ نے اس سلطانی فرمان کی سخت مخالفت کی کیونکہ اس سے بیرونی حکومتوں کو مصر کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے کا بہانہ مل جاتا اور مصر سیاسی اور انتظامی آزادی سے ہاتھ دھو بیٹھتا اور بیرونی حکومتیں اپنے سرمایہ کی حفاظت کے بہانے ملکی معاملات میں دخل دیتیں یہ نئے طور طریقے تھے جن کا سلطان عبدالعزیز عادی نہ تھا انہوں نے تو اشاروں پر ناچنے والے وزیر دیکھے ہوئے تھے مدحت پاشا صرف ڈیڑھ ماہ وزارت میں رہ سکے اس کے بعد معزول کر دیئے گئے جس سے تمام منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ بغداد ریلوے لائن کی منصوبہ بندی کے لئے فرانسیسی انجینیر کو ایک لاکھ لیرہ دیئے گئے تھے وہ سب اکارت گئے۔ پھر وہ سعد پاشا کی وزارت میں وزیر انصاف لئے گئے شروانی زادہ محمد رشدی پاشا کی وزارت میں بھی شامل رہے اس آخری وزارت میں انہوں نے حکومت کی اصلاح کا نظام عمل پیش کیا۔

مدحت نے سلطان کی خدمت میں عرضداشت پیش کی جس کے الفاظ ظاہر میں نرم لیکن باطن میں سخت تھے اس میں مذکور تھا کہ آپ نے خطاب ہمایونی میں بصراحت فرمایا تھا کہ اصلاحات کے پروگرام پر عمل کیا جائے گا لیکن اب معاملات ابتر ہو رہے ہیں۔ ملازموں کے عزل و نصب سے ملک میں اضطراب پھیل رہا ہے بہت سے راہ راست سے بھٹک گئے ہیں آپ کے منشا کے مطابق کام نہیں چل رہا۔ ان ملازموں نے اصلاحات کے نتائج پر پانی پھیر دیا ہے۔ ملک کی مالی حالت دگرگوں ہے جس سے حکومت کے اندر اور باہر مفسدہ پرداز لوگ نت نئی افواہیں پھیلا رہے ہیں اور عوام ڈرتے ہیں کہ سلطنت کا کہیں خاتمہ نہ ہو جائے۔

وطن پرستی مہر سکوت توڑنے پر مجبور کرتی ہے لہٰذا ہم ذات شاہانہ کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ آپ سے یہ امر پوشیدہ نہ ہوگا کہ ان تمام بیماریوں کا موثر علاج یہ ہے کہ ان کی جڑ کاٹ دی جائے اگر اسباب دور کر دیئے جائیں تو مرض خود بخود جاتا رہے گا۔ آپ نے حکم فرمایا تھا جس کی رو سے نظم و قاعدہ کی پابندی لازمی تھی اور قانون کی نظر میں امیر و فقیر اور چھوٹے اور بڑے سب برابر تھے اوقاف کی آمدنی واقفین کے منشا کے مطابق خرچ ہوتی تھی اس فرمان کی رو سے تمام امور باب عالی (وزراء) کی خدمت میں پیش ہوتے اور وہ تمام معاملات آپ کے گوش گذار کرتے۔ ایک پیسہ بھی باب عالی کے منشا کے بغیر خرچ نہ

ہوتا۔ بڑے عہدہ داروں کی تنخواہیں مقرر کی گئیں اور وزیروں کو ان کے اعمال کا جوابدہ سمجھا گیا۔ آپ نے حتمی طور پر فرمایا تھا کہ اگر تمام امور درست ہو گئے تو اللہ تعالیٰ کی مدد سے نتائج خواطر خواہ برآمد ہوں گے اور ملک جادۂ صراط پہ گامزن ہو جائے گا۔

یہ گذارشات تمام تر ہمارے افکار کا نتیجہ ہیں ان میں غلطی کا بھی احتمال ہے اب ہم جلالت مآب سے اصلاح حال اور مصائب سے قوم کی خلاصی کی امید رکھتے ہیں اس کی بہتری کی امید آپ سے وابستہ ہے اس کے بعد آپ کا اختیار ہے۔

اس عرضداشت میں مدحت پاشا نے اصلاح کے بارے میں اپنے افکار اور نظریات مختصر طور پہ پیش کر دیئے ہیں۔

مدحت پاشا وزیر انصاف ہوئے تو انہوں نے اسی عرضداشت کو تمام وزیروں کی خدمت میں پیش کیا اور متفقہ رائے سے فیصلہ ہوا کہ یہ عرضداشت سلطان کی خدمت میں پیش کی جائے آپ سلطان سے ملے پہلے تو سلطان سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر اس عرضداشت کا ذکر کیا جب سلطان نے اصلاح۔ شوریٰ۔ دستور وغیرہ کا نام سنا تو اس کے غیظ و غضب کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا اور مدحت پاشا کی برطرفی کا حکم صادر کر دیا اور ان سے گلو خلاصی کیلئے انہیں سلانیک کا گورنر مقرر کر دیا اس کے بعد شروانی زادہ کی باری تھی ان کو بھی وزارت سے علیحدہ کر کے حلب کا والی بنا کر بھیج دیا یہ دونوں اصلاح کی رٹ لگا رہے تھے تین ماہ بعد مدحت کو گورنری سے علیحدہ کر دیا گیا اور وہ اپنی زمینداری کی دیکھ بھال میں لگ گئے۔

اب مدحت پاشا سوچ رہے تھے کہ سلطان عبدالعزیز کی ضد کی وجہ سے اصلاحی پروگرام اکارت گیا۔ سلطان۔ شوریٰ دستور۔ ملل۔ حریت اور امت کے الفاظ سننا نہ چاہتے تھے جو بھی یہ الفاظ منہ سے نکالتا اس کو حسب حیثیت جلا وطنی۔ قتل اور ملازمت سے علیحدگی کی سزا ملتی۔

عیسائی اس شور و شر سے علیحدہ تھے وجہ یہ تھی کہ ان میں جذبۂ حریت کا فقدان تھا جب حقوق حاصل ہوتے تو سمجھتے کہ وہ بھی سلطنت کا جز ہیں۔

مسلمانوں کی کمزوری کا سبب بھی حریت کے جذبہ کا نہ ہونا تھا اگر ان کو احساس دلایا جاتا تو وہ نشاط خاطر سے سرگرم کار ہوتے اپنی کسبی اور وہبی قوتوں سے کام لے کر خاندان اور قوم کی خدمت کرتے۔

لوگوں سے جذبۂ حریت رخصت ہو چکا تھا جس کی وجہ سے وہ لرزہ براندام رہتے تھے ان کے حوصلے

پست تھے ذلت اور خواری نے ان کے اخلاق ملازموں جیسے کر دیئے تھے وہ گذر اوقات کے لئے ذلیل ترین ذرائع اختیار کرتے ۔ یہ پستی تو اسلامی تعلیمات کے خلاف تھی کیونکہ اسلام تو امیر اور فقیر دونوں کو یکساں حقوق اور واجبات عطا کرتا ہے وہ ایک وزیر اور چپڑاسی کے درمیان کسی امتیاز کو جائز نہیں رکھتا معاملات طے کرنے کیلئے باہمی مشورہ کا حکم دیتا ہے لیکن یہ سلطان شوریٰ کے لفظ سے موت کیطرح متنفر تھا اسلام کا اہم ترین اصول امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے لیکن سلطان نہ کسی کو امر بالمعروف کہنے کی اجازت دیتا ہے اور نہ نہی عن المنکر کی۔

زمانہ حاضرہ میں یورپین جس چیز کو پارلیمنٹ کہتے ہیں وہ اسلامی قوانین کی رو سے مجلس شوریٰ ہے جدید تمدن نے جس چیز کو اخبارات کی آزادی اور بے لاگ رائے زنی کا نام دے رکھا ہے وہ یہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے کیونکہ نہ کوئی فرد معصوم ہے اور نہ حکومت اور والی معصوم ہو سکتے ہیں ان سب کو عوام کی بیداری اور تنقید کی آزادی راہ راست پر قائم رکھ سکتی ہے قرآن پاک میں اسی چیز کا نام تواصی بالحق آیا ہے یہ تمام باتیں صاف اور روشن ہیں ان سے مفر نہیں لیکن ان افکار کی راہ میں سلطان کی ذات سنگ گراں کیطرح حائل تھی ۔ تمام دنیا میں دولت عثمانیہ کی زمین زرخیز ترین تھی لیکن لوگوں کی نقل مکانی کیوجہ سے اجاڑ پڑی ہوئی تھی جو لوگ رہ گئے وہ بھاری ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے ملک میں نہ کارخانے تھے نہ کمپنیاں روئی بکثرت پیدا ہوتی تھی لیکن کپڑا باہر سے درآمد کیا جاتا تھا حتی کہ ترکی ٹوپیاں بھی وسادر سے آتی تھیں۔ دیا سلائی بھی باہر سے منگوائی جاتی تھی حالانکہ خام مال کی کمی نہ تھی ۔ انصاف منصفانہ قوانین کی راہ سے آتا ہے جو کہ حریت اور دستور کا نتیجہ ہوتے ہیں لیکن یہاں جو بھی اصلاح کا نام لیتا ... ہٹا دیا جاتا فؤاد پاشا ناکامی اور نامرادی کی موت مرے عالی پاشا سیہ کاریوں سے معزول کئے گئے اب محمود ندیم جیسے جاہل سلطان کے مقربین خاص بنے ہوئے تھے جنہوں نے سلطان کے لئے شاہی خزانہ کا منہ کھول رکھا تھا اور خود ملک کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے تھے ۔

اللہ تعالیٰ فؤاد پاشا اور عالی پاشا پر اپنی رحمت نازل کرے جب ان دونوں نے دیکھا کہ سلطان کو اصلاح کے متعلق کچھ سننا ہی ناگوار ہے تو انہوں نے ایک دلچسپ چال چلی انہوں نے سلطان کو یورپ کی سیر کا شوق دلایا تاکہ وہ اس بہانے یورپ کے شہروں میں گھوم پھر کر وہاں کے نظام ہائے سلطنت اور ترقی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرے اور وہ بلاواسطہ سلطان کو محسوس کرائیں کہ یہ سب کچھ وہاں کے حسن انتظام کا نتیجہ ہے تاکہ وہ وطن واپس آکر انکی تقلید کرے مصلحین کی باتوں پر کان دھرے اور انکی

حوصلہ افزائی کرے اور ہوش میں آ کر اپنی رعایا کیطرف متوجہ ہو سکے لیکن ان کا اندازہ غلط نکلا سلطان پہلے کی نسبت زیادہ مال اڑانے لگا اور عیش و عشرت پر صرف کرنے لگا۔ وہ وعدہ کرتا اور توڑ دیتا تھا انہوں نے ہر صوبے کے لئے ایک انتخابی مجلس کا مطالبہ کیا تھا جو ملکی معاملات میں والی کو صلاح مشورہ دیتی۔ سلطان نے سمجھا کہ یہ تو شیطانی خیال ہے جس کا منتہائے مقصود پارلیمنٹ ہو گا اس وجہ سے سلطان اُن دونوں سے کبیدہ خاطر رہنے لگا۔ ہاں سلطان کی یورپی سیاحت سے ملک کو اتنا فائدہ ضرور حاصل ہوا کہ کچھ کارخانے اور فیکٹریاں قائم ہو گئیں یہ سب سرکاری تھیں نہ کہ قومی سلطان قرض پر قرض لے رہا تھا سلطان عبدالمجید کے عہد خلافت میں قرضہ کی مقدار ۲۵ ملین لیرہ تھی جو ۱۲ سال میں عبدالعزیز کی مہربانی سے ۲۵۰ ملین تک پہنچ گئی اگر یہی لیل و نہار رہے تو ملک کا کیا ٹھکانا نہ ہو گا ظاہر ہے کہ سلطان عبدالعزیز کے ہوتے ہی کسی اصلاح کی امید نہ رہی تھی۔ اصلاحی پروگرام کے بروئے کار لانے عدالتوں کی قانون سازی اور مدارس کے نظم و ضبط سے کچھ امید بندھ سکتی ہے یہ سلطان کا حال تھا کہ وہ زور اور دباؤ کی آندھی کے سامنے جھک جاتا اور جب یہ آندھی گذر جاتی تو اکڑ کر سیدھا کھڑا ہو جاتا۔

اب آخری امید کا سہارا رہ گیا تھا یعنی سلطان کی برطرفی اور رائے عام کو اس کے عزل کے لئے تیار کرنا۔ مقام افسوس ہے کہ یہ کام صرف فوج کی مدد سے ہو سکتا تھا اور اس میں خطرہ تھا۔ مدحت پاشا نے جامع الفاتح میں پڑھا تھا کہ ضرورت کے وقت خطرات کا سہارا لینا پڑتا ہے جب سلطان عبدالعزیز تخت سے اتر جائیگا اور اس کی جگہ دوسرا سلطان بیٹھ جائے گا تو ملک کے معاملات خود بخود درست ہو جائیں گے۔ نئے دستور کا اعلان ہو گا تو سلطان سمجھ لے گا کہ زمام کار قوم کے ہاتھ میں ہے تو سیدھے وہ قوم کا مطیع بن کر رہے گا۔ چونکہ سلطان نئے دستور کا فخر مندہ احسان ہو گا۔ لہذا اسکا احترام کریگا اور دستور نافذ ہو کر رہیگا سلطان مطیع و منقاد ہو گا۔ سب معاملات بخیر و خوبی طے پائیں گے ہم زندہ قوموں کے راستہ پر گامزن ہوں گے ان کی اچھی باتوں کو لیں گے اور ان کی غلط کاریوں سے بچیں گے زندگی باعزت بسر ہو گی انصاف کا دور دورہ ہو گا اور دستور ضامن حیات ہو گا

یہ تھے مدحت پاشا کے خیالات جب کہ وہ زمینداری کی نگرانی میں مشغول تھا اور اس کے ہاں رہٹ آبپاشی کر رہے تھے۔

مدحت ان خیالات میں مصروف ان نوجوانوں اور بوڑھوں سے ملاقات کرتے جو اس حالت سے تنگ آ چکے تھے اس بارے میں حسین عوفی پاشا سپہ سالار اعظم ان سے متفق تھا اور ان دونوں کی گٹھ جوڑ

امیر البحر اور اور شیخ الاسلام سے تھی آخر کار انہوں نے ایک معین دن سلطان عبدالعزیز کے معزول کرنے کی ٹھانی اس دن بحری جہاز مرائے بغچہ کے سامنے لنگر انداز ہو گئے اور فوجوں نے قصر شاہی کا محاصرہ کر لیا۔ کسی نے محل کے اندر داخل ہو کر سلطان کو معزولی کی خبر سنائی پہلے تو سلطان کو اس خبر پر یقین نہ آیا لیکن جب جہازوں اور فوجوں کو دیکھا تو اپنے آپ کو بے بس پا کر فوج کے حوالہ کر دیا انہوں نے سلطان کو قصر شاہی سے نکال کر کسی دوسرے محل میں پہنچا دیا سلطان کے ساتھ اس کی والدہ اور تین سو خادمائیں تھیں سلطان کے خدم وحشم کی تعداد ہزاروں سے متجاوز تھی مالی دشواریوں کی وجہ سے سب کے وظائف بند کرنے پڑے۔

تھوڑے دنوں کے بعد سلطان کو مقتول پایا گیا کہتے ہیں کہ اس کے قتل کی سازش کی گئی تھی لیکن سب ڈاکٹر بشمول مدحت پاشا متفق تھے کہ سلطان نے غیرت کے مارے اپنی کلائی کی شریانیں قینچی سے کاٹ لی تھیں جس سے وہ جانبر نہ ہو سکا

اس کے بعد سلطان مراد کی بیعت ہوئی تھوڑے دنوں کے بعد سلطان کو جنون ہو گیا اور وہ مختل الحواس ہو گیا تین ماہ کے بعد عبدالحمید کو خلیفہ بنایا سلطنت کے معاملات کا بار گراں مدحت پاشا کے کندھوں پر تھا وہ سلطان مراد کی بیماری کے زمانے میں اپنے ساتھیوں کو ساتھ لے کر یورپ کے مختلف قوانین کا مطالعہ کرتے اور قوم کے مناسب مزاج قانون انتخاب کرتے اس زمانہ میں ان کی ایک آنکھ یورپ کے نظام ہائے حکومت پر تھی تو دوسری معاملات سلطنت پر یورپ کے سب قوانین ترکی کے مزاج کے مطابق نہ تھے اس بارے میں ان کی رائے تھی کہ یورپ کے قوانین کا نفاذ ایسا ہو گا جیسے کپڑوں کے بننے کا آلہ درآمد کرنا کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی ان سے اچھی طرح استفادہ نہیں کر سکتا اس کے علاوہ بہت سے قوانین ہمارے صوبوں سے مطابقت بھی نہیں رکھتے کیونکہ جو دستور حلب اور شام کے صوبوں کیلئے مناسب ہو گا ظاہر ہے کہ وہ بروصہ اور آدرنہ کے صوبہ جات کے نامناسب ہو گا۔ ایک قانون کا ایک صوبہ میں نفاذ انصاف پسندی پر مبنی ہو گا تو دوسرے صوبہ میں ظلم سمجھا جائے گا قانون سازی کے وقت اس مسئلہ کی طرف دھیان دینا ہو گا عدلیہ کی آزادی۔ مال گذاری اور قوانین حکومت جو فرانسیسیوں کے ہاں مروج ہیں تو ان سے خاطر خواہ فائدہ انہوں نے اپنے تمدن کی ترقی اور لوگوں کی خوشحالی کیوجہ سے اٹھایا ہے۔ مثلاً اراضیات کا قانون انجینئروں کے یقین۔ اراضی کی مقدار کی تشخیص اور ٹیکسوں کے لگانے سے وضع کیا جا سکتا ہے لیکن ہمارے ہاں ایک کلرک کی مدد سے کیسے ہو سکتا ہے جس کی ماہانہ تنخواہ صرف ۱۵

فرانسیسی تو ہر ایک قصبہ کے ایک کمیٹی مقرر کر دیتے ہیں جو انجینیروں کی مدد سے زمین کی پیمائش کرتی ہے اور لگان کی شرح مقرر کرتی ہے لیکن ہمارے ہاں کسی کو یہ بھی نہیں معلوم کہ لوگوں کی تعداد اور زمین کتنی ہے بہذا لعنا سب ہے کہ لوگوں کو تربیت دے کر آہستہ آہستہ ان پر ذمہ داری ڈالی جائے اس کے ساتھ ساتھ ہر جماعت کے سپرد مخصوص کام کیا جائے۔ یورپ میں مالیات۔ جنگ امور داخلہ اور انصاف کے ماہرین خصوصی ہیں لیکن ہمارے ہاں جملہ امور والی کے ذمہ ہیں۔

اس طرح مدحت پاشا اور ان کے اعوان و انصار یورپین نظام ہائے حکومت سے دولت عثمانیہ کی اجتماعی حالت کے مطابق بہترین نظام حکومت انتخاب کر رہے تھے جو وہ بتدریج رائج کرنا چاہتے تھے جس کے وہ خوگر ہو چکے تھے ان کا خیال تھا کہ ملک کو قانون اساسی مل جائے گا اور پارلیمنٹری نظام حکومت مرتب ہو گا اور جب عبدالحمید خلیفہ بنے گا تو یہ سب کچھ مل جائے گا آخر کار مدحت پاشا وزارت عظمیٰ پر فائز کئے گئے اس کے چار دن بعد سلطان نے تمام قوانین بحال کر دیئے مجلس شوریٰ کی بنا پر دستور کا اعلان ہوا جس میں ہر فرقہ کو نمائندگی دی گئی تھی حکومت کے لئے دو ایوانوں کے قیام کا اعلان تھا ایک مجلس عوام کے منتخب نمائندوں پر مشتمل ہو گئی جس کا نام نمائندوں کی مجلس ہو گا دوسری مجلس کے ارکان کو حکومت نامزد کرے گی جس کا نام مجلس اعیان ہو گا یہ دستور ۱۱۹ دفعات پر مشتمل تھا اور آستانہ میں ایک محفل میں بتاریخ ۱۴ ذوالحج ۱۲۹۳ھ اس کا اعلان ہوا تھا۔ حکم تھا کہ ساری مملکت عثمانیہ میں اس پر عمل درآمد ہو گا اس دستور کے اعلان پر لوگوں نے خوشیاں منائیں بحری اور برّی قلعوں سے توپیں داغیں گئیں اس دستور میں سلطنت کے حقوق۔ وزراء اور عمالِ حکومت کے فرائض۔ ہر مجلس کے خصوصی اختیارات۔ عدلیہ۔ مال اور وزارتِ اقتصاد کے متعلق احکامات مندرج تھے تمام علامات نیک اور خوش آئند مستقبل کی پیش گوئی کر رہی تھیں اب مدحت پاشا وزیر اعظم اور عبدالحمید سلطان تھے جو کہ لوگوں کی مرضی سے خلیفہ ہوئے تھے، اور ان کے دست نگر تھے۔ مدحت ان کا حامی اور وہ مدحت کے ہمنوا تھے جمہوری نظام حکومت کے تابع فرمان تھے اس کے بعد اور کس چیز کی ضرورت تھی یہ لوگوں اور مدحت کا خیال تھا

لیکن یہ صرف ایک شگون ہی تھا اکثر سمجھدار لوگ اپنے افکار سے مسحور ہو جاتے ہیں اور وہ تصویر کا ایک ہی رخ دیکھتے ہیں ان کی مثال ایک نوجوان کی سی ہے جو درخت پر صرف پھول دیکھتا ہے مگر اس کو کانٹے نظر نہیں آتے مدحت پاشا نے رجعت پسندوں کی طاقت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا تھا اور نیک طبیعت ہونے کی وجہ سے ان کی

دسیسہ کاریوں سے ناواقف تھے وہ تو ان کے چہروں پر مسکراہٹ دیکھتے تھے لیکن اندرونی کھوٹ کا پتہ نہ تھا۔
انہیں رجعت پسندوں کی طاقت کا بھی اندازہ نہ تھا ان لوگوں کو عدل پسندی سے ڈر لگتا تھا مبادا وہ اپنے مفادات
سے محروم ہو جائیں جن کے کان خوشامد اور چاپلوسی کے عادی ہو چکے ہوں اس کو ایسا انصاف کہاں بھاتا ہے جو اس کو
جاہ وحشم سے محروم کر دے جو لوگ اصلاحات کے نفاذ پر خوشیاں منانے تھے اب انہوں نے دیکھ لیا کہ کسی
چیز کے حصول کے لئے کیسے ہاتھ پاؤں مارے جاتے ہیں ایک اہم چیز ان کی نگاہ سے اوجھل تھی وہ یہ کہ ملت
دیر سے غلامی کی زندگی بسر کر رہی تھی اور آزادی کی نعمتوں کی بہت جلد قدر نہ کر سکتی تھی جن قوموں نے جمہوریت اختیار کی تھی ان
کا مزاج بھی بڑی بڑی آزمائشوں کے بعد اعتدال کو پہنچا تھا ان میں کوئی خود غرض نہ تھا اور انہوں نے تجربی مدت بڑے آرام سے گزاری
تھی لیکن دولت عثمانیہ کا حال دوسرا تھا جب کسی شے کا تجربہ کیا جاتا تو کہہ دیا جاتا کہ یہ مناسب حال نہیں ہے۔
اور اگر کوئی غلطی ہوتی تو کہا جاتا کہ یہ طبعی سرشت کا نتیجہ ہے مجلس مبعوثین (پارلیمنٹ) کا انعقاد ہوتا
تو نمائندے بھانت بھانت کی بولیاں بولتے جن سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہر ایک کو حلقہ انتخاب کا خیال
تھا کہ پارلیمنٹ کا ممبر صرف اسی کا نمائندہ ہے قوم کا نہیں ہے اور اس پر لازم ہے کہ ان کی آرزوؤں کو پورا کرے
چاہے وہ ملک کے مفاد کے خلاف پڑتیں ہر ڈاک میں ممبروں کے پاس بے پناہ مراسلات آتے جن کا پڑھنا تو کجا
کھولنا بھی مشکل ہوتا کوئی اپنے مخالف کو معزول کرانا چاہتا تو کوئی ملازمت مانگتا اور کوئی ترقی کا خواہاں ہوتا ایک گدھے
والے کا گدھا گم ہو گیا تھا اس نے اپنے حلقہ کے ممبر کو لکھا کہ وہ اس کا گدھا واپس کرا دے۔
ایسا ہونا لازمی تھا۔ نظام حکومت نیا نیا قائم ہوا تھا ملک میں جہالت عام تھی عوام کو سمجھنے کے لئے ایک
مدت درکار تھی کہ ملکی مصلحت شخصی مصلحت پر مقدم ہوتی ہے اور ہر نمائندہ ملت کا خادم ہوتا ہے۔ اگر
شخصی مطالبات کم کر دیئے جائیں تو قوم کو زیادہ نفع پہنچ سکتا ہے لیکن لوگوں کو صبر کیسے ہو سکتا تھا وہ فراخ
حوصلگی سے کس طرح کام کر سکتے تھے اور دشمن اندر اور باہر تاک میں تھے۔
روس کو معاملات کی اصلاح پسند نہ تھی اس نے اس پر زبردست احتجاج کیا اور نئی حکومت کے ملنے
میں دیر لگا دی اس کے بعد بلقان میں سازشوں کا جال پھیلا دیا اور صربیا Macedonia جبل اسود اور بلوسنیہ
میں بغاوت کی آگ بھڑکا دی دشمن طاقتیں اُس کے دشمنوں کی تائید کر رہی تھیں عبدالعزیز کی فضول خرچی کی وجہ سے ملک کی مالی
حالت خراب تھی کوئی قابل ذکر سپہ سالار باقی نہ تھا غوثی پاشا قتل کئے جا چکے تھے روس بلغاریہ کو دولت عثمانیہ
سے توڑنے کے درپے تھا ہر ملک دندان آز تیز کئے ہوئے تھا اس افراتفری میں مدحت پاشا نے نظام حکومت

کا بارِ صبر سے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ وہ ملکی معاملات کے انتظام میں گزرتا تو رات خارجی مشکلات کے انصرام میں بسر ہوتی تھی ایک جگہ لکھتے ہیں۔ سلطان مراد کے خلیفہ ہونے سے آج تک میں نے فرائض کا اتنا بڑا بوجھ اٹھا رکھا ہے جو کہ بشری طاقت سے زیادہ ہے میں نے تو یہ زندگی قوم کے لئے وقف کر رکھی ہے ملک کو داخلی اور بیرونی مشکلات کا سامنا ہے ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے مجھ پر کوشش کرنا واجب ہے۔

مدحت پاشا اپنے کام میں مصروف تھے کہ ایک دن ایک فوجی نے ایک خط لا کر پیش کیا خط کھول کر پڑھا تو اس میں ان کی برطرفی کا حکم مندرج تھا اور لکھا تھا کہ وہ اپنے اہل و عیال کو دیکھے بغیر ملک سے باہر چلے جائیں۔ مدحت نے سلطان سے ملنے کیلئے اصرار کیا قاصد نے جواب دیا کہ قانون کی دفعہ ۱۱۳ کے ماتحت سلطان کو اختیار حاصل ہے کہ ناپسندیدہ عناصر کو ملک بدر کر دے ناظر ضابطہ نے سلطان کے حضور میں دو فیصلے پیش کئے تھے اور سلطان نے دونوں کی منظوری دیدی مدحت نے ایک لفافہ کھول کر پڑھا تو اس میں مذکور تھا کہ جاسوس نے ایک سپاہی کو اپنے ہمراہی سے کہتے ہوئے سنا تھا کہ مدحت پاشا رئیس جمہوریہ ہوں گے مدحت نے اسی کو کافی سمجھا اور دوسرا لفافہ نہ کھولا بلکہ یہ کہا کہ میرے ملک کی مثال اس مریض جیسی ہے جسکا اطباء علاج کر رہے ہوں اور جب اس کے شفایاب ہونے کی امید ہو تو اس کے دشمن اسکو زہر دیدیں یہ کہہ کر سر تسلیم خم کر دیا اور اپنے بال بچوں سے ملے بغیر جہاز پر چلے گئے۔

سلطان رائے عامہ سے خائف تھا اخبارات خاص کر الجوائب مدحت پر بہتان تراشی میں مصروف تھے ایک کہتا تھا کئی کاغذات ملے ہیں جن سے مدحت کی خیانت ظاہر ہوتی ہے دوسرا کہتا تھا کہ مدحت ملک کو جمہوریت میں تبدیل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا تیسرا کہتا تھا کہ اس نے ملک کو مشکلات میں پھنسا رکھا ہے اس بارے میں شعر و شاعری بھی اپنا پارٹ ادا کر رہی تھی مدحت کی ہجو میں قصائد لکھے گئے علمائے دین نے یہ کہہ کر خوشیاں منائیں کہ مدحت دین اور دنیا کی تفریق چاہتا ہے اخبارات اس سے چار دن پہلے مدحت کی مدح سرائی کیا کرتے تھے اور آج اس کی ہجو ملیح میں مصروف تھے لوگ حیرانی اور دہشت کے مارے زبان نہ کھول سکتے تھے۔ مدحت کے ہم خیال ملک بدر کر دیئے گئے اسی ہیجان میں سلطان نے دستور کو عارضی طور پر معطل کرنے کا حکم صادر کر دیا قارئین کرام کو پتہ ہونا چاہیئے کہ اس تعطل کی مدت تیس سال تھی۔

(۴)

بحری جہاز (عزالدین) مدحت کو یورپی سرحد کی طرف لئے جا رہا تھا اب مدحت پاشا کی کل توقعات پر پانی

بھر گیا تھا انقلاب کے نتائج ۔ دستور کا قیام ۔ قوم کے ارادے کے مقابل سلطان کی بے بسی اب قصۂ پارینہ تھیں۔ وہ اور ان کے ہم خیال اب زیرِ عتاب تھے اور اہل و عیال سے دور فاقہ مستی کی زندگی گذار رہے تھے۔

اگر ان کی جگہ دوسرا انسان ہوتا تو اصلاح اور مصلحین دونوں پر لعنت بھیجتا اور ملک کو اس کی قسمت کے حوالے کر دیتا اور اس کو تباہ و برباد ہوتے دیکھ کر خوش ہوتا اور فخر کرتا کہ اس نے خیر خواہی کیوجہ سے مآل کار سے ڈرایا تھا مگر کسی نے اس کی باتوں پر کان نہ دھرا اور کوئی بھی عبرت پذیر نہ ہوا لیکن مدحت پاشا کی سرشت ہی اور تھی ایسے خیالات اس کے دل میں پیدا ہوتے اور مٹ جاتے تھے بلکہ وہ اصلاح پر جدید وسائل کی تلاش میں رہتا۔ اسے اپنے آپ پر تعجب آتا کہ ملکی اصلاح کا جذبہ اس کے خون میں سرایت کئے ہوئے ہے اس کی مثال پرانی بیماری جیسی ہے جس سے شفایابی نہیں ہو سکتی۔ وہ سوچتے سوچتے جلد نتیجے پر پہنچا اس نے بھانپ لیا کہ روس دولت عثمانیہ سے نبرد آزما ہونے کے لئے فوجیں اکٹھی کر رہا ہے اور فوجوں میں ہمت و حوصلہ پیدا کرنے کے لئے خود قیصر میدان جنگ میں جائے گا۔ سب ملکوں کو اس کی فتح مندی کا یقین ہو گا اس وقت دوسرے ملکوں کو روس پر حملہ کی دعوت دینا ضروری اور واجب ہو گا۔ ہر ملک کو قائل کرنا پڑے گا کہ دولت عثمانیہ کی شکست اس کے لئے کتنی ضرر رساں ہو گی۔ اس غرض کے لئے وہ سپین گئے اور فرانسیسی اور انگریز مدبروں سے ملے اور انہیں ہمنوا کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد انہوں نے انگلستان کا سفر کیا اور حکومت ترکیہ کو اطلاع دی کہ میں نے انگلستان کی اقامت کے دوران اپنے ملک کو نفع پہنچانے اور اس کی عظمت کو بلند کرنے کی کوشش کی ہے اور میں فخر کرتا ہوں کہ مجھے اس میں کچھ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ پھر دوسرا تار دیا کہ میں آج کل وہی آدمی ہوں اور اپنی دھن میں لگا ہوا ہوں۔ عمر بھر میری آرزو رہی ہے کہ ملک کی مصلحت کو مدنظر رکھ کر کام کروں میں نے ملک کو مصائب سے باہر نکالنے کے لئے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے۔ جس قسم کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی جائے میں بخوشی اٹھانے کو تیار ہوں۔ کیونکہ ملکی مصلحت یہی تقاضا کرتی ہے۔ مصیبت یہ تھی کہ بعض حکومتیں مدحت کو دولت عثمانیہ کا با اختیار نمائندہ نہ مانتی تھیں وہ تو انہیں جلاوطن قوم پرست سمجھتی تھیں۔ آخر کار انہوں نے اپنے موقف کی تصحیح کے لئے اپنی حکومت کیطرف رجوع کیا لیکن کسی نے ان کی بات نہ سنی۔

اس کے بعد ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ناظر تشریفات نے سلطان کے حضور میں مدحت کا ذکر کیا۔ سلطان نے پوچھا کہ مدحت کی گذران کیسی ہو رہی ہے۔ ناظر تشریفات نے جواب دیا کہ ان کا بہت برا حال

ہے ایک ملک سے دوسرے ملک منتقل ہوتے رہتے ہیں اور قرض لے کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ سن کر سلطان کا دل بھر آیا اور وہ خوب رویا اور ایک ہزار لیرہ بھیجنے کا حکم دیا، ناظر تشریفات نے مدحت کو خط بھیجا اور آخر میں یہ لکھا کہ اسے سلطان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے اور اس سے گڑگڑا کر معافی مانگنی چاہئیے۔

غریب ناظر تشریفات نے یہ سمجھ لیا تھا کہ سب لوگ اس جیسے کمینے اور خوشامدی ہوتے ہیں خط کو پڑھ کر مدحت کے دل پر چرکا لگا اور اسکے غیظ و غضب کی کوئی انتہا نہ رہی جواب میں لکھا۔

یہ درست ہے کہ میں تنگی ترشی سے گذارہ کر رہا ہوں میں نے خرستالی سے بارہ ہزار فرانک ادھار لئے تھے جو ختم ہو چکے ہیں آج میں مزید قرض لینے کی کوشش کر رہا ہوں تاکہ اپنا اور بال بچوں کا پیٹ پال سکوں۔ لیکن اس کے ساتھ غیرت مند بھی ہوں میں ننگے جسم پیدا ہوا تھا اور ایسے ہی مروں گا میں حاجی اشرف آفندی کا بیٹا ہوں اور ہمارا حسب و نسب بہت اونچا ہے اس کے علاوہ میں صرف خداوند تعالیٰ ہی سے منتسب ہوں میں نے عہد کر رکھا ہے کہ میں ہمیشہ سچ ہی بولا کروں گا میں اسی کو توشہ آخرت سمجھے ہوئے ہوں چاہے مجھے کتنی ہی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے۔

میں نے کونسا جرم کیا ہے کہ معافی کا خواستگار بنوں سلطان عبدالعزیز کے مرنے پر میں نے سلطان مراد کو خلیفہ بنایا اور جب وہ بیمار پڑا تو اسکی جگہ سلطان عبدالحمید کو تخت پر بٹھانے کی کوشش کی اس کی تخت نشینی دستور کے اعلان اور اصلاحی پروگرام بنانے پر مشروط تھی۔

جب سے میں نے آستانہ چھوڑا ہے میں حکومت کی اصلاح اور اسے خطرات سے بچانے میں مصروف ہوں مجھے تو اپنی ذات ہی کی بالکل پروا نہیں تو پھر اعتذار کیوں کروں۔

میری عمر ۵۶ برس کی ہو رہی ہے اس سے زیادہ کی امید نہیں رہی میرے اسلاف میں کوئی بھی ساٹھ سال کی عمر سے زیادہ نہیں جیا میرے دن پورے ہو چکے ہیں اب میں اکیلا مرنا چاہتا ہوں اور آقائے ولی نعمت کے لئے دعا گذار ہوں۔ یہ ہے جواب کا خلاصہ جس سے مدحت کی قوت۔ عظمت۔ جوانمردگی اور عالی حوصلگی کا اچھی طرح سے پتہ چلتا ہے۔

ناظر تشریفات نے اس خط کو دلہن کے زیوروں اور کپڑوں کے بغیر موسوم کیا ہے بات اصل میں یہ ہے کہ بہت سے لوگ غیرت اور بلندی اخلاق کو خوبصورت نہیں سمجھتے ان کی نظروں میں صرف نفاق اور خوشامد ہی جچتی ہے ایک دن مدحت انگریز دوست کے ساتھ اس کے گاؤں میں اقامت پذیر تھے کہ اچانک دولت عثمانیہ

کے سفیر متعینہ انگلستان نے ان سے ملاقات کی اور سلطان کا پیغام دیا کہ وہ اہل وعیال سمیت جزیرہ کریٹ میں قیام کر سکتے ہیں وہاں جاکر انہوں نے دو ماہ گذارے پھر گورنر بنا کر شام اور اس کے بعد ازمیر بھیجے گئے اسکے بعد ان کی زندگی کا المناک باب شروع ہوا اور ان کی موت پر ختم ہوا اس کا بیان آگے آئیگا۔

ان اعمال کے علاوہ مدحت پاشا نے بہت سے رفاہ عام کے کام ان صوبوں میں کئے، جہاں انہیں کام کرنے کا موقعہ ملتا تھا یہ ان کے زندہ جاوید کارنامے ہیں جن کی وجہ سے وہاں کے باشندے انہیں تعریف وتوصیف سے یاد کرتے ہیں۔

وہ عراق۔ سلانیک۔ شام اور ازمیر میں گورنر رہے ہر جگہ ان کے کام کرنے کا ڈھنگ یکساں تھا پہلے تو وہ بدمعاشوں کی طرف توجہ کرتے جو امن وامان کے لئے خطرہ کا باعث تھے ان کے دلوں میں ہیبت بٹھا دیتے جس سے ملک میں امن وامان کا دورہ ہوجاتا پھر عدل وانصاف جاری کرتے اس سے لوگوں کو چین ملتا اور وہ اپنے احوال کو محفوظ سمجھتے صوبے کے گنے چنے لوگوں کو لیکر ایک مجلس شوریٰ قائم کر لیتے ان سے مشورہ طلب کرتے۔ سچ بات کہنے کی جرأت دلاتے مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کی تدابیر بتلاتے راستوں کی اصلاح کرتے اور ملک کے مختلف شہروں کو ایک دوسرے سے منسلک کرتے اس سے ملکی معاملات کے جلد نپٹانے میں مدد ملتی ——— ملکی آمدنی کو ہر صوبہ کے مناسب حال استعمال میں لاتے جس سے اچھے نتائج برآمد ہوتے مدارس قائم ہوتے جہالت کی گھٹا چھٹ کر علم کی روشنی پھیلتی۔

سلطان عبدالعزیز کے عہد میں ایک سال عراق کے گورنر رہے اس اثنا میں قبائلی سرداروں کو مطیع کیا نافرمانوں کی سرکوبی کی حکومت کے شعبوں کی اصلاح کی کسان مطمئن ہوکر زراعت میں اور صناع صنعت میں مشغول ہوگئے بغداد میں پہلا چھاپہ خانہ قائم کیا اور جریدہ (الزوراء) کے جاری کرنے میں حوصلہ افزائی کی مشترک کمپنیوں کے اجراء میں مدد دی ایک کمپنی بغداد اور بصرہ کے درمیان جہاز چلاتی تھی دوسری بغداد اور کاظمیہ کے درمیان ٹرام وے جاری کئے ہوئے تھی دجلہ کا رخ موڑ کر بغداد اور بصرہ کے درمیان مسافت کم کر دی۔ زراعتی انجینئروں کو ملک کی زراعتی حالت کے مطالعہ پر مامور کیا اور بغداد میں ایک سیرگاہ ملت باغچہ سی کے نام سے بنوائی انہیں پتہ چلا کہ نجف اشرف میں بہت سے خزانے مدفون ہیں ان میں بہت سے قیمتی جواہرات تھے جو مقابر اور مشاہد کو مزین کرتے تھے اور جو وہابیوں کے حملہ کے وقت چھپائے گئے تھے۔ مدحت نے ان جواہرات کو برآمد کیا جوہریوں سے ان کی قیمت لگوائی تو ان کی قیمت تین لاکھ لیرہ پڑی مدحت نے چاہا کہ ان جواہرات کو بیچ کر نجف اور ایران کے درمیان ریلوے لائن بچھا

دی جائے ۔ اس کارِ خیر میں بہت سے ایرانی شامل ہو سکتے تھے لیکن علماء نے موافقت نہ کی اس طرح یہ منصوبہ عمل میں نہ آسکا ایک نئی چیز ان کی وجہ سے ظہور پذیر ہوئی انہوں نے بغداد میں مجلس شوریٰ قائم کی جہاں عرب کے تمام معاملات کا فیصلہ کیا جاتا تھا اس وقت لوگ عزم و بے باکی سے رائے ظاہر کرنے کے عادی نہ تھے اور نہ والی کی رائے کے ہوتے ہوئے ان کی رائے کی کوئی وقعت تھی ایک دن انہوں نے ممبروں کو جمع کیا اور کہا میری رائے میں بہت سے امور اصلاح طلب ہیں ان کے لئے روپے کی ضرورت ہے میں باب عالی سے گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ ان پر اخراجات برداشت کرنے کے لئے ہمیں ٹیکس لگانے کی اجازت دی جائے آپ لوگوں کی کیا رائے ہے سب نے کہا کہ یہی باصواب رائے ہے اس مطلب کا محضر لکھا گیا اور سر بمہر کر دیا گیا پھر دوسرے دن ارکان شوریٰ کو اکٹھا کیا اور کہا میرے خیال میں زیادہ ٹیکس لگانا صریح ظلم ہوگا عرضداشت کل روانہ کی جا چکی ہے اگر آپ مشورہ دیں تو ایک اور محضر بھیج دیا جائے جس میں ٹیکسوں کے کم کرنے کے مدلل اسباب درج کئے جائیں سب نے ان کی موافقت کی اور جس طرح پہلی تجویز کی تائید کی تھی اسی طرح دوسری کی تائید کر دی ۔ انہوں نے دونوں محضر دکھا کر کہا کہ یہ اب تک میرے پاس پڑے ہوئے ہیں میں نے انہیں تاحال نہیں بھیجا ۔ میں تو تمہیں آزمانا چاہتا تھا اس مجلس کی وقعت ہی کیا ہے جب تم ہمیشہ میری موافقت ہی کرتے ہو پھر ان کو حریت ۔ اس کے فوائد ۔ شخصیت اور اس کی تکوین اور رائے کی مضبوطی پر لمبا چوڑا لیکچر دیا ۔

شام کے معاملات ذرا ٹیڑھے تھے وہ شام کے گورنر سلطان عبدالحمید کے عہد میں ہوئے تھے ، جب کہ ان پر جمہوریت قائم کرنے کی تہمت لگ چکی تھی سلطان اس کے وزراء اور ان کے حاشیہ نشین مدحت کے دشمن بن چکے تھے پھر شام میں جو مشکلات پیش آئیں وہ عراق میں نہ تھیں ۔ عراق میں بدوؤں اور ان کے قبائل کی وجہ سے مختلف مسائل درپیش تھے ایران کے ساتھ بھی اس کے تعلقات تھے شام کے معاملات کا حال جدا تھا لبنان کے امور فرانس سے متعلق تھے دروز کے انگلستان سے تھے ۔ ہر حکومت کے علیحدہ علیحدہ مدارس اور گرجے تھے ملکی معاملات پر جب انہوں نے پہلی نظر ڈالی تو دیکھا کہ مسلمانوں میں جہالت کا دور دورہ ہے فرانسیسی دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کر رہے ہیں مسلمانوں کے صرف پرائمری مدارس ہیں جہاں بچے قرآن پاک پڑھتے ہیں اب انہوں نے مسلمان بچوں کے مدارس کی اصلاح اور دوسرے تعلیمی معاملات پر توجہ دینی شروع کی ۔

اس کے لئے انہوں نے انجمنیں بنائیں ۔ چندہ جمع کیا ۔ سکول کھولے مساجد کی اصلاح کی اور ان میں مدرسے

قائم کئے۔ حکم دیا کہ اگر بچہ چھٹے سال مدرسہ میں نہ داخل ہو گا تو اس کے سرپرست کو سزا دی جائے گی۔ اوقاف کی آمدنی سے تعلیم کو ترقی دی ان کے عہد میں جمعیتہ المقاصد الخیریۃ کی بنیاد پڑی اور اس کی شاخیں تمام ملک میں پھیل گئیں۔

اقتصادی اور انتظامی معاملات کی اصلاح کے لئے انہیں دیگر ممالک سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ فرانس کو لبنان میں امتیازات حاصل تھے اور حکومت عثمانیہ اسے پچیس ہزار لیرہ ادا کرتی تھی مدحت نے وزیر اعظم کو اس رقم کے روکنے کے لئے لکھا تو فرانس کے غیظ و غضب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس طرح کی اور بھی مشکلات پیش آئیں وسیسہ کاریوں میں لگے ہوئے تھے انہوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ مدحت پاشا شام کو خود مختار سلطنت بنانا چاہتے ہیں اس کی تائید میں یہ پیش کیا جاتا تھا کہ ان کے سامنے کسی نے مدحت زندہ باد کا نعرہ لگایا تھا اور کسی کاتب نے مدحت کو خدیو کے القاب سے نوازا تھا داخلی اور خارجی مشکلات کی وجہ سے ان کو شام میں عراق جیسی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

آخرکار مدحت کو تبدیل کر کے ازمیر بھیج دیا گیا یہاں زیادہ دیر تک ان کا قیام نہ رہا اس کے بعد ان کا ستارہ اقبال گردش میں آگیا۔ سلطان عبدالعزیز کی وفات کے پانچ سال بعد ان کی موت کا مسئلہ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ افواہیں پھیلائی گئیں کہ سلطان عبدالعزیز نے خودکشی نہیں کی تھی بلکہ ان کی موت میں مدحت پاشا اور ان کے دوستوں کا ہاتھ تھا ازمیر میں مدحت کو خبر ملی کہ تحقیق حال کے لئے ان کو گرفتار کیا جائے گا ایک دوست نے انہیں اطلاع دی کہ آپ باہر چلے جائیں میں آپ کو اخلاص سے یہ مشورہ دیتا ہوں" بہت سے فرنگی دوستوں نے کہا کہ باہر جہاز تیار کھڑا ہے آپ بیرون ملک تشریف لے جائیں آپ نے سختی سے انکار کر دیا اور کہا میں بھاگ کر کس طرح جرم کا اقرار کر لوں جب کہ میں بے گناہ ہوں۔

وہ اپنے گھر میں سوئے ہوئے تھے کہ فوج نے ان کے گھر کا محاصرہ کر کے انہیں حراست میں لے لیا۔ اور سلطان عبدالعزیز کے قتل کی سازش میں شرکت کے الزام کی تحقیق کیلئے آستانہ روانہ کر دیا

سلطان عبدالحمید خلیفہ ہوا تو وہ مدحت سے ہراساں تھا اُسے ڈر تھا کہ عبدالعزیز جیسا ڈرامہ اس کے ساتھ کھیلا جائے گا۔ یہ ڈر وہم کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ دولت عثمانیہ کے تمام مالی اور فوجی ذرائع اس کی ذات کی حفاظت اور مدحت پاشا اور ان کے دوستوں کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ سلطان اور اس کے حاشیہ نشین فتنہ کو شروع میں اکھیڑنا چاہتے تھے آخر الامر انہوں نے مدحت کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا ان پر تہمت لگائی گئی

مقدمہ قائم کیا گیا شہادتیں فراہم کی گئیں بالآخر سرسری سماعت کے بعد انکو پھانسی کی سزا کا حکم سنایا گیا۔ انگریزی سفیر ا
اور دوسرے ممالک کے نمائندوں کی مداخلت سے پھانسی کی سزا ملک بدری میں تبدیل ہو گئی اور ان کو
جہاز میں بٹھا کر جدہ اور پھر طائف بھیج دیا گیا آستانہ سے نکلنے پر ان کو متعدد طریقوں سے تنگ کیا گیا ان کی خوراک
کم کر دی ان کو سونے نہیں دیا جاتا تھا وہ طائف کے قلعہ میں تین سال رہے ان کو قسم قسم کی تکلیفیں اور
اذیتیں دی گئیں جوں جوں وقت گذرتا جاتا تھا ان کے مصائب میں اضافہ ہوتا جاتا تھا نگرانوں میں جو کوئی زیادہ
سختی کرتا تھا وہ ترقی پاتا تھا اگر کوئی نرم ہوتا تو تبدیل کر دیا جاتا اس عرصہ میں مدحت اپنے گھر والوں کو روپیہ
نہ بھیجنے کے لئے مختلف حیلوں اور تدبیروں سے کام لیتے .... اگر گھر
والے روپے بھیجتے تو ان تک نہ پہنچتا ان کے ساتھ آٹھ اور بڑے آدمی تھے اب سب کی گذران صرف پانی
پر رہ گئی تھی ارباب کار کا مقصد تھا کہ وہ بھوکے مر جائیں لیکن وہ زندہ تھے آخر کار وہ تنگ آ گئے تو انہیں زہر دینا چاہا
لیکن مدحت اور ان کے ساتھی ان کے عزائم کو بھانپ گئے۔

آخر کار تنگ آ کر قلعہ والوں نے ان کا گلا گھونٹنا چاہا اس زمانہ میں مدحت نے گھر والوں کو لکھا کہ "
شائد یہ میرا آخری خط ہو" پہرہ داروں نے ہم سے قلم۔ سیاہی اور کاغذ وغیرہ چھین لیا ہے انہوں نے ہمیں زہر دینا
چاہا لیکن پتہ چل گیا"

یہ لوگ اپنا کام کر کے رہیں گے اگر خط پہنچنے سے قبل میری موت کی خبر مل جائے تو غمگین نہ ہونا میں
اللہ تعالیٰ سے طالب مغفرت ہوں کیونکہ میں وطن کی راہ میں مر رہا ہوں اور میں تمہیں اس پیدا کرنے والے کی حفاظت
میں دیتا ہوں جو ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے۔

مدحت پاشا عمر بھر اجتماعی اصلاح کیلئے کوشاں رہے جدید تمدن نے نظام حکومت کیلئے مجلس شوریٰ
کو بہترین قرار دیا ہے اور یہ اسلامی تعلیمات کے بالکل مطابق ہے مدحت نے بھی اسی کو پسند اور انتخاب کیا تھا
تعلیم کی اشاعت اور ملک کی حیات اقتصادی کی تنظیم کے لئے بہترین طریقوں سے کام لیا ان باتوں کے لئے
وہ قوم کی استعداد اور فطری اہلیت کو بھی مدنظر رکھتے تھے جو ممکن ہوتا اس کے لئے فوراً کمربستہ ہو جاتے اور
جو ناممکن ہوتا اس کو کچھ عرصہ کے لئے ملتوی کر دیتے تاکہ قوم اس کے لئے تیار ہو جائے اس راہ میں جو تکلیف
پہنچتی وہ ہنسی خوشی برداشت کرتے کیونکہ اصلاح کا رشتہ ان کے دینی عقیدہ سے ملا ہوا تھا (اس معاملہ میں
وہ شیخ سعدی کے ہمنوا تھے)۔

طاعت بجز خدمت خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

قوم کی رہنمائی کرکے اسکو حقوق سے روشناس کرانا اور اس راہ میں جو روڑے اٹکتا اس سے بگڑنا اور لڑنا اس سے زیادہ کار خیر اور کیا ہو سکتا ہے۔

جب وہ ملک بدر تھے تو اسی وجہ سے شاداں و فرحاں رہا کرتے تھے اور ہر گھڑی موت کا انتظار کیا کرتے تھے۔ اپنے گھر والوں کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

میں قرآن پاک کا دور کر رہا ہوں اس آیت کا تکرار بہت اچھا لگتا ہے "جو بھی مصیبت پہنچتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے پہنچتی ہے اور جو کوئی اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے اس کا دل ہدایت پاتا ہے" میں اس کو بار بار پڑھتا ہوں اور اس سے تسلی حاصل کرتا ہوں ہجو اور افترا کو میں خاطر میں نہیں لاتا میں نے اپنے تمام امور اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیئے ہیں۔ زندگی چند روزہ ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اس مصیبت پر اجر دے گے انبیاء اور اولیاء جو اس کی راہ میں مقتول ہوئے یا داخل زنداں ہوئے تو انہوں نے اس پر صبر کیا ان کی زندگی ہمارے لئے نمونہ عمل ہے۔۔ جب اپنے اذکار اور اپنے ورد سے فارغ ہوئے تو بعض مذاکرات کی تدوین شروع کر دیتے۔

ان کی المناک موت نے ان کے افکار کی جتنی خدمت کی وہ تمام عمر خود مدحت سے نہ ہو سکی نیک اور صالح لوگوں کے دلوں میں غصہ اور انتقام کی آگ بھڑکنے لگی روز افزوں ظلم جلتی پر آگ کا کام کر رہا تھا جس سے سلطان عبدالحمید کا تاج و تخت بھسم کر دیا گیا اسکا وہی حال ہوا جو اس سے پہلے عبدالعزیز کا ہو چکا تھا اس واقعہ نے خلافت کے فکر کی جڑ اکھیڑ ڈالی

اب ہم دوسرے مصلح کی طرف منتقل ہوتے ہیں ان کا اسم گرامی سید جمال الدین افغانی ہے۔

سیّد جمال الدین افغانی

۱۲۵۴ھ - ۱۳۱۴ھ

۱۸۳۹ - ۱۸۹۷ء

اگر محمد بن عبدالوہاب کو عقیدہ کی اصلاح کی دھن تھی اور مدحت پاشا حکومت اور انتظامی شعبوں کی اصلاح کی فکر میں تھے تو سید جمال الدین پہلے عقل اور نفس کی اور بعد ازاں حکومت کی اصلاح کرنا چاہتے تھے ان تمام باتوں کا سلسلہ وہ دین سے جوڑتے تھے۔ مدحت قوم کی اصلاح حکومت کی اصلاح سے کرتے تھے لیکن جمال الدین قوم کی اصلاح سے حکومت کی اصلاح کرنا چاہتے تھے مدحت کا قول تھا کہ حکومت راعی ہے جب حکومت سنور جائے گی رعایا بھی درست ہو جائے گی ان کا منتہائے مقصود دستور کا نفاذ تھا جس سے قوم کو بے اندازہ نفع پہنچے گا جمال الدین کہتے تھے کہ کوئی بھی قوم ہو نمائندہ طاقت اور قوت اسی وقت کام دے سکتی ہے جب کہ اسکا سرچشمہ نفس قوم ہو مجلس نیابت خواہ کوئی بادشاہ قائم کرے یا امیر یا اس کی محرک کوئی بیرونی طاقت ہو تو وہ موہوم شے ہوگی کیونکہ وہ اپنے پیدا کرنے والے کے ارادہ پر موقوف ہوگی اس لئے عقول و نفوس کی اصلاح پہلے اور حکومت کی بعد میں کی جانی چاہئیے صالح حکومت سے کونسا نفع حاصل ہو سکتا ہے جب کہ قوم غیر صالح ہو۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ حکومت اسی وقت برقرار رہ سکتی ہے جب کہ وہ رائے عامہ سے ڈرے، اپنے فرائض ادا کرتی رہے اور اپنے حدود میں رہے اگر ایسا نہ ہو تو طبیعت البشریہ حکام کو نفع خوری پر آمادہ کر دیتی ہے بالفرض اگر صالح حکومت کے پیچھے قوم کی طاقت اور بیداری نہ ہو تو ایسی حکومت پائیدار ثابت نہیں ہو سکتی اس کی جگہ کوئی غیر صالح لے لے گا تو قوم کو اس کے انتخاب کا مقدور نہ رہے گا اور نہ وہ اس کے اعمال کی نگرانی کر سکے گی۔ ۱۲۹۶ھ کی بات ہے ایک جگہ لکھتے ہیں: فرض کیا کہ نمائندہ مجلس قائم ہو جاتی ہے اور اس میں دایاں بازو بے اثر رہتا ہے تو تمام ارکان دوسری طرف مائل ہو جائیں گے اور ان کے آلہ کار بن جائیں گے اور سمجھ لیں گے کہ ملک کا دفاع اور حاکم کا محاسبہ ایک قسم کی بے ادبی اور بے تدبیری ہے اس لئے عقل اور نفوس بطور مقدمہ کے ہیں اور صالح حکومت ان کا نتیجہ ہے۔

○

سید جمال الدین افغانی الاصل اور شریف النسب تھے۔ سلسلہ نسب حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ بن علی تک منتہی ہوتا ہے

افغانستان میں شرافت نسب کی سب ملکوں سے زیادہ تعظیم و تکریم کی جاتی ہے۔ شرف سیادت اس کے علاوہ تھا ان کے گھر والے بعض علاقوں کے حاکم تھے لیکن ہمیں اس سے سروکار نہیں کبھی کبھی شور زمین میں اچھی نباتات پیدا ہو جاتی ہے اور فاسد نباتات اچھی زمین میں۔ اس سے ہم نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ سید جمال الدین کے خاندان نے صرف جمال الدین اور محمد عبدہ کے گھرانے نے صرف محمد عبدہ کو جنم دیا ہے بہت سے خاندان ان جیسے یا ان سے اونچے ہوتے ہیں لیکن اُن میں ان جیسا فرد نہیں پیدا ہو سکا فذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء

(یہ تو اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جسے چاہے وہ عطا کرتا ہے) انہوں نے ابنائے زمانہ کی طرح ازھری طریقہ کے مطابق فارسی اور عربی کی تعلیم پائی اس درس کا نمایاں وصف اسلامی فلسفہ اور تصوف کا لغائر مطالعہ ہے جس طرح آج کل ویرانیوں کا دستور ہے اس سے ان کی ثقافت کی بنیاد پڑی ہندوستان آکر جدید طریقہ کے مطابق حساب پڑھا تمام ممالک اسلامیہ کی سیاحت کی اور مکہ معظمہ تک پہنچے اور مشرق کی زندگی سے آگاہی ہوئی اس وقت افغانستان میں زمام اقتدار حاصل کرنے کے لیے رسہ کشی ہو رہی تھی آپ نے بھی ملکی سیاست میں سرگرم حصہ لیا ایک فریق کی حمایت کی اور اس کے وزیر بن گئے۔ فتح و شکست سے بھی دوچار ہوئے جب اجنبی طاقتوں نے مداخلت کی تو انہیں سیاست، خصومت اور مکاری کا پتہ لگا۔

بڑی عمر پا کر فرانسیسی زبان سیکھی کسی سے حروف ہجایہ سیکھ لئے تھے پھر تین ماہ زبان کے مفردات یاد کرتے رہے جس سے اتنی لیاقت بہم پہنچا لی کہ کتابیں پڑھنے اور ان سے ترجمہ کرنے لگے پیرس جا کر رہے تو کچھ اور وسعت پیدا کر لی اس سے زیادہ درک نہ پیدا ہو سکا۔

بہت سے لوگ ان سے زیادہ لکھا اور پڑھ لیتے ہیں کتابوں کی کتابیں چاٹ لیتے ہیں لیکن ان جیسی شخصیت پیدا نہیں ہوتی نہ ان میں ذہانت۔ بصیرت اور قوت ادراک پیدا ہوتی ہے۔ سید جمال الدین گہرے غور و فکر سے کام لے کر معانی کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے اور ان کو مناسب شکل و صورت دیکر اظہار خیال کیا کرتے تھے۔ مشکلات حل کرنے کی بے پناہ قوت رکھتے تھے ان کی ایک نظر سے تمام عقدے حل ہو جایا کرتے تھے ہر بحث میں ماہر فن کی طرح حصہ لیا کرتے تھے گویا اپنے موضوع کے تمام گوشوں کو سمیٹ رکھا ہے۔ فنون میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ اختراعی قوت اس کے علاوہ تھی گویا کہ ان کا ذہن اختراع و ابداع کا عالم تھا بحث و مناظرہ کے ماہر اور تیز طرار تھے اس باب میں کوئی بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا سلامتی قلب ان کا امتیازی وصف تھا۔ بڑے بردبار تھے اگر کوئی ان کی شرافت اور دینداری کے درپے ہوتا تو یہ حلم غضب میں بدل جاتا جس سے

آگ بھبھوکا ہو جاتے بیھمدلی کے باوجود حملہ کرنے والے شیر بن جاتے ۔ ہاتھ کے سخی تھے ۔ اللہ تعالیٰ پر پختہ یقین رکھتے تھے انقلاب زمانہ سے خائف نہ تھے ۔ شیخ محمد عبدہ کا بیان ہے کہ وہ صورت و شکل سے حرمین کے رہنے والے خالص عربی معلوم ہوتے تھے اپنے حجازی اسلاف کی تصویر تھے ۔ درمیانہ قد درمیانہ جسم اور گندم گون تھے ۔ عصبی المزاج تھے ۔ معتدل سر ۔ چوڑی پیشانی ۔ بڑی بڑی آنکھیں موٹے موٹے رخسار ، چوڑی چکلی چھاتی رکھتے تھے ۔ پُرہیبت تھے ملاقات کے وقت خندہ پیشانی سے پیش آتے اللہ تعالیٰ نے ان کو تمام خصلتوں سے نوازا تھا جو کہ ان کی خلق پر دال تھا ۔ اپنے فرائض اور اعمال کو خوب سمجھتے تھے غرض مقصود پانے کیلئے جو کوشش کرنی پڑتی ہے اس سے آگاہ تھے عمر بھر شادی نہیں کی اور نہ مال و دولت کی کبھی پرواہ کی اپنے افکار اور مبادیات کے لئے جیتے تھے ۔ دن میں ایک مرتبہ کھاتے ہاں چائے اور سیگریٹ کے رسیا تھے ۔ ملک بدری کے لئے ہر لحظہ تیار رہتے تھے ۔ اس کے لئے کپڑے ان کے جسم پر کتابیں سینہ میں ، افکار دماغ میں اور مصائب دل میں تیار رہتے تھے

ایران ۔ ہندوستان ۔ حجاز اور آستانہ کی سیاحت کر چکے تھے اور مدتوں قیام کیا تھا لیکن ان کی زندگی کا یادگار زمانہ مصر کی اقامت تھی جس کی میعاد اول محرم ۱۲۸۸ھ سے لیکر ۱۲۹۶ھ تک ہے (مطابق مارچ ۱۸۷۱ء لغایت اگست ۱۸۷۹ء) اس زمانہ میں انہوں نے اپنی اصلاحی تحریک کا بیج مصر میں بویا یہ آٹھ سال عالم اسلام خاص کر مصر کے لئے خیر و برکت کا زمانہ تھا بعد میں جذبہ آزادی اور اس کی راہ میں جو سرفروش پیدا ہوئے ان کی اصل یہی اصلاحی خیالات تھے بعد میں دوسرے عوامل بھی پیدا ہوئے جن سے ان سرفروشانہ جذبات کی پرورش میں مدد ملی ۔

سید جمال الدین کی اصلاحی تحریک ایران اور آستانہ میں تو نہ پنپ سکی مگر مصر میں خوب بڑھی اور پھولی ۔

ریاض پاشا کا احسان ہے کہ وہ سید صاحب سے متاثر ہوئے ریاض نے ان کو دوسری طرح کا عالم پایا جو کہ دینی اور دنیاوی امور دونوں سے واقف تھا ۔ سمجھدار اور بات کہنے کا سلیقہ رکھتا تھا ۔ ریاض پاشا کی سعی و سفارش سے حکومت مصر نے دس پونڈ ماہوار کا وظیفہ سید صاحب کے لئے مقرر کر دیا ۔

یہ آٹھ سال مصریوں کے لئے جاں کاہ تھے پہلے تو ان کے ہاں خوشحالی کا دور دورہ تھا لیکن خدیو مصر نے وسائل ناکافی پا کر ادھار لینا شروع کر دیا اس سے قرض خواہ مصری معاملات میں دخل دینے لگے اور اسکے ذرائع آمدنی اور خرچ کی پڑتال کرنے لگے جسکی وجہ سے مصر کو معاملات پر کوئی اختیار نہ رہا ۔ لوگ تنگی و ترشی سے گذران کرتے تھے اور اس مصیبت سے گلو خلاصی کی فکر میں تھے مگر انہیں کوئی راہ سوجھتی نہ تھی ۔

قرض پر قرض چڑھتا گیا ۱۸۶۴ء سے ۱۸۷۵ء تک قرضہ کی مقدار پچیس ملین پونڈ تک پہنچ چکی تھی اس کے لئے

(Comme) کمیشن مالیات کی جانچ کے لئے آیا اور خدیو کو مجبور کر دیا کہ وہ آئندہ قرض لینے کے لئے ایک کمیٹی سے مشورہ لے جو ملک کی مالیات کے کنٹرول کے لئے بنائی گئی تھی۔

۱۸۷۶ء میں قرضہ اتارنے کا ایک محکمہ بنایا گیا جس کو بھاری رقمیں ادا کی جاتی تھیں اسی سال مصری مالیات کی نگرانی دو نگرانوں کے سپرد ہوئی ایک نگران انگریز تھا جو ملک کی آمدنی پر نظر رکھتا تھا دوسرا فرانسیسی تھا جو خرچ کی نگرانی کرتا تھا مصری ریلوے اور اسکندریہ کی بندرگاہ کے انتظام کے لئے ایک مخلوط کمیٹی قائم کی گئی۔ ملکی قرض خواہان کے مفادات کے تحفظ اور قرضہ کی ادائیگی کی . . قسطیں مقرر کرنے کے لئے یورپ سے ایک کمیشن الگ آیا تھا اس مالی نگرانی نے آگے بڑھ کر مخلوط وزارت کی شکل اختیار کر لی نوبار پاشا وزیر اعظم تھے وزیر مالیات انگریز اور وزیر امور ایک فرانسیسی تھا۔

مالیات کا شعبہ قوم کے لئے زندگی کی حیثیت رکھتا ہے اس کے ہاتھ میں سب معاملات کی چابی ہوتی ہے۔ قرض ادا کرنے کیلئے ملکی آمدنی میں اضافہ کرنے کا خیال ہوا اس کے لئے شرط تھی کہ آمدنی کے تمام ذرائع پر کنٹرول کیا جائے یہ ذرائع کسانوں سے مالیہ وصول کرتے تھے اس سے زرعی اصلاحات کے وسائل کی تلاش ہوئی پھر ٹیکسوں اور مالیہ کی وصولی کے لئے ان شعبوں کی نگرانی ضروری تھی اس طرح جو مالی معاملات کی نگرانی کرتا تھا وہ حکومت کے تمام شعبوں پر حاوی ہو سکتا تھا یہ سب کچھ سید جمال الدین کے زمانہ اقامت کا واقعہ ہے وہ فطری طور پر سیاست سے دلچسپی رکھتے تھے ان کی خاندانی سیادت نے انکے اس ذوق کی پرورش کی تھی افغانستان میں تاج و تخت کے دعویداروں میں نزاع ہوئی تو سید صاحب بھی اس نزاع میں شریک تھے مصری واقعات نے ان کے سمندِ شوق کو ہوا دی اور مصریوں نے ان کی آواز پر لبیک کہا۔

○

ان کی تعلیمی زندگی دو طرح کی تھی وہ خان خلیلی میں باضابطہ طور پر اپنے گھر میں درس دیتے تھے دوسرا درس عملی ہوتا جو ہر وارد و صادر کو دیتے جو ان سے ملنے آتا البوستہ کے قہوہ خانہ میں بھی اجتماعات ہوتے تھے۔

گھر میں وہ بعض ازہری فضلاء مثلاً شیخ محمد عبدہٗ۔ شیخ عبدالکریم سلمان۔ شیخ ابراہیم اللقانی۔ شیخ سعد زغلول اور شیخ ابراہیم الہلباوی کو پڑھاتے تھے زیادہ تر منطق۔ فلسفہ تصوف اور علم ہیئت کا درس دیتے تھے درس میں دوانی کی الزوراء تصوف میں، قطب الدین کی شرح شمسیہ منطق میں اور ہدایہ۔ اشارات حکمۃ العین۔ حکمۃ الاشراق فلسفہ میں تذکرہ الطوسی علم ہیئت میں اور ایک کتاب جدید علم ہیئت وغیرہ میں۔ اخلاق تہذیب یہ فلسفہ کی کتابیں تھیں۔

جو عصور وسطی کے فلاسفروں کے افکار کی ترجمان تھیں وہ منطق کو فلسفہ کا مقدمہ یا مدخل اور اس کے اقسام میں الٰہیات، طبعیات، فلکیات اور طب وغیرہ شمار کرتے تھے۔

میری رائے میں ان کتب کی ذاتی قیمت نہ تھی مثلاً شیخ حسن الطویل ان کتابوں کا درس ازھر میں دیتے تھے لیکن ان سے کچھ اثر نہ ہوتا، ان کی اہمیت اس وجہ سے تھی کہ استاد ان کی فصل ہاتھ کے جملے لے کر اپنے افکار کی شرح کرتا اور زندگی کے حقیقی واقعات پر منطبق کرنے کی کوشش کرتا اور اس عالم کو ایک وحدت سمجھتا ان افکار میں تصوف وغیرہ کی آمیزش ہوتی اسی سے شیخ محمد عبدہ کو طمانیت قلب نصیب ہوئی تھی وہ سالہا سال سے ازھر میں پڑھتے چلے آ رہے تھے اور قدیم علوم سے اکتا گئے تھے وہ جدید علوم کی تلاش میں علوم عقلیہ کی طرف رغبت رکھتے تھے۔ شیخ حسن الطویل ازہر میں منطق کے مانے ہوئے استاد تھے، مفتی محمد عبدہ انکی خدمت میں حاضر ہوئے تو کچھ مطمئن نہ ہوئے بلکہ غیر موجود علم کی تلاش میں رہے۔ شیخ حسن الطویل نے فلسفہ بھی پڑھا تھا لیکن جزم سے کوئی بات کہہ نہ سکتے تھے ان کے درس میں احتمال آفرینی تھی جب سید جمال الدین تشریف لائے تو محمد عبدہ کو گوہر مقصود ہاتھ آ گیا۔

سید جمال الدین تو ان کتابوں کی اہمیت سے آگاہ تھے دنیا ہر ایک کو زنگار رنگ کی نظر آتی ہے۔ کائنات ہر آنکھ کے سامنے کھلی ہوئی ہوتی ہے لیکن بہت کم لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محمد عبدہ کو سید جمال الدین کے پاس کونسی نئی چیز ملی اور انکو دلی اطمینان کیسے نصیب ہوا۔ سید جمال الدین چند اصول کلیہ بتلاتے تھے جن پر فلسفہ کی عمارت کھڑی ہے۔ کتابیں پڑھاتے تو ان اصول کی طرف رجوع کرتے گویا اصول ان کے نزدیک معیار حق و باطل تھے۔ اس کے علاوہ ان کی مضبوط شخصیت تھی جو کامل یقین کے ساتھ حکم لگاتی تھی وہ شیخ حسن الطویل کی طرح متردد نہ تھے وہ حیات عملی کی جزئیات کو ایک رشتہ سے باندھتے تھے جن سے یہ تمام جزئیات ایک وحدت کی صورت اختیار کر لیتی تھیں۔ تصوف۔ فلسفہ۔ دنیائے علم اور دنیائے خارجہ علیحدہ علیحدہ چیزیں نہ تھیں، بلکہ ایک ساز کی مختلف آوازیں تھیں جب یہ تمام ہوتیں تو انسان کی نظر صحیح ہو جاتی اور تکلیف وہ شک و حیرت سے خلاصی پاتا وہ نفع و ضرر پر حکم لگا سکتا اور صحیح راستہ اختیار کر لیتا۔ جملوں کی صحت اور عدم صحت۔ مولف کی خطا اور صواب۔ کتابی اور عملی منطق کا فرق۔ تصوف کے نظریہ کا حکماء کے نظریے سے تباین۔ زہد کی باتیں یہ سب مقتدیوں کی باتیں تھیں جو گہرائی۔ جوہر اور حقیقت کو چھوڑ کر سطح عرض اور شکل کی طرف لپکتے ہیں ان کی ایک اور خصوصیت تھی وہ اپنے شاگردوں کا ہاتھ پکڑ کر انکو کتاب کے مطالب سننے

اونچا کرنے کی کوشش کرتے اس سے شاگرد الفاظ اور جملوں کی قید سے نکل کر حقیقت ذات کی معرفت تک پہنچ جاتے۔

سید جمال الدین کا طریقہ درس شیخ محمد عبدہ سے بالکل برعکس تھا وہ کتاب سے ایک موضوع لیکر اس کو شرح و بسط سے بیان کرتے اس سے موضوع کے تمام اطراف سمٹ آتے اس کے بعد وہ کتاب پڑھتے تو وہ صاف سمجھ میں آجاتی خطا اور صواب بہ ملا نظر آتا لیکن شیخ محمد عبدہ پہلے کتاب کی عبارت پڑھکر خوب سمجھتے اور اچھی طرح سمجھاتے پھر اس پہ حاشیہ آرائی کرتے۔

ان کے گھر میں مدرسۂ نظامیہ کی یہ صورت تھی اس مدرسہ میں محمود سامی البارودی۔ عبدالسلام مویلحی۔ ان کے بھائی ابراہیم المویلحی اور جوانوں میں سے محمد عبدہ۔ ابراہیم اللقانی سعد زغلول۔ علی مظہر۔ سلیم نقاش اور ادیب اسحٰق وغیرہم نے بھی تعلیم حاصل کی تھی۔

اس مدرسہ میں سید صاحب نے ادب کی تعلیم کی تجدید کی (لٹریچر) ادب قدامت پرستوں کا تابع زبان تھا بادشاہوں اور امیروں کی مدح سرائی ان کے ظالمانہ افعال اور صفات کی مدح طرازی ادب کا وظیفہ تھا زمانہ کا حاکم عجب روزگار معصوم عن الخطاء سمجھا جاتا۔ حاکم اگر لوٹ کھسوٹ کرتا تو کوئی بھی اس کو ملامت نہ کرتا۔ اس کی کرم نوازی کی تعریف کی جاتی قتل کر دیتا تو بھی کوئی پوچھنے والا نہ تھا معاف کر دیتا تو اس کے رحم و کرم کے گن گائے جاتے۔ فن ادب شعر و نثر اس کے لئے سامان طرب بلکہ اس کا نغم غلط کرنے والے تھے ان سے دشمنوں کو زیر و زبر کرنے اور اس کے دوستوں کی تعریف کرنے کا کام لیا جاتا۔ ادیب صغیر چھوٹے دولتمندوں کی مدح سرائی کرتا جمال الدین آئے تو انہوں نے ادب سے قوم کی خدمت کا کام لیا ادب و فن کے ذریعہ سے عوام کے حقوق حاصل کئے اور ان سے ظلم ظلم رو کا لوگوں پر عوام کی نکبت اور ابتری روشن کی ان کو ان کے فقر و فاقہ کا سبب بتایا ان کو اندھیرے سے باہر روشنی میں نکلنے کے لئے آمادہ کیا و لوں سے حاکموں کی ہیبت دور کی ان کو سمجھایا کہ وہ تو حاکم کی اصلی قوت ہیں حاکم کا کام محکوم کے بغیر چل نہیں سکتا لہذا ان کو غصب شدہ حقوق اور سعادت کی بازیابی کیلئے کوشش کرنی چاہیئے۔ سید صاحب نے لوگوں کے سامنے نیا ادب پیش کیا جس کے سامنے عوام زیادہ تھے حکومت کم تھی حریت کے ترانے سنائے۔ غلامی کا جوا اتار پھینکا عوام کے حقوق اور حاکم کے واجبات گنائے۔

انہوں نے ادیبوں کا مرتبہ امراء سے بھی بلند کر دیا اب وہ دولتمندوں کے سامنے دست سوال دراز نہ کرتے تھے مسلمانوں کے لئے یہ نعمت غیر مترقبہ تھی اس کو وہ عہد استبداد سے بھلا بیٹھے تھے سید جمال الدین کے آنے سے قبل مصر کی جو حالت تھی اسکا شیخ محمد عبدہ نے ان الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے۔

"۱۲۹۳ھ سے قبل مصر کے رہنے والے حاکم اعلیٰ کو اپنے کاروبار اور معاملات کا مالک سمجھتے تھے ان کا اعتقاد تھا کہ ان کی خوش نصیبی و بد بختی اس کے عدل و انصاف کے رحم و کرم پر ہے یا ان کی خیانت اور ظلم سے وابستہ ہے۔ اپنے شہر کے معاملات کے انتظام و انصرام میں کسی کو رائے زنی کا حوصلہ نہ تھا۔ رفاہ عامہ کا کام کرنے کا کسی کو یارا نہ تھا عوام اور حکومت میں کوئی رابطہ نہ تھا سوائے ٹیکسوں اور مالیہ کی وصولی کے۔ ان کو دوسری قوموں کا کچھ پتہ نہ تھا۔ محمد علی کبیر کے زمانہ سے بہت سے لوگ بغرض حصول تعلیم یورپ جانے لگے تھے اس کے علاوہ یہ لوگ بلاد اسلامیہ کا بھی سفر کرتے تھے لیکن اس سیر و سیاحت سے ان کو کچھ بھی فائدہ حاصل نہ ہوا۔ اسمٰعیل پاشا نے ۱۲۸۳ھ میں ایک مجلس شوریٰ قائم کی تھی اسکا فرض تھا کہ وہ لوگوں کو بتلاتا کہ ملکی اصلاح و بہبود میں ان کا بھی حصہ ہوتا ہے اور ان کی رائے قابل لحاظ ہوتی ہے لیکن کسی رکن کو بھی ایسا خیال نہ آیا کیونکہ مجلس بنانے والے نے اسکو قاعدہ اور قانون کی زنجیروں سے جکڑ دیا تھا۔ اگر کوئی کسی سے ذکر کر دیتا کہ حاکم کے بتلائے ہوئے طور طریقوں کے علاوہ ملکی سود و بہبود کے دوسرے بھی ذرائع ہیں تو اس کو جلا وطنی۔ قتل یا ضبطی مال و دولت کی سزا دی جاتی ان حالات میں ادب بھی اسی موقف کا سایہ تھا اور اس منظر کی سچی تصویر بھی۔ اس وقت مصر کے ممتاز ادیب السید علی ابی النصر۔ شیخ علی اللیثی اور عبداللہ شاہ فکری تھے لیکن ان کی فکری سرمایہ کیا تھا علاوہ صرف معشوق کی غزل سرائی کسی دوست کی خدمت میں پیغام شوق۔ کسی امیر کی مدح سرائی اعتذار یا استعطاف سفینہ کا بیان۔ ہدیہ پر شکریہ رہ گیا تھا مصری قوم کی حالت اس کی نکبت حکام کا ظلم عوام کے حقوق اور حکومت کے فرائض وغیرہ ان کے دائرہ فکر سے خارج تھے۔"

سید جمال الدین نے اس انداز بیان کو بدل ڈالا لوگوں کے سامنے نئے آفاق کھولے اور اس نئے مختلف تدبیریں اختیار کیں۔

بوڑھوں اور جوانوں کو لیکر ایک جماعت کی تشکیل کی ان کو انشاپردازی کی رغبت دلائی اور ایک لائحہ عمل ان کے سامنے رکھا ان کو جدید معانی سے روشناس کرایا جنکو وہ لکھنے میں کام لاتے تھے ان کو ایک اخبار نکالنے پر آمادہ کیا جس میں لکھنے کی مقدرت پاتے اس سے مضامین لکھواتے مثال کے طور پر انہوں نے شیخ ادیب اسحاق کی جریدہ مصر نکالنے پر حوصلہ افزائی کی۔ اس کے لئے خود پروگرام مرتب کیا۔

مظہر بن وضاح کے فرضی نام سے خود بھی لکھتے تھے۔ جب ان کو سکندریہ جانے کو کہا گیا تو وہاں ایک

روزنامہ تجارت کے نام سے جاری کیا تھا۔ دونوں اخباروں میں وہ شیخ محمد عبدہ اور دوسروں سے لکھواتے تھے۔ سید صاحب نے دو مقالات خود بھی لکھے تھے ایک کا نام مشرقی حکومتیں اور ان کی قسمیں تھی دوسرے کا نام انگلستان اور افغانستان کے معاملات کا انکشاف تھا۔ ان کی آواز دور دور تک پہنچی۔ دونوں اخبار خوب چلے ان کے جدید خیالات لوگوں کو بھاتے تھے پھر ریاض پاشا نے ان کو بند کر دیا۔ بہت سے لوگوں کو وقائع مصریہ میں لکھنے پر آمادہ کیا۔ ایک طبقہ جو لکھ سکتا تھا ان کی تربیت کے لئے بہت سے موضوع خود مقرر کر دیئے تھے ادیب اسحاق یورپ اور مشرق کے عنوان پر لکھتے "مشرق کی قسمت میں تھا کہ بام عروج پر پہنچنے کے بعد ذلت کی گہرائی میں جا پڑے اور اغیار کے لالچ اور غرض و مقصود کا نشانہ بن جائے۔ اجنبیوں نے ہر طرف سے فساد مچا رکھا ہے۔"

شیخ محمد عبدہ لکھتے "حاکم بھی ایک قسم کا انسان ہوتا ہے جس سے خطا کاری کا امکان ہو سکتا ہے ان پر ان کی خواہشات قابو پا سکتی ہیں اس کو خطا کاری اور عیش پرستی سے قوم کی خیر خواہی جو قول و فعل دونوں سے کی جائے۔ روک سکتی ہے" اس طرح مشرق میں مشرقی صحافت کی اور اخبار نویسیوں کی تخم ریزی ہوئی جنہوں نے قوم اور وطن کا موضوع اختیار کر رکھا تھا۔

سچی بات یہ ہے کہ اُس زمانہ کے ظروف و احوال سے بھی ان کو بڑی مدد ملی جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے عوام ریاست در ریاست سے تنگ آ چکے تھے۔ اسمٰعیل خود بیرونی عنصر کو دخل اندازی کی دعوت دے رہا تھا اسکو "الوقائع المصریۃ" مصر اور تجارت کے مقالات بھاتے تھے لیکن وہ الوالنظارہ کو ناپسند کرتا تھا۔ جمال الدین کی شخصیت جلتی پر آگ کا کام دے سکتی تھی اگر یہ حالات نہ ہوتے تو ان کی دعوت مصر میں بھی ناکام رہ جاتی جس طرح ایران اور آستانہ میں ہو چکی تھی۔

سید جمال الدین عوامی مدرسہ میں ایک دوسرے مسلک کو اختیار کئے ہوئے تھے وہ قہوہ خانوں، محفلوں، گھروں میں اصلاح ہی کی باتیں کرتے۔ سید صاحب بہت کم کھاتے اور کم سوتے تھے۔ زیادہ بیدار رہتے۔ بات چیت کے زیادہ شائق تھے اس میں معانی اور زبان دونوں ان کی مدد کرتے ہر بات میں نئی بات پیدا کرے۔ سگریٹ سلگاتے یا کوئی منظر دیکھتے۔ چاہے کسی بچہ کا سوال ہوتا یا طلاق کا واقعہ ہوتا اس قسم کی معمولی باتوں سے گرم محفل کا کام لیتے۔ اس زمانہ میں مصر میں خافات کی کمی نہ تھی وہ کسی افواہ پر رائے زنی کرتے تو سامع شوق سے ان کی باتیں سنتا جس سے سننے والا سمجھتا کہ جو راحت عمل میں ہے وہ سکون میں نہیں ہاں کا جسم اور قلب متحد العمل تھے ان سے ایک ہی ساز سنائی دیتا۔

بات چیت میں ان کا خاص طریقہ تھا جو اُن کا ولپسند بھی تھا وہ سمجھدار اور ناسمجھ ، مستعد اور غیر مستعد سب سے باتیں کرتے ان کی مثال ایسی بارش کی تھی جس سے صالح زمین کو فائدہ اور غیر صالح کو نقصان پہنچتا ہے لیکن اس میں بادل کا کیا قصور ہوتا ہے اس بارے میں شیخ محمد عبدہ لکھتے ہیں ۔" سید جمال الدین حکمت کی باتیں خواہش مند اور غیر خواہشمند دونوں سے کرتے ان کا خاصہ تھا کہ وہ اپنے مخاطب پر خاطر خواہ اثر ڈال دیتے تھے اور اپنی طرف متوجہ کر لیتے تھے اگرچہ وہ اسکا اہل نہ ہوتا ۔ اس بارہ میں مجھے ان پر رشک آتا ہے مجھے تو مجلس کی حالت اور وقت کا انتظار رہتا ہے میں تو موقعہ محل اور استعداد کو دیکھ کر زبان کھولتا ہوں ۔

یہی راز ہے مصر کے عجیب مدرسۂ فکر کا جس کا خاصہ شیریں کلامی اور سامع کے دل و دماغ پر قبضہ کرنا ہے اس باب میں محمد عبدہٗ ۔ سعد زغلول ۔ علباوی اور لطفی السیدان کے تلامذہ ہیں ۔

سلیم بک العنجوری کہتے ہیں کہ سید جمال الدین کی عادت تھی کہ سارا دن اپنے گھر میں رہتے جب شام ہوتی تو عصا تھامے ازبکیہ کے قریب قہوہ خانہ میں چلے جاتے ان کے گرد لوگ آدھے دائرے کی شکل میں جا بیٹھتے اور وہ صدر میں ہوتے اس حلقہ میں لغوی ۔ شاعر ۔ منطقی ۔ طبیب ۔ کیمیا دان ۔ مؤرخ ۔ جغرافیہ دان ۔ مہندس اور ماہر طبیعیات سبھی ہوتے ایک سے ایک آگے بڑھ کر مشکل سوالات کرتا اور اپنے دلائل پیش کرتا سید صاحب فرداً فرداً سب کے سوالات کے جوابات ایسی صاف اور فصیح زبان میں دیتے جس میں کسی قسم کا اشکال یا تردد نہ ہوتا ان کی تقریر سیلاب کی طرح تھی جو ان کی طبیعت سے امڈتا تھا جسکو تکان محسوس نہ ہوتی تھی اس سے سامعین مدہوش ۔ سائلین چپ اور معترضین خاموش ہو جاتے جب رات کا بڑا حصہ گذر جاتا تو گھر کی راہ لیتے اس مجلس کا سارا خرچ اپنی جیب سے ادا کرتے ۔"

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں ۱۸۷۸ء کے وسط میں ان کے مرکز کو خطرہ پیدا ہوا کیونکہ وہ سیاست میں بھی حصہ لینے لگے تھے ۔ عوام سے انکے قریبی تعلقات استوار ہو چکے تھے اثنائے کلام میں انہیں مخاطب کر کے کہتے " اے مصری لوگو تم نے استبداد میں پرورش پائی ہے صدیوں سے تم فاتحوں اور کشور کشاؤں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتے چلے آئے ہو ۔ پے درپے حکومتوں نے ظلم و ناانصافی اور ذلت و مسکنت سے تمہیں پامال کر رکھا ہے اور تم راضی برضا ہو کر یہ سب کچھ برداشت کر رہے ہو ۔"

ظالم حکام نے ڈنڈے اور کوڑے کے زور سے تمہاری زندگی کا خون نچوڑ لیا ہے اور تم اف تک نہیں کرتے ۔ اگر تمہاری رگوں میں خون رہتا جس میں حیاتین ہوتی اور تمہارے دماغ میں متاثر ہونے والے اعصاب ہوتے جو نخوت سے

اور حمیت کو جوش میں لاتے تو تم اس ذلت اور مسکنت کو پسند نہ کرتے تم پر یونانی ۔ رومن ۔ ایرانی ۔ عرب اور کرد حکومت کرتے آئے ہیں اور سب تمہاری کھال ادھیڑتے رہے ہیں لیکن تم جنگل کے پتھر کی طرح بے حس و حرکت پڑے رہے ہو تم اہرام مصر ۔ ہیاکل منفیس ۔ آثار طیبہ اور مشاہد سیوہ اور دمیاط کے قلعوں کی طرف دیکھو وہ تمہارے آباؤ اجداد کی عظمت و اقبال کے شاہد ناطق ہیں ۔

غفلت کی نیند سے جاگ اٹھو باقی قوموں کی طرح آزاد اور سعادت مند بن کر رہو" اس وقت سے بغاوت کی آگ بھڑکنے لگی ۔

اب شیخ نے حجرہ کے درس کو چھوڑ کر قوم کو مخاطب کرنا شروع کر دیا تھا ان کے مخاطب خاص و عام راہ چلتے ہوئے مسافر اور ایوان وزارت کے کرسی نشین سبھی تھے ۔

ان کے پروگرام میں فرقہ ماسونی[1] کی محفل میں شریک ہونا بھی داخل تھا اس میں بڑے بڑے لوگ تھے ۔ آپ نے سوچا کہ شائد ان لوگوں تک ان کے افکار کی رسائی ہو سکے لیکن یہاں جاتے ہی وہ سخت ہیجان میں آ گئے اور متواتر تقریروں سے ان کا نقد و احتساب کرنے لگے محفل کے ارکان سیاسی باتوں پر کان نہ دھرنا چاہتے تھے آپ نے فرمایا کہ آزادی پسندوں کے کلب کے عنوان ۔ حریت ۔ مساوات اور اخوت نے مجھے کام کرنے کا شوق دلایا ہے اس کی غرض انسان کی نفع رسانی اور عدل و انصاف کے نشانات راہ کی تعمیر ہے میں مصر میں عجیب و غریب باتیں سننے کے انتظار میں تھا لیکن یہ میرے وہم و خیال میں بھی نہ تھا کہ بزدلی اس کلب میں راہ پالے گی

اگر فری میسن (آزاد خیال) ملکی سیاست میں دخیل نہ ہوں گے اور اپنے آلات سے قدیم عمارت کو ڈھا کر صحیح حریت ۔ اخوت اور مساوات کے نشانات نہ کھڑے کریں گے ظلم و جور کے محل کو منہدم نہ کر دیں گے ان کے ہاتھ ہتھوڑا نہ پکڑیں گے تو ان کے افکار کی عمارت کے لئے زاویہ قائمہ کہاں سے بنے گا ۔

اس طرح انہوں نے سیاست میں عدم دخل ۔ اراکین کی اقتدار کے لئے رسہ کشی اور عوام پر ظلم و ستم سے اغماض کی وجہ سے ان لوگوں کی خوب خبر لی ۔ آخر کار آپ اس مجلس سے دستکش ہو گئے اور ایک دوسری مجلس کی تشکیل کی جس کے ممبروں کی تعداد جلد ہی تین سو تک پہنچ گئی جن میں مصری مفکر اور جوان بھی شامل تھے ۔ اس مجلس میں کامل آزادی تھی مختلف اعمال کے لئے مختلف شعبے تھے ایک قانون کا تھا دوسرا مالیات کا تیسرا

---

[1] Free mason.

اشتغال کا اور چوتھا جہاد کا ہر وزارت اور اس کے امور کیلئے الگ شعبہ تھا جس میں تمام معاملات کو دیکھا اور پرکھا جاتا تھا ظلم اور ناانصافی کی نشاندہی اور اس کی اصلاح کی تدابیر سوچی جاتی تھیں اور ان کو وزیر متعلقہ کی خدمت میں دور اندیشی اور صراحت سے پیش کیا جاتا تھا اس سے محافل اور مجتمعات میں چرچا رہتا۔

(خاطرات جمال الدین از محمد باشا المخزومی)

اس طرح ان کے حلقہ اثر و اعمال کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ پہلے تو وہ اپنے حجرہ میں درس دیتے تھے پھر قہوہ خانہ میں سننے والوں کی عقلوں کو قابو میں لانے لگے۔ اس کے بعد وزارت اور حکومت کے مصالح پر اثر انداز ہونے لگے گھر میں تو فلسفہ اور حکمت کی کتابوں کا درس دیتے تھے اور محفل اور جلسہ میں قوم کی حالت اجتماعی پر تبصرہ کرتے اس کے حقوق و فرائض کی تشریح کرتے کرتے بالآخر سیاست سے گہری دلچسپی لینے لگے۔

ان کی یہ طبعی خصوصیت اس وقت ظاہر ہوئی تھی جب وہ عہد جوانی میں اپنے ملک کی امارت کا فیصلہ کرنے کیلئے کسی ایک امیر کا ساتھ دے رہے تھے ان کی عادت تھی کہ جب تک تمام امور کو اپنے ہاتھوں میں نہ لے لیتے انہیں چین نہ آتا۔ اس سے اضطراب تو ضرور پھیلتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن انہیں قطعاً پرواہ نہ تھی۔ آخر سید جمال الدین مصر میں کیا چاہتے تھے ؟

درس نظامی سے ان کی غرض طلبہ میں وسعت نظر پیدا کرنا اور جدید آفاق کا کھولنا تھا تاکہ ان میں اس عالم کے سمجھنے اور بحث و نظر میں آزادی کی طاقت پیدا ہو جائے اور ایسے لوگ پیدا ہوں جو بحث و تنقید کر سکیں اور حکم لگا سکیں چاہے اس سے نص کی مخالفت ہوتی ہو۔ یا معروف مالوف پر زد پڑتی ہے یا اسکی تائید ہوتی ہو۔

درس عام سے ان کا منتہائے مقصود قوم کو حکمرانوں کی غلامی سے آزاد کرانا تھا حاکم اور محکوم کو ایک دوسرے کا موقف سمجھانا تھا تاکہ وہ اپنے فرائض اور واجبات سے آگاہ ہوں۔ جب حاکم اپنے حدود سے تجاوز کرے تو رعایا زور سے "نہیں نہیں" کہہ اٹھے۔ اس سے ان کی غرض رائے عامہ کی تکوین تھی جو مضبوط مجاہد اور وسیع النظر ہو اپنے داخلی اور خارجی امور کو سمجھتی ہو جب اہم معاملات در پیش ہوں تو یک رائے ہو کر اپنا فیصلہ حکمرانوں کی خدمت میں پیش کرے جس سے اُسکو مجال سرتابی نہ ہو سکے حاکم یہ سمجھ لے کہ اسے اپنی تنخواہ پر گذر بسر کرنی ہوگی ٹیکس بقدر مصالح عامہ لگنے چاہیئے نہ کہ اس کی اپنی خواہشات کے مطابق قوم کا حق ہے کہ وہ اخراجات اور آمدنی پر نظر رکھے۔

سیاست سے ان کا مطلب تھا کہ قوم کو حکمرانی میں شرکت پر قائل کیا جائے جب اس کے اندر سوجھ بوجھ پیدا ہو گی تو وہ از خود نمائندہ مجلس کے قیام کا مطالبہ کرے گی اور حاکم کو قوم کے فہم وادراک کے مطابق اس کے حقوق بحال کر دینے ہونگے یہ کوئی غیبی عطیہ نہ ہو گا جب اس مطالبہ کے پیچھے کوشش اور جدوجہد ہو گی تو قوم جان سے زیادہ اس کی حفاظت کرے گی اور وہ قائم و دائم رہے گی اور نہ کوئی طاقت اس کو نظر انداز یا باطل کر سکے گی۔

خدیو توفیق پاشا نے انہیں قصر عابدین میں بلایا اور کہا میں مصریوں کی فلاح کا تہہ دل سے متمنی ہوں میں قوم اور ملک کو ترقی کے اعلیٰ مدارج پر دیکھنا چاہتا ہوں لیکن مقام افسوس ہے کہ ملک کی اکثریت جاہل ہے انکو اسطرح ہیجان انگیز تعلیم دینا جس طرح تم دیتے ہو بے فائدہ ہے اس سے قوم اور ملک پر تباہی آئے گی۔

سید صاحب نے جواب دیا کہ اگر آپ مجھے آزادی اور خلوص سے ... کہنے .. کی اجازت دیں تو گذارش کروں گا کہ اگر مصری قوم میں جاہل اور غیر معروف ہیں تو اس میں عالم اور عاقل بھی پائے جاتے ہیں جس نظر سے آپ ان کو دیکھتے ہیں اسی نظر سے وہ آپ کو دیکھتے ہیں اگر آپ میری خیر خواہانہ نصیحت قبول فرمائیں طریق شوریٰ سے قوم کو حکومت میں شریک کریں نمائندوں کے انتخاب کا حکم صادر فرمائیں جو قانون سازی کا کام کریں اور آپ کے نام مرضی سے ان قوانین کا نفاذ کریں تو آپ کا تاج و تخت ہمیشہ کے لئے قائم رہے گا۔" یہ کہہ کر آپ باہر نکل آئے اور اپنے شاگردوں اور ہمدردوں کو جوش و قوت سے لکھنے پر ابھارتے رہے جب آپ مصر میں پہلے پہل آئے تو ان کی رائے تھی کہ جب تلک مصریوں میں بیداری اور شجاعت پیدا نہ ہو گی مجلس شوریٰ کا کچھ فائدہ نہ ہو گا لیکن جب انہوں نے حکام کا استبداد دیکھا اور آٹھ سالوں میں قوم کی پختہ کاری معلوم کر لی تو پہلی رائے سے دستبردار ہو گئے۔

اسماعیل پاشا کے آخری دنوں میں امیر توفیق ان کی عزت کرتے تھے اور ان کے افکار کے مؤید تھے۔ سید جمال الدین امیر توفیق سے محفل ماسونی میں ملا کرتے تھے ان کا اندازہ تھا کہ یہ اگر اسماعیل کے بعد امیر بنیں تو قوم کا بھلا ہو گا لیکن جب زمام کار اس کے ہاتھ آئی تو اس نے سید صاحب کے پیچھے جاسوس لگا دیئے۔ مجلس وزراء منعقد ہوئی تو اس نے سید جمال الدین کے جلاوطنی کے احکام صادر کر دیئے الزام یہ لگایا گیا کہ وہ سر پھروں کی جماعت کے سردار ہیں جو دین اور دنیا میں فساد ڈالنے کے لئے جمع ہوتے ہیں اس سے سقراط کا واقعہ تازہ ہو گیا اس کے بعد بتاریخ ۶ رمضان ۱۲۹۶ھ کو اپنے ملازم ابن الفیلسوف ابو تراب سمیت گرفتار کر لئے گئے اور ۲۴ اگست ۱۸۷۱ء کو ایک جہاز میں سوار کر کے بمبئی روانہ کر دیئے گئے۔ ان کو مصر دوبارہ آنا نصیب نہ ہو سکا لیکن ان کے افکار و مباحثات کی اشاعت ہوتی رہی۔

(٣)

جلاوطنی کے یہ ایام سید جمال الدین نے حیدر آباد میں گذارے انگریز تو کوئی کام کرنے کی اجازت بھی نہ پڑھنے پڑھانے اور سوالات کے جوابات دینے کی اس اثنا میں انہوں نے اپنی مشہور کتاب الرّدّ علی الدھریین لکھی جس میں ان کے مفاسد کا بیان تھا اور ثابت کیا گیا تھا کہ تمدن کی بنیاد مذہب پر ہے اور کفر سے آبادی کا بگاڑ لازم آتا ہے۔ یہ کتاب سید صاحب نے فارسی میں لکھی تھی اس کا اردو میں بھی ترجمہ ہوا ہے مفتی محمد عبدہ نے عارف ابوتراب کی مدد سے اس کا ترجمہ فارسی سے عربی میں کیا اس رسالہ میں ڈارون اور اس کے نظریہ ارتقاء کا رد کیا ہے۔

کتاب پڑھنے والا جب اس قسم کے مباحث دیکھتا ہے تو حیرت میں پڑ جاتا ہے کیونکہ ایسے مضامین میں بحث و مناقشہ کیلئے علوم طبعی از قسم جیالوجی اور بیالوجی وغیرہ میں مہارت تامہ کی ضرورت ہے جیسا کہ ڈارون ماہر تھا۔

سید صاحب کی یہ دلیل کہ ڈارون کے نظریہ نے الحاد کی تخم ریزی کی ہے مضبوط ہے اگرچہ ڈارون بذاتہ ملحد نہ تھا اس کے زمانہ میں مادی نظریہ نے عروج پایا تھا کہ اس جہان کی اساس واحد صرف مادہ ہے اس کے سوا کسی اور چیز کا وجود نہیں اور زندگی میں ہر چیز حتیٰ کہ فکر اور جذبہ کا بھی اسی کے مظاہر میں شمار ہے۔ مادہ کی نہ تجدید ہوتی ہے وہ فنا ہوتا ہے۔ اس کے قوانین ابدی اور ناقابل تغیر ہیں۔ یہ قدیم۔ ازلی اور ابدی ہے۔ اس عالم کو کوئی چیز بھی فنا پذیر نہیں ہے بلکہ اس کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ نہ نفس ہے نہ روح اور دین ہے نہ خدا ہے۔

یہ مذہب قدیم سے بدھوں۔ قدیم مصریوں اور یونانی فلاسفروں کا رہا ہے۔ موجودہ زمانے میں انقلاب فرانس کی صورت میں اس کا ظہور ہوا۔ انگلستان۔ فرانس اور جرمنی میں بہت سے حکماء نے اس کی دعوت دی عرب قدیم سے اس سے آگاہ تھے اور اس کے پیروؤں کو دہری کے لقب سے پکارا کرتے تھے مؤرخین مذاہب میں جاحظ اور شہرستانی وغیرہ نے اس مذہب کا حال لکھا ہے۔

مشرق میں مغربی آراء پہنچیں تو ان کے ساتھ نشو و ارتقاء کا مادی نظریہ بھی پہنچا۔ مصر میں شبلی شمیل نے ۱۸۸۴ء میں ایک کتاب کا ترجمہ شائع کیا جس سے ہلچل مچ گئی۔ ہندوستان میں نیچری فرقہ کا ظہور ہوا جو اس قسم کی آراء کا معتقد ہے اور اپنے آپ کو نیچر (فطرت) سے نسبت دیتا ہے یہ کلمہ بہت سے لوگوں کے سننے میں آیا تھا۔ سید جمال الدین افغانی نے بھی حیدر آباد کے زمانہ میں یہ کلمہ سنا۔ استاد محمد واصل مدرسہ اعزہ حیدر آباد میں فنون ریاضی کے مدرس تھے انہوں نے ایک رسالہ میں لکھا۔ ہمیں نیچر کی آواز ہندوستان کے تمام اطراف سے سنائی دیتی ہے اس مذہب کے لوگوں (نیچریوں) سے کوئی بھی شہر خالی نہیں۔ نیچریت کی حقیقت کیا ہے ان کا مذہب

کیا ہے۔ کون سے وقت میں انکا ظہور ہوا ہے؟" یہ سوالات اس رسالہ کی تالیف کا باعث بنے تھے۔

ڈاروِن کا جسطرح رد کیا ہے میں اس کا ذکر نہیں کرتا ہوں دین کے اثبات کی اہمیت۔ انسان کے لئے اسکی ضرورت اس کی ترقی میں اسکا اثر۔ الحاد کا اثر دین کے انحطاط میں۔ یہ مباحث ہیں جنکو سید جمال الدین نے اوج کمال پر پہنچایا ہے اس موضوع پر ان کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ علی العموم مذہب نے بندہ کو تین عقائد دیئے ہیں اور نفوس میں تین خصلتیں ودیعت کی ہیں جن میں ہر خصلت قوم کے وجود کے لئے بمنزلہ رکن کا حکم رکھتی ہے اور ہیئت اجتماعی کی عمارت کا ستون ہے۔

اوّل عقیدہ تصدیق کا ہے کہ انسان زمین کا مالک اور اشرف المخلوقات ہے دوسرا عقیدہ یہ ہے کہ ۔۔۔ وہ ۔۔۔ اشرف الامم ہے اس کا مخالف گمراہ اور جھوٹا ہے تیسرا اس پر یقین رکھنا کہ انسان اس دنیا میں تحصیل کمال کے لئے آیا ہے جو اس دنیاوی عالم سے اونچے اور وسیع عالم میں پہنچنے کے لئے ممد و معاون ثابت ہوگا اس غم واندوہ کے گھر کو چھوڑ کر اسے دوسرے جہان میں جانا ہے جہاں رنج والم کا گذر نہ ہوگا اس کی سعادتیں غیر فانی ہوں گی اس کی مدت ابد تک کے لئے ہوگی۔ اور تین خصلتیں ہیں اور وہ ہیں حیا۔ امانت اور صدق۔

انہوں نے باوضاحت بیان کیا کہ یہ بنیادی چیزیں ہیں جن کو لے کر تمام دین آئے تھے اور یہ ملک کی آبادی وکامرانی کی علت ہیں۔ انسانی سعادت ان پر منحصر ہے مادہ پرستوں دہریوں اور نیچریوں کی تعلیمات ان بنیادی عقائد کا انکار کرکے انکو حیوان کا درجہ عطا کرتی ہیں اس میں نیکی کا جذبہ مٹا دیتی ہیں اور ایک ایسی زندگی کیلئے تیار کرتی ہیں جو تنگ۔ غلیظ اور سخت ہے اور جس میں روحانی اقدار اور ترقی کے لئے کوئی گنجائش نہیں یہ تعلیمات سراسر اس کی پیدائش کے خلاف اور شخصیت کے منافی اور حرماں نصیبی کا موجب ہیں۔

اسلام میں وہ خوبیاں ہیں جو کسی دوسرے مذہب میں نہیں ہیں۔ توحید سے ذہن کی صفائی اور تمام اوہام سے پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔ سب سے بڑا اصول یہ اعتقاد ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی دنیا کے کارخانے کو چلانے والا اور افعال کا خالق ہے اور کسی انسان یا جماد علوی یا سفلی کو کسی دوسرے کو نفع ونقصان اور عزت وذلت دینے پر کوئی قدرت نہیں ہے یا اس قسم کی دوسری خرافات جو عقل کو اندھا کرتی اور نور بصیرت کو چھپا دیتی ہیں۔ ۲۔ اسلام نے شرف کے تمام دروازے انسان پر کھول رکھے ہر ایک کے لئے ترقی کی گنجائش رکھی ہے اجناس اور اصناف کے فرق کو مٹا دیا ہے لوگوں کو کمال عقلی اور نفسی عطا کیا ہے لوگوں میں وجہ امتیاز علم اور فضیلت سے ہو سکتا ہے کسی دوسری چیز سے نہیں دوسرے مذاہب ان خوبیوں سے محروم ہیں ۳۔ اسلام

اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اپنے پیروکاروں کو ظن اور شبہات پر زجر و توبیخ کرتا ہے۔ غیر مدلل بات اس کو ناپسند ہے جب خطاب کرتا ہے تو عقل سے۔ حکم لگاتا ہے تو عقل سے اس کی نصوص شاہد ناطق ہیں کہ سعادت عقل اور بصیرت کا نتیجہ ہے غفلت اور عدم بصیرت سے بدبختی اور گمراہی آتی ہے۔

اسلام نے تمام قوم پر تعلیم کو فرض کیا ہے۔ علوم و معارف سے عقلوں کو روشن کرنے کے لئے کہا ہے۔ معلم کو تعلیم دینے اور مؤدب کو اچھی باتوں کے حکم دینے اور بری باتوں سے روکنے کے لئے کہا ہے۔

"تم میں سے ایک جماعت دین کی سمجھ پیدا کرے اور اپنی قوم میں واپس جا کر ان کو اعمال بد سے ڈرائے تاکہ وہ برائیوں سے رک جائیں"۔

ان چار ارکان پر اسلام کی عمارت قائم ہے ان سب کا تمدن کی تعمیر نظام کے قیام اور سعادت انسانی کی تعمیم میں بڑا ہاتھ ہے اور مسلمانوں کی ترقی و تنزل کا انحصار ان عناصر کے تمسک اور عدم تمسک پر ہے۔۔

یہ ہے سید جمال الدین کے زمانہ قیام حیدر آباد کا کارنامہ جب مصر میں عرابی پاشا نے بغاوت کی تو انگریزی حکومت نے انہیں حیدر آباد سے کلکتہ بھیج دیا۔ وہ مصر میں انگریزوں کے داخلہ تک کلکتہ میں نظر بند رہے اس کے بعد ان کو سوائے مشرقی ممالک کے ہر جگہ جانے کی اجازت تھی۔ مسٹر بلنٹ نے لکھا ہے کہ وہ امریکی شہری بننے کے لئے امریکہ بھی گئے تھے وہاں ایک ماہ قیام کیا لیکن ارادہ عمل میں نہ آسکا اس واقعہ کا سوائے بلنٹ کے دوسرے تذکرہ نویسوں نے ذکر نہیں کیا[ل] ۱۸۸۳ء میں ہم انہیں لندن میں دیکھتے ہیں وہاں تھوڑی دیر ٹھہرنے کے بعد پیرس چلے آئے اس سے قبل سید صاحب نے اپنے تلمیذ رشید شیخ محمد عبدہ کو بیروت میں ان سے ملنے کے لئے لکھا تو انہوں نے تعمیل ارشاد کی اب ان کا لائحہ عمل کیا تھا ان حوادث سے دو چار ہونے کے بعد۔۔ وہ کیا کرنا چاہتے تھے؟

وہ اور محمد عبدہ آپس میں صلاح و مشورہ کر رہے تھے کہ کونسا اصلاحی کام کریں

شیخ محمد عبدہ جدید نسل سے کہاں سے تھے وہ عرابی پاشا کی بغاوت کے زمانے میں لوگوں کی بے وفائی۔

[ل] میں تو مسٹر بلنٹ کی اس روایت کو بعید از قیاس سمجھتا ہوں سید صاحب نے جب ہندوستان چھوڑا تو پورٹ سعید پہنچ کر شیخ محمد عبدہ کو خط لکھا جو ابھی تک مخطوط کی شکل میں محفوظ ہے۔ اس میں لکھتے ہیں میں آجکل پورٹ سعید میں ہوں اور لندن کیلئے تیار ہوں سات ماہ سے میں اس دنیا کے معاملات سے بے خبر ہوں۔ عارف کا پتہ نہیں کہ کہاں ہوگا اس کو میری طرف سے اطلاع دیدیں

خود غرضی دیکھ چکے تھے اس بنا پر انہوں نے سید جمال الدین کو مشورہ دیا کہ وہ دونوں ایک دور مقام کی طرف نکل جائیں جہاں کوئی امیر اور سلطان ان کے کام میں رکاوٹ نہ ڈال سکے وہاں جاکر ایک مدرسہ قائم کریں جس میں ممالک اسلامیہ سے اپنے منتخب نوجوان داخل کئے جائیں جن سے نیک کام کرنے کی توقع ہو ان کو ایک خاص طرز کی تعلیم دے کر قیادت اور اصلاح کے لئے تیار کیا جائے دس سال کے عرصہ میں بہت سے شاگرد تیار ہو جائیں گے جو اپنا وطن چھوڑ کر اصلاح مقصود کی اشاعت کریں گے سید صاحب کو یہ رائے پسند نہ آئی اس میں ان کو ارادہ کی کمی - امن پسندی اور عصر حاضر سے ادھر مایوسی نظر آئی محمد عبدہ سے کہا تم میں عزم اور حوصلہ کی کمی ہے [1] آپ نے خود پروگرام بنایا۔ اسکے مطابق پیرس سے عربی اخبار نکالنے کا فیصلہ ہوا جسکی تمام اسلامی ممالک میں اشاعت ہوگی جو مسلمانوں کو ان کے واجبات اور حقوق سے روشناس کرائے گا اور انمیں حب الوطنی پیدا کرے گا۔

اسی مقصد کے پیش نظر "العروۃ الوثقی" کا اجراء ہوا اس میں افکار و معانی سید صاحب کے ہوتے تھے جن کو شیخ محمد عبدہ تحریر کے قالب میں ڈھال دیتے تھے میرزا محمد باقر بیرونی اخبارات سے مشرقی ممالک کے متعلق خبروں کا عربی میں ترجمہ کر دیتے تھے اس مجلہ کے پیچھے ایک خفیہ جماعت کام کر رہی تھی جو تمام اسلامی ممالک میں پھیلی ہوئی تھی جماعت کے ارکان گنے چنے، سمجھدار اور پر جوش دیندار ہوتے اس جماعت میں شامل ہونے کے لئے ان کو حلف اٹھانا اور عہد کرنا پڑتا تھا " کہ وہ اخوت اسلامیہ کے احیاء کے لئے امکان بھر کوشش کریں گے اس کو والدین کے برابر سمجھیں گے۔ دین کے مطابق قدم اٹھائیں گے اور کوئی ایسا اقدام نہ کریں گے جس سے مذہب کو جزئی یا کلی نقصان پہنچے اسلام کی تقویت کے لئے علمی اور امکانی وسائل تلاش کریں گے اور عالم اسلام سے امکان بھر معرفت پیدا کریں گے" اس جماعت کی شاخیں مختلف ممالک میں تھیں۔ شاخ میں مذاکرہ کے لئے اجتماع ہوتا اور ہر اجتماع کے بعد ممبر لکڑی کے چھوٹے سے صندوق میں خفیہ چندہ ڈال دیتے تاکہ ایک دوسرے کو پتہ نہ چل سکے کہ زیادہ دیا ہے یا کم اس چندہ سے اخبار اور اس کے منتظمین کا خرچ اٹھتا کیونکہ اخبار کے بہت سے پرچے مفت روانہ کئے جاتے تھے۔

آٹھ ماہ میں اٹھارہ پرچے نکلے تھے پہلا نمبر ۱۵ جولائی ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۳ مارچ ۱۸۸۴ء کو نکلا تھا اور آخری نمبر ۲۶ ذوالحجہ ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۷ اکتوبر ۱۸۸۴ء کو۔ اخبار کے اغراض و مقاصد کیا تھے ؟

---

[1] شاید مصر میں سید رشید رضا نے مدرسہ دعوت و ارشاد اسی خیال کے ماتحت قائم کیا تھا۔

پہلے پرچہ میں اغراض و مقاصد مختصر طور پر اس طرح بیان ہوئے ہیں :-

(۱) مشرقیوں کے ان واجبات کا بیان جن کی تفریط کی وجہ سے ضعف پیدا ہوا ہے تدارک مافات کے لئے طریقہ کی وضاحت۔ اس کے بعد ان اسباب اور علل کا بیان ہوگا جن کی وجہ سے حالات خراب ہوئے اور ان کو کوئی راستہ سجھائی نہ دیا اور اوہام کا ازالہ۔

۲۔ نفوس میں کامیابی کی امید کا عقیدہ پیدا کرنا اور ناامیدی دور کرنا۔

۳۔ انہیں ان کے آباؤ اجداد کے اصول کی پابندی کی دعوت دینا جن پر اجنبی حکومتیں کاربند ہیں۔

۴۔ مشرقیوں خاص کر مسلمانوں کو الزام دیا جاتا تھا کہ وہ جب تک اپنے مذہب پر کاربند رہیں گے ترقی کی طرف قدم نہیں اٹھا سکتے اس اتہام کا ابطال۔

۵۔ مشرق کے رہنے والوں کو سیاست عامہ اور خاصہ سے خبردار کرنا۔

۶۔ مختلف مسلمان قوموں میں باہمی روابط کو مضبوط کرنا افراد کے درمیان الفت پیدا کرنا مشترک منافع کی دعوت انصاف پسند سیاست خارجہ کی حمایت۔

سید جمال الدین کا ارادہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو دینی، اجتماعی اور سیاسی اصلاح کی دعوت دیں گے کیونکہ اسلام میں یہ سب چیزیں داخل ہیں۔ عقیدہ، صفات خلقیہ اور نظام سیاسی کے لحاظ سے وہ خلفائے راشدین کے عہد میں مسلمانوں کی حالت کو کامل نمونہ مانتے تھے ان کے خیال میں وہ لوگ واحد دین کے حامی یک جان اور یک قالب تھے۔ وہ غیرت مند اور باہمت تھے اپنے عقیدہ اور عزت کی حفاظت کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دیتے تھے امکان بھر علم کی اشاعت کرتے تھے وہ کسی نرمی اور جھجک کے بغیر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے تھے۔

وقت گذرنے پر پانچ دروازوں سے فساد داخل ہوا۔ جبر کے عقیدہ اختیار کرنے اور قضا و قدر کو غلط سمجھنے سے عوام سعی و کوشش چھوڑ بیٹھے۔ قرن ثالث اور رابع میں زنادقہ کے خیالات کی تعلیمات اسلام میں آمیزش ہوئی جس سے مسلمان فرقوں اور جماعتوں میں بٹ گئے اور دین کمزور ہو گیا۔ سوفسطائی خیالات کی اشاعت۔ یہ خیالات دیکھنے میں حقائق نظر آتے تھے جھوٹی احادیث جو آنحضرت صلعم سے منسوب کی جاتی تھیں اور روح عمل اور خودداری کے لئے زہر قاتل تھیں اس سے ہمتوں میں ضعف اور ارادوں میں فتور پیدا ہوا۔ عوام کی ناقص تربیت اور جمہور کو اصول دین سے روشناس کرانے اور علم کی اشاعت میں علماء کی کوتاہی۔ بعض مقالات میں آپ نے دوسرے اسباب کی نشاندہی کی تھی جن میں اہم ترین اسباب امت کے مختلف اجزاء میں عدم رابطہ تھا خود علماء کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہ تھا علماء و امراء ایک دوسرے

سے شناسا نہ تھے۔ دین اسلام نے تو مسلمانوں کو مجاہد بننے کا حکم دیا، اس نے کہا ہے "جو کچھ طاقت کا سامان فراہم ہو سکے وہ تیار رکھو۔" لیکن مسلمانوں نے اس امر کو معمولی سمجھا ہر موقف کے لئے کوئی ساز و سامان نہ تیار کیا جسکا نتیجہ ہوا کہ ان کی طاقت اور شان و شوکت کمزوری میں بدل گئی۔

ان میں بعض اسباب کو لے کر وہ ان کی اچھی طرح تفصیل بیان کرتے تھے یا ایک مقالہ کسی ایک سبب کی تشریح کے لئے وقف کر دیتے جس طرح قضاء و قدر کے بارے میں کیا ہے ان کی عادت تھی کہ پہلے طعن و تشنیع سے دلوں میں حرارت اور اس کے بعد امید کی کرن روشن کرتے اور کہتے کہ اگر جڑ سالم ہے تو عوارض جلد مٹ کر رہیں گے ہمیشہ عہد اوّل کے مسلمانوں کی حالت اور ان کا اقبال یاد دلاتے رہتے ان کے سامنے ایک ایسی اسلامی حکومت کا نقشہ رہتا جو اسلام اور اس کی تعلیمات کے عین مطابق ہو جب یہ دیکھا کہ سارا عالم اسلام ایک امیر کا دستنگر نہیں ہو سکتا تو ان کے مختلف اجزاء کو پختہ روابط سے مربوط کرنا چاہا تاکہ ان کے سامنے ایک مقصد ہو مختلف اسلام میں ایسی حکومتیں قائم ہوں جو قرآن پاک کو اپنا مرشد و رہبر سمجھیں حکومت کی بنا عدل و شوریٰ پر ہو۔ معاملات کا انتظام و انصرام بہترین ہاتھوں میں ہو مسلمان قوموں کو اتحاد و اتفاق کی دعوت دینے کے بعد لکھتے ہیں "اس سے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تمام ملکوں میں ایک ہی فرد سیاہ و سفید کا مالک ہو ایسا ہونا مشکل معلوم ہوتا ہے لیکن میری دلی آرزو ہے کہ ان پر قرآن کی سلطانی ہو اور وحدت مقصود دینی ہو ایک سلطان دوسرے ملک کے مسلمانوں کے مفاد کا خیال رکھے کیونکہ اس کی حیات اور بقا ان کی زندگی سے وابستہ ہے" وہ عموماً جرمن ریاستوں کی مثال دیا کرتے تھے جو منتشر اور متفرق ہونے کے بعد ایک وحدت میں منسلک ہو گئی تھیں۔ وہ دول اسلامیہ کے وفاق کی دعوت دیا کرتے تھے جسکی قیادت سب سے بڑا اور طاقتور ملک کرے گا۔

ان کو ڈر تھا کہ وہ جس نظام کی دعوت دیں وہ مختلف ممالک اسلامیہ اور دوسرے مذاہب کے پیروکاروں میں نااتفاقی نہ پیدا کر دے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "ہمارے اخبار میں مسلمانوں اور ان کے حقوق کا جو چرچا رہتا ہے اس سے کوئی یہ گمان پیدا نہ کرے کہ ہم مسلمانوں اور ان کے دوسرے ہم وطنوں کے درمیان اختلاف کی خلیج وسیع کرنا چاہتے ہیں یہ ہمارے اغراض و مقاصد سے بعید ہے ہماری شریعت اس امر کی اجازت نہیں دیتی"

جس قسم کا نظام حکومت وہ دیکھنا چاہتے تھے یا قوم میں بلند اخلاق۔ غیرت۔ خودداری اور طاقت وغیرہ کا مادہ پیدا کرنا چاہتے تھے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے تمام ممالک اسلامیہ خاص کر مصر میں غیر ملکی اقتدار کو چیلنج کیا اور سختی سے اس کی مخالفت کی۔ اخبار کا بڑا حصہ اس قسم کے مقالات، مخابرات اور تبصرات کی نذر ہو جاتا

تھا۔اس غرض کے لئے انہوں نے مختلف اقسام کی تعبیریں اور اسالیب انشاء استعمال کئے یسوڈان میں مہدی کے واقعات سے دلوں میں شعور اور ہیجان پیدا کیا۔ اسکے علاوہ بہت سے خفیہ قاصد مختلف ملکوں میں روانہ کئے۔ انکو ایسی تعلیم دی گئی تھی جس کی اشاعت اخبار میں نامناسب تھی۔ ایک قاصد یاسکو اور دوسرا انجازہ بھیجا گیا یشیخ محمد عبدہ جن کو جلا وطنی کی سزا ہوئی تھی مصر اور تونس روانہ کئے گئے۔

ان کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ مصری اور ہندوستانی حکومتوں نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے اخبار کا داخلہ روک دیا۔ نوبار پاشا کی وزارت نے بھی اسی قسم کا ایک قرارداد پاس کی۔ جب لوگوں کو اخبار ملنا مشکل ہوگیا اور اس پر کڑی نگرانی کی جانے لگی تو اخبار بند ہوگیا۔اس سے منتظمین کو بہت رنج ہوا اگرچہ سب لوگوں نے دعوت قبول نہ کی تھی کہ وہ اقتدار حاصل کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے مگر اخبار بھی ...... اپنا دعوتی کام جاری نہ رکھ سکا۔

اس سے سید صاحب کی عمر کا آخری مرحلہ اختتام کو پہنچا۔یہ تین سال جو انہوں نے پیرس میں گذارے تھے سخت جدوجہد اور کٹھن مشکل میں گذارے تھے۔ ان کو حسب دلخواہ کامیابی نہ حاصل ہو سکی مگر ان کے افکار و خیالات زندہ رہے۔

(۴)

ان تین سالوں میں دو اہم واقعات رونما ہوئے ایک۔مسٹر رینان مشہور فلاسفر سے ان کی ملاقات ہوئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پہچانا دونوں کی اسلام اور عرب کے موضوع پر معرکہ آرائی ہوئی فرانسیسی اخبار دیبا نے اپنے صفحات اس موضوع کے لئے وقف کر دیئے تھے۔

مسٹر رینان نے سربون (پیرس یونیورسٹی) میں ایک لیکچر دیا تھا جس کا مرکز بحث تین نقاط تھے۔

(۱)۔ یہ مؤرخوں کی غلطی ہے کہ وہ علوم عرب۔ فنون عرب تمدن عرب اور فلسفہ عرب کا نام لیتے ہیں یہ سب غیر عرب قوموں کے ...... کا نتیجہ ہیں۔ تمدن ایرانیوں کا پروردہ ہے فلسفہ نسطوری عیسائیوں اور حرانی بت پرستوں کے افکار کا شرمندہ احسان ہے اسلامی عہد میں مختلف فلاسفر از قسم کندی۔ فارابی۔ ابن سینا اور ابن رشد پیدا ہوئے تھے۔ کندی کے ما سوا سب کے سب عجمی تھے۔ لہذا۔ تمدن۔ مدنیت۔ علم اور فلسفہ کا عربوں کیطرف انتساب کرنا نہ صرف غلطی ہے بلکہ سطحی تعبیر ہے۔

۲۔ اسلام علم۔ فلسفہ۔ آزادیٔ بحث کا نہ صرف دشمن ہے بلکہ ان علوم کی راہ میں سنگ گراں ہے کیونکہ اس میں غیب۔ خوارق عادات اور قضا و قدر پر ایمان لانا ضروری ہے۔ مسلمانوں میں جس کسی نے فلسفہ سے دلچسپی لی

اس کو ستایا گیا اور اس کی کتابیں جلائی گئیں اگر کبھی خلیفہ یا امیر المومنین نے فلسفہ اور فلسفہ دان کی سرپرستی کی تو وہ باطنی طور پر دیندار نہ تھا اس کے علاوہ اسلامی فلسفہ قدر و قیمت کے لحاظ سے ہیچ ہے یہ تو فلسفہ یونان کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ یورپ والوں نے جو فلسفہ مسلمانوں سے ہسپانیہ میں حاصل کیا اس کی اساس ردی ترجمہ ہے۔ جب فلسفہ کی کتابوں کا اصل زبان سے ترجمہ ہوا تو یورپ والوں کو حقیقی فائدہ پہنچا " اس کے ساتھ رینان یہ بھی کہتا ہے کہ اسلام کی تعلیمات بلند مرتبہ اور بڑی قدر و قیمت کی حامل ہیں جب بھی میں کسی مسجد میں داخل ہوا تو مجھے اسلام کی طرف کشش محسوس ہوئی ہے بلکہ میں افسوس سے کہتا ہوں کہ میں مسلمان کیوں نہ ہوا۔ اس کے علاوہ اسلام نے عقل کو حقائق اشیاء میں غور و فکر کرنے سے روک دیا ہے اب مسلمان علوم سے بغض رکھتے ہیں ان کا اعتقاد ہے کہ بحث و مباحثہ باعث کفر ہے۔ قلت عقل کی وجہ سے ان کو اس میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔

۳۔ عربی عنصر طبعی طور پر فلسفہ سے دور ہے جس زمانہ میں عربی عنصر حکمران تھا یعنی خلفائے راشدین کا عہد اس میں فلسفہ ناپید تھا علمی بحث و مباحثہ کا ظہور تو اس وقت ہوا جب ایرانیوں کی مدد سے عباسیوں کو امویوں پر اقتدار حاصل ہوا اور وہ دار الخلافہ عراق لے گئے جو قدیم ایرانی تمدن کا گہوارہ تھا۔

لیکچر کو علم کی اہمیت پر ختم کرتے ہوئے مشرقی اور مغربی قوموں کو اس کی ترغیب دی ہے " علم ہیئت اجتماعیہ کی روح ہے اس سے قومیں ترقی کی طرف بڑھتی ہیں۔ عدل و انصاف قائم ہوتا ہے عقل طاقت سے خدمت لیتی ہے جس سے انسانی حرمت اور آزادی قائم ہوتی ہے۔ " یہ خطبہ اخبار " دیبا " میں شائع ہوا تو مسلمانوں اور مشرقی علوم سے دلچسپی رکھنے والے عالموں میں ہیجان سا پیدا ہو گیا۔

جن لوگوں نے اس خطبہ کا ابطال کیا ان میں استاذ مسیر بھی تھے جو مصری طلبہ کے فرانس میں نگران تھے جواب میں انہوں نے تسلیم کر لیا کہ عربی تمدن خالص عربی نہ تھا بلکہ مختلف قوموں کا تھا جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ دوسرے اعتراض کا انہوں نے یہ جواب دیا کہ اسلام اور اس کی تعلیمات علمی ترقی میں حارج نہیں ہیں گذشتہ زمانہ میں مسلمانوں نے عیسائیوں پر علمی تفوق حاصل کر لیا تھا لیکن اس ترقی میں اسلام نے کوئی رکاوٹ نہ ڈالی تھی۔ آج بھی اگر کوئی سیاح بلاد اسلامیہ کی سیاحت کرے تو اسے محسوس ہوگا کہ مشرق خواب گراں سے جاگ اٹھا ہے اور علمی و اصلاحی راستہ پر گامزن ہے بغیر اس کے کہ ان کا مذہب ان کی ترقی کے راستہ میں رکاوٹ بن جائے۔

موسیو رینان سے دو دن پہلے بعض علماء نے تقریریں کی تھیں جو علم الحیاۃ میں عربوں کے انکشافات کے متعلق تھیں۔ یہ تقریریں مجلہ علمیہ میں چھپ چکی ہیں ان سے ہمیں قرون وسطی میں تمدن اسلامی کی حقیقت کے سمجھنے میں

مدد ملتی ہے؟ اگر موسیو رینان سدیو اور ڈوزی کی تالیفات، دوبارہ علوم عرب۔ آداب عرب اور فنون عرب دیکھ لیتے اور علمی میدان میں ان کی جولانیوں سے واقف ہوتے جبکہ یورپ وحشت اور جہالت کی دلدل میں پھنسا ہوا تھا تو ان پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی کہ اسلام علمی ترقی کا معاون و مددگار رہا ہے نہ کہ مخالف۔ اگر اسلام نسطوریوں مجوسیوں اور یہودی کو علمی ترقی کی اجازت دے سکتا تھا جس کا اعتراف موسیو رینان نے بھی کیا ہے تو اپنے پیروکاروں کے لئے علمی ترقی کے اسباب پیدا کرنے سے کیوں کر قاصر رہتا۔ دوسرے مسئلہ کا جواب استاذ مسمر نے قابل اعتنا نہ سمجھا۔

موسیو رینان کے اعتراض اور استاد مسمر کے جواب سے پیرس کے مسلمان نوجوانوں کی رگ حمیت پھڑک اٹھی انہوں حسن عاصم (جو بعد میں حسن عاصم پاشا کے نام سے موسوم ہوا) کو آمادہ کیا کہ وہ موسیو رینان کے خطبہ کا عربی میں ترجمہ کر کے اس کا رد لکھیں اس کے دیباچہ میں حسن عاصم نے لکھا "دین کی حمایت انسان پر فرض اور وطن کی محبت داخل ایمان ہے۔ پیرس میں مقیم مصری طلبہ نے جلسہ کر کے اپنے بھائی فقیر حسن عاصم سے درخواست کی کہ وہ موسیو رینان کی تقریر کا عربی میں ترجمہ کر دے جس میں اس نے مذہب اسلام پر طعن و تشنیع کی ہے ساتھ ہی فیلسوف کبیر استاد مسمر کے مقالہ کا بھی ترجمہ کر دیا جائے تاکہ ہم مسلمانوں اور عربوں کو موسیو رینان کے اعتراض اور اس کے جواب سے آگاہ کر سکیں اور وہ رینان کی ہرزہ سرائی سے واقف ہو جائیں۔

محمد مختار علوم طبعی کے پیرس میں طالب علم تھے انہوں نے بھی اس تقریر کا عربی میں ترجمہ کیا جس کی طرف استاد مسمر نے اشارہ کیا تھا موسیو رینان کی تقریر کی اشاعت کے چند ہفتوں بعد استاذ جمال الدین نے دیبا میں اس کا جواب شائع کرایا۔ انکے جواب میں متانت اور سنجیدگی تھی حسن عاصم اور ان کے ہمراہیوں کو سید جمال الدین کا جواب پسند نہ آیا اس لئے انہوں نے ان کے جواب کا عربی میں ترجمہ نہ کیا اور نہ ہی اس کی اشاعت کی کوشش کی رسید صاحب نے موسیو رینان کے اسلوب بحث اور انصاف پرستی کی داد دی تھی اور لکھا تھا کہ انہوں نے اس خطبہ سے استفادہ کیا ہے اور کہا کہ ان کی تقریر دو اساسی نقطوں پر محیط ہے ۱۔ مذاہب اسلامیہ علمی ترقی کے خلاف رہے ہیں ۲۔ عرب قوم طبعی و فلسفی علوم سے فطری طور پر لگاؤ نہیں رکھتی۔

پہلے سوال کا یہ جواب ہے کہ خطبہ کو شروع سے لیکر اخیر تک پڑھنے کے بعد ایک آدمی کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس برائی کا باعث مذاہب اسلامیہ ہیں یا وہ صورت حال ذمہ دار ہے جس سے ان مذاہب کو عروج حاصل ہوا۔ یا نو مسلم قوموں کے عادات و ملکات کو اس بارے میں دخل ہے معلوم ہوتا ہے کہ وقت کی تنگی

کیونکہ سے موسیو رینان اس مسئلہ کی وضاحت نہیں کر سکے۔

اس کے بعد سید صاحب نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کا بھی وہی حشر ہوا جو دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کا ہوا تھا۔ کیتھولک پادری نازاں ہیں کہ وہ ابھی تک علم و فلسفہ کے خلاف معرکہ آرائی میں مصروف ہیں۔

دوسرے سوال کا یہ جواب ہے کہ سب لوگ جانتے ہیں کہ عرب بداوت چھوڑ کر ذہنی اور علمی ترقی کے میدان میں اس سرعت سے گامزن ہوئے تھے کہ ان کی سیاسی فتوحات کی رفتار ہی ان کی علمی رفتار کا مقابلہ کر سکتی ہے ایک ہی صدی میں یونانی اور ایرانی علوم کے وہ خزینہ دار بن گئے تھے جو ملک بھی عربوں کی عملداری میں آیا علوم و فنون کا مخزن بن گیا۔ وہ رومی اور بیزنطی تمدن۔ الٰہیات اور فلسفہ کے نہ صرف محرم اسرار تھے بلکہ معارف انسانیہ کے مطلع انوار تھے پھر ایک وقت ایسا آیا کہ ان کی علمی ترقی رک گئی ان کے سامنے کوئی علمی نصب العین نہ رہا اور ان کی کتابوں کو طاق نسیان کی نذر کر دیا گیا اس کے بعد عرب تمام متمدن قوموں کے علمی وارث بنے انہوں نے تمام کہنہ علوم کو نہ صرف زندہ کیا بلکہ ان میں بہت کچھ اضافہ بھی کیا۔ کیا یہ امر ان کی طبعی علوم سے محبت پر شاہد ناطق نہیں ہے؟

یہ صحیح ہے کہ عربوں نے یونانیوں اور ایرانیوں سے بہت کچھ اخذ و استفادہ کیا تھا لیکن انہوں نے ان علوم کے مفہوم میں نہ صرف وسعت پیدا کی بلکہ ان کی منطقی تنسیق کی اور انکو اس درجہ کمال تک پہنچایا جو ان کے سلامتی ذوق اور وقت نظر کا مظہر ہے فرانسیسی۔ انگریز اور جرمن روم اور بیزنطہ کے قرب میں آباد تھے اور ان کے علوم و معارف کے آسانی سے خزینہ دار ہو سکتے تھے لیکن ایسا نہ ہوسکا جب عربی علوم و فنون کا آفتاب اندلس کی پہاڑیوں سے طلوع ہوا تو یورپ نے ارسطو کو عربی قبا میں دیکھ کر اس کا گرمجوشی سے استقبال کیا گیا یہ بھی عربوں کی ذہنی ترقی اور طبعی علوم سے ان کی دلچسپی اور شیفتگی کی مثال نہیں ہے؟

موسیو رینان خود تسلیم کرتے ہیں کہ ابتدائی پانچ صدیوں میں ممالک اسلامیہ میں بڑے بڑے علماء اور مفکر پیدا ہوئے تھے اور عالم اسلام علمی ترقی کے لحاظ سے مسیحی عالم پر تفوق رکھتا تھا وہ خود لکھتے ہیں کہ قرون اولیٰ میں مسلمان فلاسفروں کی اکثریت حرانی۔ اندلسی۔ ایرانی اور مسیحی تھی میں ایرانی علما کی روشن صفات سے صرف نظر نہیں کر سکتا عالم اسلام میں ان کے اہم کردار کی قدر و قیمت کو کم کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ گذارش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ حرانی بھی عرب تھے اور عرب جب اندلس میں داخل ہوئے تو ان کی قومیت اور جنسیت میں کوئی فرق نہ آیا تھا وہ عرب کے عرب ہی رہے۔ حرانیوں کی زبان اسلام سے سالہا سال قبل عربی بن چکی تھی اگر وہ اپنے آبائی مذہب (صابیہ) پر قائم تھے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے عرب کے سواد اعظم کی

قومیت اختیار کر لی تھی شام کے نصرانیوں کی اکثریت غسانی عربوں پر مشتمل تھی جنہوں نے عیسائیت اختیار کر لی تھی اب رہے ابن باجہ، ابن رشد اور ابن طفیل توان کی عرب قومیت گندی سے اس بنا پر کم نہیں ہو سکتی کہ انہوں نے جزیرہ نمائے عرب میں نشوونما نہیں پائی تھی خاص کر جب کہ ہم ایک قوم کو دوسری قوم سے ممیز کرنے کے لئے زبان کا اعتبار کرتے ہیں۔

اگر ہم تنگ نظری سے صرف نسل کو مدار بحث قرار دیں اور قوم کی قدر افزائی اور اس کے اثر و نفوذ سے صرفِ نظر کریں، تو نپولین کے بارے میں بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ فرانسیسی نژاد نہ تھا جرمنی اور انگلستان میں بہت سے عالم باہر سے آکر بس بس گئے تھے اس بنا پر ہم ان کو بھی جرمن یا انگریز نہیں کہہ سکتے پھر علمی ترقی کے زوال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "عقل جمہور کا ساتھ نہیں دے سکتی اس کی تعلیمات کو چند روشن خیال انسان ہی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں علم چونکہ جمالی شے ہے اس لئے انسانیت اس سے مطمئن نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کو تو مثل اعلیٰ کی تلاش رہتی ہے اور ان بلند تاریک ... آفاق میں گردش کرتی ہے جن کے دیکھنے کی فلاسفروں اور علماء کو تاب نہیں ہے۔"

استاذ رینان نے سید صاحب کا جواب لکھتے ہوئے انکی تعریف کی اور حیرت و استعجاب ظاہر کرتے ہوئے کہا "میں دو ماہ سے سید جمال الدین کو جانتا ہوں میں بہت کم کسی سے متاثر ہوا ہوں جتنا ان کی ذات سے میری اور ان کی بات چیت ہوئی تھی اس کے بعد یہ صلاح ٹھہری کہ سربون میں میرے دونوں لیکچروں کا موضوع "اسلام کا علم سے تعلق" ہوگا شیخ جمال الدین خود ہی جانتے ہیں کہ ہمارا نظریہ تھا کہ مذہب کی قدروقیمت اس کے ماننے والوں کی نسبت سے لگائی جاتی ہے میں ان سے باتیں کرتا تھا توان کی حریت گفتار و مکارم اخلاق سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں ابن سینا اور ابن رشد سے محوِ کلام ہوں۔

پھر کہا کہ مجھے ایک وجہ سے ان سے اختلاف ہے ہم رومی اور عربی تمدن کے انسانیت پر اثر و نفوذ کے منکر نہیں ہیں لیکن یہ امر ضروری ہے کہ ان عظیم انسانی انقلابات کی تحلیل کی جائے کیونکہ جو کچھ لاطینی میں لکھا گیا ہے وہ روم کی شہرت کی باعث نہیں بن سکتا اور نہ جو کچھ یونانی زبان میں موجود ہے وہ یونانیوں کا کارنامہ ہو سکتا ہے اس طرح جو کچھ عیسائی دنیا یا ممالک اسلام میں علمی کام ہوا ہے وہ عیسائیت یا اسلام کا ثمرہ ہے۔ شیخ صاحب نے مجھے انصاف پسند اس لئے نہیں سمجھا کہ میں نے موضوع بحث کا استقصا نہیں کیا اور مسیحت کے متعلق وہ نہیں کہا جو اسلام کے متعلق کہا ہے اگرچہ عیسائیوں کا ظلم و ستم مسلمانوں سے بڑھا ہوا ہے یہ درست ہے

کیونکہ گلیلیو کا حشر بھی ابن رشد سے کم حسرت ناک نہ ہوا تھا میں نے اگرچہ اس پر مفصل کلام نہیں کیا لیکن میری آراء اور معتقدات سے اہل محفل اچھی طرح خبردار ہیں میں عیسائیوں اور مسلمانوں سے یہ نہیں کہتا کہ وہ اپنے مذاہب سے دست بردار ہو جائیں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ علم کا اچھی طرح اہتمام کریں جس کے راستہ میں عقیدہ روڑا نہ اٹکائے آدھے عیسائی ملکوں میں ایسا ہو چکا ہے اور میری آرزو ہے کہ عالم اسلام میں بھی علم کی گرم بازاری ہو جاتے اور جس دن یہ عمل اتمام کو پہنچے گا میری اور شیخ جمال الدین کی خوشی کی انتہا نہ رہے گی

اپنی رائے کی تائید میں جو لیکچر میں ظاہر کی گئی تھی اصرار کرتے ہوئے سلسلہ کلام کو یوں ختم کیا "مجھے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ جمال الدین نے میرے اساسی نظریہ کی تائید میں بہت سی گرانقدر رائیں میرے گوش گذار کی تھیں کہ اسلام نے اپنی زندگی کے نصف اوّل میں علمی تحریکات کی ہرگز مخالفت نہیں کی لیکن دوسرے نصف ثانی میں بدبختی سے علمی حرکات کو پنپنے نہ دیا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ آخری نتیجہ جو رینان نے نکالا ہے اس میں اس کے سابقہ خیالات کے مقابلہ میں اعتدال پایا جاتا ہے اس سے یہ حتمی نتیجہ نکلتا ہے کہ فطری طور پر اسلام علم کا مخالف نہیں اگر ایسا ہوتا تو اپنے اوّل یا آخری عہد میں علمی تحریک کی حوصلہ افزائی نہ کرتا۔

اس طرح یہ علمی بحث اختتام کو پہنچی اس کے کچھ عرصہ بعد موسیو ہانوتو اور شیخ محمد عبدہ کے مابین یہی فکری نزاع اٹھ کھڑی ہوئی اور مسلمانوں نے اس کا سختی سے ابطال کیا کیونکہ فلسفہ اور علم میں ان کا پلہ بھاری تھا۔

اس کے بعد ایک سیاسی حادثہ رونما ہوا بعض انگریز مدبر سمجھ رہے تھے کہ العروۃ الوثقیٰ رائے عامہ کو انگریزوں کے خلاف ابھار رہا ہے انہوں نے مفاہمت کے خیال سے سید جمال الدین کو پیغام بھیجا۔ انھوں نے شیخ محمد عبدہ کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیج دیا اور کہا کہ اس اخبار کے محرّر اوّل ہمارے بعض نیک دل خیر خواہوں کی طلب پر لندن جا رہے ہیں ہمارا اس سے ان کی مراد مسٹر بلنٹ تھے) ایڈیٹر (شیخ محمد عبدہ) بہت سے انگریز مدبروں سے ملے اور مصری مسئلہ پر ان سے طویل ملاقاتیں کیں ان ملاقاتوں کا ذکر بعض انگریزی اخباروں میں بھی آیا تھا سید جمال الدین نے اخبار کے چودھویں نمبر میں ان گفتگوؤں کا ذکر کیا ہے جو شیخ محمد عبدہ اور مسٹر ہارٹنگٹن وزیر حرب حکومت انگلستان کے مابین ہوئی تھیں جن کا یہ خلاصہ ہے کہ وزیر حرب نے شیخ محمد عبدہ سے پوچھا تھا کہ کیا مصریوں کو حکومت انگلستان کے زیر سایہ امن و امان سے رہنا پسند نہیں ہے کیونکہ ہماری حکومت تو ترکوں کی حکومت سے بدرجہا اچھی ہے مصر میں جہالت عام ہے اور عوام مصری حاکم اور اجنبی حاکم کے درمیان تمیز نہیں کر سکتے۔

شیخ محمد عبدہ نے اس کا جواب دیا کہ مصریوں کو اپنے وطن سے ویسی ہی محبت ہے جس طرح انگریزوں کو انگلستان سے ہے محمد علی پاشا کے زمانہ سے مصر برابر ترقی کر رہا ہے کوئی گاؤں ایسا نہیں جہاں عربی اخبار پڑھا نہ جاتا ہو پڑھے لکھے ان پڑھوں کو خبریں پڑھ کر سناتے ہیں۔ اجنبی حکومت سے نفرت تو فطری خاصہ ہے اس باب میں تعلیمات اسلام تو اس کے علاوہ ہیں۔

ہیجان پھیلانے اور قومی شعور کے بیدار کرنے کے لئے اس گفتگو کو خوب اچھالا گیا لیکن اس انہام و تفہیم سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا اخبار اپنی ڈگر پر چلتا رہا اور بالآخر بند ہو گیا۔

(۴)

العروۃ الوثقیٰ کہنے کو تو بند ہو گیا لیکن اس کا اثر جاری و ساری رہا۔ مشرق کے بہت سے روشن خیالوں کی روح کو بیدار کیا۔ ان کو سوتے سے جگایا استعمار نے اُنہیں بدحال بنا رکھا تھا اخبار نے اس کی نشاندہی کی۔ اُنہیں لکھنا پڑھنا اور تقریر کرنا سکھایا قومی شعور جس کا نام بعد میں استقلال پڑا اس کی طرف دعوت دی یہ کہنا مبالغہ سے خالی نہ ہوگا کہ یہ مشرق میں اجنبی حکومت کے خلاف نفرت کی آگ کی پہلی چنگاری تھی اخبار نے جامعہ اسلامیہ رابطہ مشرقیہ۔ سوڈانی مصری اور ہندی مسائل کے متعلق جو کچھ بھی لکھا اس کو پورے جوش کے ساتھ بیان کیا۔ تمام مسائل کو عالمی سیاست کی نظر سے دیکھا عوام کے دلوں کو گرمایا اور اجنبی حکومتوں کی سیادت کے نقصان سے خبردار کیا وغیرہ وغیرہ۔

اس دعوت سے نہ صرف عوام۔ ملکی اور غیر ملکی حکومتیں ہی متاثر ہوئیں بلکہ پڑھے لکھے ہوئے لوگوں کا مختصر حلقہ بھی اثر پذیر ہوا جو بعد میں قومی تحریکوں کا قائد بنا۔

اخبار بند ہو گیا اور منتظمین تتر بتر ہو گئے۔ شیخ محمد عبدہ اور میرزا باقر نے بیروت کی راہ لی۔ سید جمال الدین شاہ ناصر الدین کی دعوت پر ایران چلے آئے جہاں شاہ اور علماء نے انکی خوب آؤ بھگت کی لیکن جلد ہی شہنشاہ ایران نے خطرہ محسوس کر کے سید صاحب سے آنکھیں پھیر لیں سید صاحب نے واپسی کی اجازت مانگی اور روس کے دارالحکومت پیٹرز برگ تشریف لے گئے جہاں آپ نے ۱۸۸۶ء سے ۱۸۸۹ء تک تین سال قیام کیا

لیکن وہ روس کیوں گئے؟ اور اتنی مدت وہاں کیا کام کرتے رہے؟ اس عرصہ کے متعلق ہماری معلومات بہت کم ہیں۔ بیشتر گمان یہی ہے کہ وہ دو کاموں میں مصروف رہے۔

۱۔ روس کے مسلمانوں کی تعداد تین کروڑ تھی لیکن ان کی حالت مظلومانہ تھی جو ہاں کے ارباب حل وعقد سے مل کر انہوں نے مسلمانوں کے لئے کچھ آسانیاں پیدا کیں۔ زار روس سے مل کر مسلمانوں کو قرآن پاک اور دینی کتابوں کے چھاپنے کی اجازت دلوائی۔ ۲۔ روس کا مشرق کی سیاست پر بڑا اثر تھا اور وہ ایشیا میں انگریزی سیاست کا مدمقابل تھا۔ وہ دولت عثمانیہ کے حصے بخرے کرنے کی فکر میں تھا۔ بہت سے سیاسی مدبروں کا خیال تھا کہ اس مخاصمت اور منافست کیوجہ سے جتنا انگلستان۔ فرانس اور اطالیہ کو فائدہ پہنچا ہے اتنا روس کو نہیں پہنچا۔ اگر روس کا دولت عثمانیہ پر دباؤ نہ ہوتا تو فرانس الجزائر اور تونس پر، اطالیہ طرابلس پر اور انگلستان مصر پر قابض نہ ہو سکتا۔

خواہ کچھ بھی ہو سید صاحب اثنائے قیام روس عالمی سیاست میں منہمک رہے اور روس کو انگلستان کے خلاف ابھارتے رہے۔ روسی اخباروں میں بہت سے مقالات افغانی۔ ایرانی۔ عثمانی سیاست کے متعلق لکھتے رہے اور انگریزی سیاست پر نقد و تبصرہ کرتے رہے۔ قیصر (زار روس) نے انہیں شرف زیارت بخشا اور مشرق کے متعلق بہت سے سوالات کئے۔ زار نے شاہ ایران سے اختلافات کی نوعیت پوچھی سید صاحب نے جواب دیا کہ میں تو حکومت شوریٰ چاہتا ہوں۔ زار نے جواب دیا کہ اس معاملہ میں شاہ حق پر ہے بھلا بادشاہ برداشت کر سکتا ہے کہ اس ملک کے دہقان اور کاشتکار نظم سلطنت پر قابض ہو جائیں۔ سید صاحب نے جواب دیا کہ میرا تو عقیدہ ہے کہ اگر عوام مخلص دوست بن جائیں تو یہ اس سے بہتر ہوگا کہ وہ ہر وقت بادشاہ کے خلاف سازشوں میں مصروف رہ کر اس کے دشمن بن جائیں۔ زار کو یہ جواب پسند نہ آیا اور اٹھ کھڑا ہوا اور سید صاحب کو جانے کی اجازت دے دی۔

سید صاحب نے ۱۸۸۹ء میں نمائش دیکھنے کی غرض سے پیرس کا رخ کیا۔ راہ میں میونخ اتر گئے تھے وہاں شاہ ناصر الدین سے ان کی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے ایران کی واپسی کے لئے کہا مگر سید صاحب نے معذرت کردی۔ شاہ نے اصلاحات کا وعدہ کیا۔ سید صاحب نے پہلے تو جواب دے دیا مگر بعد میں مان گئے۔

طہران پہنچے تو جمہور، علما اور عظماء نے انہیں گھیر لیا۔ ملکی اصلاح کی باتیں ہونے لگیں حکومت کے شعبوں کی تنظیم۔ اقامت عدل اور قانون سازی کے چرچے ہونے لگے تحریک قوت پکڑنے لگی۔ شاہ ناصر الدین اصلاحی پروگرام کی طرف مائل تھے سبکو نتیجہ یابی کی امید تھی کہ اچانک مطلع ابر آلود ہو گیا۔ صدر اعظم نے شاہ کے دل میں وسوسہ ڈالا کہ نمائندہ حکومت سے شاہانہ اختیارات کو دھچکہ لگے گا۔ یہ باتیں تو عوام کی سمجھ بوجھ سے باہر

ہیں یہ وہی باتیں تھیں جو زمانہ قیام مصر اور مدحت کے وقت ترکی میں بار بار دہرائی گئی تھیں جس سے اصلاح کے حامیوں اور رجعت پسندوں میں نزاع برپا ہوئی تھی۔ جب شاہ ناصر الدین نے آنکھیں پھیر لیں تو سید صاحب نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے شاہ عبد العظیم کے مزار کی پناہ لی۔ یہ مزار طہران سے بیس کیلو میٹر کے فاصلہ پر ہے ایرانیوں کی نظروں میں اسکو احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور جو اس کی پناہ میں آجاتا ہے اسے مامون سمجھا جاتا ہے اس مزار کو سید صاحب نے اپنی اصلاحی دعوت کا مرکز بنا کر رائے عامہ کو استوار کرنا شروع کر دیا۔ بعض علماء وزراء اور فوجی افسر سید صاحب کی تقریریں سننے جایا کرتے اور ان کے خیالات سے سرشار ہو کر واپس آتے تھے۔ سید صاحب ایک مہینہ مزار میں ٹھہرے ملک میں جوش و اضطراب بڑھتا گیا اس سے شاہ اور ان کے حاشیہ برداروں کو خطرہ پیدا ہوا اعلانات شائع ہونے لگے شاہ کی خدمت میں گمنام خطوط پہنچنے لگے کہ یا تو وہ انصاف کرے یا تاج و تخت چھوڑ دے نمائندہ حکومت قائم کرے یا علیحدہ ہو جائے۔

ایک دن اچانک پانچ سو مسلح سپاہیوں نے شاہ عبد العظیم کے مزار کو گھیر لیا۔ سید صاحب سخت بیمار تھے اپنی گرفتاری کا حال اس طرح سناتے ہیں کہ سپاہی مجھے مزار سے گھسیٹتے ہوئے دار الحکومت لے گئے۔ میرے ساتھ ایسا ذلت آمیز برتاؤ کیا جس کا اندازہ نہیں ہو سکتا پھر شاہ کے فوجی دستوں نے مجھے گھوڑے پر چڑھا کر خانقین بھیج دیا۔ یہ سخت سردی کا زمانہ تھا برف گر رہی تھی اور ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں سید صاحب خانقین سے بصرہ چلے آئے۔ اس حادثہ سے مرض میں اضافہ ہوتا گیا اور اگر اللہ تعالیٰ کا لطف شامل حال نہ ہوتا تو ان کا رشتہ حیات منقطع ہو گیا ہوتا۔

بیماری کے علاوہ ان کو رسوائی کا بھی شدید احساس تھا ان کے رنج اور صدمہ کی کوئی انتہا نہ تھی وہ حسب و نسب کے لحاظ سے اونچے تھے۔ دینداری۔ شرافت اور عقلمندی کی وجہ سے ممتاز تھے بھلائی کے لئے آمادہ رہتے۔ شاہ نے تو خود انکو اصلاح کے سبز باغ دکھلا کر ایران آنے کی دعوت دی تھی پھر اس نے سید صاحب سے بھگوڑے غلام کا سلوک کیا اور تحقیر آمیز برتاؤ کیا۔ سید صاحب نے بھی قسم کھائی کہ وہ سخت ترین انتقام لے کر رہیں گے اور جب تک اسکو تخت سے نہ اتار دیں گے چین سے نہ بیٹھیں گے اب انہوں نے قسم پورا کرنے کی ٹھانی۔ انہوں نے مقبول عام علماء کو خط لکھے شاہ کو بدترین صفات سے متصف کر کے انہیں اس کے خلاف بھڑکایا۔ قوم کے نقصان سے آگاہ کیا ان کے دینی جذبات سے اپیل کر کے شاہ کی معزولی کی دعوت دی۔ شاہ ناصر الدین نے کسی انگریزی کمپنی سے تمباکو کے متعلق ٹھیکہ کر رکھا تھا سید صاحب نے موقعہ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس ٹھیکہ کی ضرر رسانی ظاہر کی اور علماء کو قومی مفادات کی حفاظت کے لئے للکارا۔ اس پر لوگ

شاہ سے بگڑ گئے اور اس کے خلاف شورش برپا کردی شاہ نے مجبور ہو کر معاہدہ فسخ کر دیا اور نصف ملین لیرہ کمپنی کو ہرجانہ میں دیئے۔ یہ پہلا انتقامی قدم تھا۔

بیماری سے شفا پاتے ہی سید افغانی لندن چلے آئے اور بڑے نامی گرامی انگریز مدبروں سے ملاقات کر کے انہیں ایرانیوں کے مصائب سے آگاہ کیا جو وہ شاہ کے ہاتھوں جھیل رہے تھے۔ یہاں آ کر وہ ایک رسالہ میں جسکا نام ضیاء الخافقین تھا اور جو انگریزی اور عربی میں نکلتا تھا سید الحسینی کے نام سے مضامین لکھنے لگے! ان مضامین میں شاہ کی حکومت کی برائیاں۔ محکموں کی بدانتظامی۔ رشوت کی گرم بازاری۔ لوگوں کے مصائب کا ذکر ہوتا علماء کو برانگیختہ کیا جاتا کہ وہ شاہ سے عدم تعاون کا فتویٰ صادر کر دیں۔ سید صاحب علماء اور ان کی طاقت و قوت پر رطب اللسان رہتے اور شاہ اور اس کی حکومت کی بدترین الفاظ میں مذمت کرتے۔ یہ ان کے جلاوطنی کے مشاغل تھے۔

(ہمارے خیال میں) یہ سید جمال الدین افغانی کی بڑی بھاری لغزش تھی اس کا باعث ان کا جذبہ انتقام تھا۔ حیرت ہے کہ انہوں نے ایک اجنبی ملک میں ایک اسلامی ملک کی تشہیر کیسے جائز سمجھی جس سے اغیار کو دخل اندازی کا موقعہ ملتا تھا حالانکہ وہ العروۃ الوثقیٰ میں غیر ملکی مداخلت کی مذمت کر چکے تھے۔ ان سے تو مدحت پاشا زیادہ با مروت نکلے تھے کہ سلطان عبدالحمید نے جب انکو ملک بدر کیا اور سپاہی ان کو پکڑ کر جہاز میں لے گئے ..... اور ان کو کسی چیز کے لے جانے اور اہل و عیال کے ملنے کی اجازت بھی نہیں دی گئی تھی انہوں نے یورپ میں قیام رکھتے ہوئے اپنی قوم کی حمایت شروع کر دی۔ یورپ میں ترکوں کی برتری جتلانے لگے اور سلطان عبدالحمید کی مذمت میں ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالا۔ سچ بات یہ ہے کہ شاہ ناصر الدین کی مذمت کرنے میں سید جمال الدین کی گرم مزاجی کو بڑا دخل ہے۔ ایرانی سفیر نے بھی ان کو طعن و تشنیع سے روکنا چاہا اس کے لئے بھاری رقم بھی پیش کی سید صاحب نے جواب دیا کہ میں تاقیام قیامت اس سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔

بعض اسباب سے مجبور ہو کر سلطان عبدالحمید نے سید صاحب کو آستانہ آنے کی دعوت دی۔ اسکو ڈر تھا کہ وہ نوجوان ترکوں سے مل کر ان کے مدمقابل نہ بن جائیں۔ سید صاحب پیرس میں اس جمعیتہ کے بعض ارکان سے ملے تھے ان کا طریق کار انہیں بہت پسند آیا تھا اور وہ ان کی ہمت افزائی کیا کرتے تھے۔ اس جمعیتہ کا نام جمعیتہ الصالحۃ تھا سلطان کے کان میں اس کی بھنک پڑ چکی تھی اس کے علاوہ شاہ ناصر الدین نے سلطان کو میونخ میں

ڈالا کہ وہ سید جمال الدین کو اس کی مذمت سے روکے بلبذا سلطان عبدالحمید نے سید صاحب کو آستانہ آنے کی دعوت دی پہلے تو سید صاحب نے انکار کیا لیکن جب سلطان نے ان کی اصلاحی دعوت پر عمل درآمد کرنے کی امید دلائی تو وہ وہاں گئے آستانہ میں قدم رکھتے ہوئے ان کو معلوم ہوا کہ وہ سنہری پنجرہ میں قید کر لئے گئے ہیں سلطان نے پہلے تو وعدہ کیا تھا کہ وہ جب چاہیں جا سکتے ہیں لیکن بعد میں یہ سب دھوکہ ثابت ہوا۔

سلطان عبدالحمید کے حکم سے آستانہ میں ان کا شاہانہ استقبال ہوا۔ ۷۵ پونڈ کا وظیفہ ان کی گذران کے لئے منظور ہوا۔ یلدوز کے نزدیک ہی ایک بڑے عالیشان مکان میں ٹھہرائے گئے

سیر کے لئے گاڑی مرحمت ہوئی۔ نوکر چاکر خدمت پر متعین ہوئے۔ ان میں سے بعض جاسوسی بھی کرتے تھے غرضیکہ ان کو ہر طرح کا آرام و آسائش بہم پہنچایا گیا۔

انکو فریب دیا گیا کہ وہ سلطان کی مدد سے اپنی دعوتی اصلاح کا دائرہ وسیع کر سکیں گے جس میں جامعہ اسلامیہ کا قیام بھی شامل ہوگا اس سے ایران افغانستان۔ ترکیہ اور اس کے عرب صوبوں کا وفاق قائم کیا جائے گا اس کے بعد دولت عثمانیہ کی حکومت اور نظام تعلیم کی اصلاح کی باری آئے گی۔ سید صاحب بھول گئے تھے کہ دولت عثمانیہ کی زمین شور ہے۔ اس میں اصلاحی دعوت کا تخم بار آور نہیں ہو سکتا وہ مدحت پاشا کے معاملے سے بھی عبرت پذیر ہو سکتے تھے۔ عبدالحمید کے عہد کے اواخر میں جب شیخ محمد عبدہ سید صاحب کی وفات کے بعد آستانہ آئے تو ان کے تاثرات یہ تھے کہ انہوں نے کسی جگہ بھی عقل و فکر اور قلب کو زیادہ پراگندہ حال نہیں دیکھا جیسا کہ انہوں نے یہاں دیکھا ہے۔ علوم و آراء سے آستانہ بے بہرہ تھا۔ اگر ترک احرار وطن چھوڑ کر مسافری میں مارے مارے پھرتے ہیں اور ہر قسم کے مصائب ہنسی خوشی سے برداشت کر رہے ہیں تو وہ معذور ہیں سلطان عبدالحمید نے قصر یلدوز میں سید صاحب سے ملاقات کی تو ان کو حیرت ناک شخص پایا وہ قول و فعل میں . . . جری تھا ایسا شخص انہوں نے اس سے قبل نہ دیکھا تھا سلطان نے مشورہ دیا کہ وہ شاہ ناصر الدین کی توہین و تذلیل سے باز رہیں سید صاحب نے جواب دیا کہ میں آپ کی وجہ سے اس کو معاف کرتا ہوں سلطان یہ سن کر حیرت میں آگیا اس وقت سید صاحب تسبیح کے دانوں سے کھیل رہے تھے۔ اور فوجی انہیں اس حال میں دیکھ رہے تھے۔ سید صاحب باہر نکلے تو اس فوجی افسر سے کہنے لگے کہ سلطان اپنے عوام کے مستقبل سے کھیلتا ہے کیا جمال الدین کو ان کے حضور تسبیح کے دانوں سے کھیلنے کا حق نہیں پہنچتا فوجی نے یہ بات سنی تو ڈر کر بھاگ نکلا مبادا کوئی دوسرا ان کی گفتگو سن لے۔

انہوں نے سلطان کے حضور دولت عثمانیہ کے لئے نمائندہ حکومت کی تجویز پیش کی سلطان نے ہر ممکن امداد کا یقین دلایا سید صاحب بھی یہ سنکر خوش ہوئے اور سلطان کے ساتھ مل کر جامعہ اسلامیہ کے قیام کی تجویز پر اتفاق ہوا سلطان نے شیخ الاسلام کا منصب پیش کیا انہوں نے معذرت کر دی اور کہا کہ پہلے نظام اساسی کو درست کیا جائے۔ سلطان سے بار دیگر ملاقات اور بات چیت کی اور سلطان عبدالحمید کے متعلق یہ تاثر لے کر اٹھے کہ وہ ذہین طور پر یورپی سیاست اور اس کی چالوں سے باخبر ہیں۔ ایک ملک کو دوسرے ملک سے لڑانے میں مہارت رکھتے ہیں ساتھ ہی ڈرپوک ہیں جس سے ان کی ذہانت اور واقفیت احوال کو نقصان پہنچا ہے۔

اس اثنا میں سلطان کی نوازشات ان کے شامل حال رہیں سید صاحب ملاقات کو جاتے تھے اور اصلاح کا مشورہ دیتے۔ ایک دفعہ سلطان سے کہنے لگے اپنے دادا سلطان محمود کا حزم اختیار کر کے اپنے خائن حاشیہ نشینوں کو باہر نکال دو جو آپ کو حقائق احوال سے بے خبر رکھتے ہیں۔ حجاب کم کر دو عوام کے سامنے کھل کر بیٹھو اس سے بددیانتوں کا قلع قمع ہو گا میرے اعتقاد میں سب سے بہتر محافظ موت ہے؟ (جب ان کی موت کا وقت آئے گا تو ایک لمحہ کی کمی بیشی نہ ہو گی)

یہ سب باتیں باد ہوا ثابت ہوئیں آستانہ میں ان کا ایک دشمن ڈھونڈ کر نکالا گیا یہ ابوالہدیٰ الصیادی تھا حیلہ و مکر اور دسیسہ کاری میں ماہر اور سلطان کے مزاج میں دخیل تھا جس سے جمال الدین کا اخلاص اور خیر خواہی بے نتیجہ ثابت ہوئی اس نے سید جمال الدین اور سلطان کے درمیان ناچاقی پیدا کر دی اس سے اصلاح کی آخری امید بھی جاتی رہی۔ سید صاحب اپنی نجی گفتگو میں کہنے لگے کہ سلطان تو دولت عثمانیہ کے پھیپھڑے میں ناسور ہے۔ آستانہ میں ان کی اقامت کی مدت چار سال اور ایک ماہ تھی اس عرصہ کی اہمیت ان کے بعض ارشادات و آراء کی بنا پر ہے جن سے ان کے ملنے والے شادکام ہوا کرتے تھے یا پھر ان دسیسہ کاریوں کی بدولت ہے جنکا پردہ چاک کرنے میں وہ مصروف رہا کرتے تھے۔

اسی زمانہ کا فکری ورثہ ان کی لطف آمیز باتیں تھیں یا سننے والوں کے دلوں میں ملکی اصلاح کا داعیہ پیدا کرنا تھا کبھی کبھی ان پر غم و حزن کے آثار ظاہر ہونے لگتے زمانہ ماضی میں جد و جہد کر کے انہوں نے مسلمان قوموں کو بلایا تھا لیکن کسی کی رگ حمیت نہ پھڑکی بہت سے لوگوں سے انہوں نے امید وفا باندھی تھی لیکن وہ غدار ثابت ہوئے۔ شاہوں اور خانوں نے ان سے بدعہدی کی اخبار بند ہو گئے یہ تمام زندگی جو انہوں نے

مسلسل جہاد۔ غریب الوطنی یقید و بند تفکیر اور تحریر اور لوگوں کے بیدار کرنے میں گذار رہی تھی اس سے کیا نتیجہ بر آمد ہوا اب وہ چڑیا گھر کے شیر تھے اور اپنی آزادی کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے حالانکہ اس سے قبل وہ تمام مسلمان قوموں کی آزادی کے جویاں تھے اور اس کے حاصل کرنے کی امید رکھتے تھے۔ امیر شکیب ارسلان نے ان سے ملاقات کی اور گفتگو عربوں کے بحر اطلانطک عبور کرنے اور امریکہ کے اکتشاف پر ہونے لگی سید صاحب نے فرمایا کہ اب تو مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ کسی انسان نے انہیں کہا کہ تم بنی آدم بن جاؤ انہوں نے جواب دیا ہمارے آبائو اجداد ایسے ایسے تھے یہ اپنے اسلاف کے کارناموں کے خیال میں مگن رہتے ہیں اور یہ خیال نہیں کرتے کہ اگر ان کے آباؤ اجداد بلند مرتبہ تھے تو ان سے گمنامی اور پستی کا دھبہ کیسے دور ہو سکتا ہے؟ جب مشرقی قومیں موجودہ پستی کے جواب میں کچھ کہنا چاہتی ہیں تو اپنے اسلاف کے کارناموں کو پیش کر دیتی ہیں درست ہے کہ تمہارے بزرگ آدمی ہی تھے لیکن تم کیا ہو جب تلک تم ان جیسے کام نہ کرو تمہارے لئے ان کے مفاخر کی یاد نازیبا ہے۔

" اب مسلمان پست ہمت ہیں ان کے عزائم خوابیدہ ہیں ان کے ولولے سرد ہو چکے ہیں اگر کوئی چیز باقی ماندہ ہے تو وہ ان کی نفس پرستی ہے " محمود سامی البارودی بہترین مسلمان ہے لیکن اس نے بھی میرے ساتھ عہد کر کے بد عہدی کی امید ہے کہ یاس و حرماں کے یہ بادل چھٹ جائیں گے مشرق اور مسلمانوں میں نئی زندگی پیدا ہوگی بیماری کی تشخیص کے بعد اس کا علاج تلاش کیا جائے گا اور شفایابی کی امید بندھے گی جیسا کہ علاج کے وقت نفس انسانی امید و بیم اور خوشی و غم کی کشمکش سے دو چار رہتا ہے یا بادل کے گرجنے اور کڑکنے کے بعد سورج نکل آتا ہے۔

وہ اپنے رفقاء کے ساتھ مشرقی اقوام کی بیماری کی تشخیص اور علاج بتلانے میں معروف رہا کرتے تھے کہا کرتے تھے کہ اس کا علاج مغربیوں کی طرح آبرو مندانہ زندگی گذارنا ہے جیسا کہ ایک عربی شاعر نے کہا " نیک نامی کی زندگی بسر کرو اور مرو تو تمام لوگ تمہارے مداح خواں ہوں " چونکہ ابھی اس کا حصول مشکل سا نظر آتا ہے لہذا جدید نسل کی صحیح دینی تربیت کرنی چاہیئے یہ کام ان لوگوں کے سپرد کرنا چاہئے جو قسم کھائیں کہ وہ کبھی بھی کسی سلطان کے دروازے پر نہ جائیں گے انقلابات زمانہ سے ہراساں نہ ہوں گے کوئی دھمکی ان کو ان کے عزائم سے باز رکھ سکے گی اور نہ کسی منصب و جاہ کے وعدہ پر فریفتہ ہوں گے کسی قسم کا کسب یا تجارت ان کو ان کے نصب العین سے نہ ہٹا سکے گا بلکہ وطن کی آزادی کے لئے ہر قسم کی تکلیف کو ہنسی و خوشی برداشت کریں گے۔

پوچھا گیا کہ کیا یہ سب کچھ ممکن ہے۔

فرمایا استقلال سے ہمت پیدا ہوتی ہے تنگی کے بعد کشائش کی امید رکھی جا سکتی ہے طلوع فجر سخت اندھیرے

کے بعد ہوا کرتا ہے مجھے امید ہے کہ مشرق پر مصائب کی جو کالی گھٹا چھائی ہوئی ہے پو پھٹنے سے چھٹ جائے گی اس عالم میں یہی فطرتی قانون ہے کہ تنگی کے بعد کشائش ہوتی ہے۔

مجلس میں اس خطرہ کا بھی ذکر چل نکلا جو بعض مغربی اقوام کی طرف سے کمی قومی زبانوں کے رائج کرنے اور قومی تعلیم کے تغافل سے درپیش ہے مشرقی قوموں کو ان کے آداب سے متنفر کر کے اپنی زبانوں اور ادب کو رواج دے رہے ہیں" قوم کا بندھن تو اس کی قومی زبان ہوتی ہے اور جس قوم کی قومی زبان نہ ہو اس کا کوئی ادب نہیں ہوتا اور جس کی کوئی تاریخ نہ ہو اس کی عزت و وقعت نہیں ہوتی تاریخ قوم کے اکابر و اعاظم رجال کے مآثر کی یاد سے بنتی ہے تاکہ ان کی پیروی کی جائے انکی مجالس میں موضوع سخن مناسب احوال سے پیدا ہوتا جن کا مقصد عقیدہ و اجتماع اور زبان کی اصلاح ہوا کرتا کبھی ابوالہدیٰ الصیادی کی مکاری سے سلطان غضب ناک ہو جاتا خدیو عباس سلطان کی ملاقات کے لئے آستانہ آتے اور جمال الدین سے بھی ملنا چاہتے جو سلطانی اجازت کے بغیر نہ ہو سکتی تھی سلطان انکار کر دیتا تو سید جمال الدین خدیو کے قاصد کو کہہ دیتے کہ میں تو سلطان کا مہمان بھی ہوں اور قیدی بھی۔ ہر روز ہوا خوری کے لئے کاغذ خانہ کیطرف جایا کرتا ہوں اگر خدیو مصر وہاں ملنا چاہیں تو مل سکتے ہیں۔ خدیو مصر نے وہاں جا کر تخلیہ میں ملاقات کی اور ان کی بہت کچھ مدح و ستائش کی اور بڑی اچھی طرح سے پیش آئے جاسوسوں کو موقع ملا تو انہوں نے مختلف افواہیں پھیلا دیں کہ سید جمال الدین نے خدیو عباس سے معاہدہ کیا ہے کہ دونوں مل کر دولت عباسیہ قائم کریں گے۔ انہوں نے شعر بھی گھڑ کر سید جمال الدین سے منسوب کر دیئے۔ سلطان نے سید صاحب کو بلایا اور حقیقت حال پوچھی سید صاحب نے جواب دیا کہ معاملہ تو صاف ہے میں نے تو بات چیت بھی لکھ رکھی ہے۔ ہم دونوں تھے اور کوئی تیسرا نہ تھا تو کس نے یہ بات سن لی اگر یہ بات صحیح ہو گی تو میں نے کہی ہو گی یا عباس نے پھر آپ نے قسم کھائی کہ اس قسم کا کوئی تذکرہ نہیں ہوا نہ انہوں نے عمر بھر بیت بازی کی ہے اس طرح ظاہر میں یہ معاملہ بڑے شور و شر کے بعد ختم ہو گیا اس زمانہ میں اتفاق سے شاہ ناصر الدین کو قتل کر دیا گیا تھا۔ شاہ اور سید صاحب کے درمیان مخاصمت رہی تھی اتفاق سے شاہ کا قاتل سید صاحب کا شاگرد تھا اور ان سے ملنے آستانہ آیا کرتا تھا یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ جب اس نے نیزہ مارا تو کہا کہ ہاتھ تو جمال الدین کا ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب انہیں قتل کی خبر ملی تو اظہار پسندیدگی کیا اس سے سلطان عبدالحمید ڈر گیا اور اپنی زندگی کو خطرہ میں محسوس کیا اور لوگوں کو سید صاحب سے ملنے کے لئے اجازت کی شرط لگا دی سید جمال الدین بھر گئے اور آستانہ چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے انگریزی سفارت خانہ نے انہیں پاسپورٹ دینے کا وعدہ بھی کر لیا لیکن سلطان ان

کے باہر جانے سے زیادہ ڈرتا تھا بنسبت ملک میں رہنے کے کیونکہ اندرون ملک میں .... وہ ان کی حرکات و سکنات پر نظر رکھ سکتا تھا آخر کار سلطان نے انہیں راضی کر لیا اور ایک غیر ملکی حکومت سے مدد مانگنے کی عار دلائی سید جمال الدین مان گئے جب سید صاحب نے سرطان کے عارضہ سے وفات پائی تو سلطان کی مشکل بھی حل ہو گئی۔ ان کی موت پر مختلف افواہیں پھیلی تھیں کہ ان کے علاج سے قصداً اغماض کیا گیا اور سرکاری ڈاکٹر کی مدد سے ان سے چھٹکارا حاصل کیا۔

اسباب خواہ کچھ رہے ہوں انہوں نے وفات پائی ان کے جنازہ کے ساتھ گنتی کے چند آدمی تھے جو جری اور وفادار تھے۔ انہیں عام آدمیوں جیسا کفن دفن دیا گیا اور مملکت عثمانیہ میں تمام اخبارات کو ان کی یاد سے روک دیا گیا۔

(٦)

سید صاحب کی کیا تعلیمات تھیں اور ان کی اجمالی غرض کیا تھی مسٹر لوتھروپ سٹوڈارڈ Lothrop Stoddard نے لکھا ہے کہ سید جمال الدین کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ مغرب مشرق کا دشمن ہے اور آج بھی صلیبی روح یورپ کے سینہ میں کام کر رہی ہے جس طرح پیٹرس کے وقت معروف کارتھی مغربی عناصر میں تعصب جاری و ساری ہے جو ہر وطریقہ سے مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کی تحریکات کو نیست و نابود کرنے پر تلے ہوئے ہیں ہوریں حالات عالم اسلامی پر واجب ہے کہ اپنی بقاء کے لئے متحد ہو جائے اور اس کے لئے لازم ہے کہ جن وسائل سے مغرب نے ترقی اور حقوق حاصل کیا ہے ان پر قبضہ کر لیا جائے۔

گولڈ زیہر لکھتا ہے کہ بقول براؤن سید جمال الدین۔ فلاسفر۔ منشی۔ خطیب اور صحافی تھے سب سے بڑھ کر سیاست دان تھے ان کے مداح ان کو وطن پرست اور دشمن انکو انتشار پسند سمجھتے ہیں دول اسلام کے نظام حکومت کی اصلاح کے لئے جو کوششیں ان دس سالوں میں ہوئی ہیں ان سب میں ان کا اثر موجود ہے۔ ان کی کوشش تھی کہ تمام ممالک اسلامیہ یورپ کے چنگل سے آزاد ہو جائیں اور منظم محکموں کی بدولت داخلی معاملات میں ترقی کریں۔ ان کا نصب العین بشمول شیعی ایران جامعہ اسلامیہ کا قیام تھا تاکہ اس اتحاد سے عالم اسلام کے معاملات میں یورپ کی مداخلت کا سد باب ہو سکے۔

سید جمال الدین خود اپنے متعلق لکھتے ہیں "میں نے فکر نظر کی پراگندگی دور کر کے مشرق اور اہل مشرق

کی طرف نظر کی تو دیکھا کر افغانستان میرا مرزبوم ہے۔ ہندوستان نے مجھے ثقافت علمی سے بہرہ مند کیا ہے ایران ہمارے قرب میں ہے اور اس سے روابط ہیں۔ جزیرہ عرب میں حجاز مہبط وحی ہے اسی طرح نجد عراق بغداد اور شام اور اندلس وغیرہ کا حال ہے۔ مشرق مشرق ہی ہے میں نے اپنی تمام دماغی صلاحیتیں ان کے مرض کی تشخیص اور دوا کی تلاش میں صرف کر دیں۔ مجھے معلوم ہوا کر سارے امراض کی جڑ نا اتفاقی اور افکار کی پراگندگی ہے۔ وہ اتحاد کے مخالف اور مخالفت کے لئے متحد ہیں میں نے انہیں ایک رشتہ میں پرونا چاہا اور مغربی خطرہ سے انہیں متنبہ کیا" شیخ محمد عبدہ کہتے ہیں "ان کے تمام افکار کا مرکز ان کا سیاسی مقصد تھا جس کے لئے عمر بھر ساعی رہے انہوں نے جو تکالیف برداشت کیں اسی راہ نوردی کی پیداوار تھیں۔ وہ دول اسلام کو اپنے فرائض و واجبات سے آگاہ کر کے انہیں بام رفعت تک پہنچانا چاہتے تھے تاکہ (زندگی کی دوڑ میں) وہ باعزت قوموں سے پیچھے نہ رہیں۔ ایک ملک دوسرے ملک کا پشت پناہ ہوگا تو اسلام کو دوبارہ شان و شوکت اور دین حنیف کو بزرگی حاصل ہوگی اور بلاد مشرق سے برطانوی سایہ مٹ کر رہے گا۔

تمام لوگ متفق ہیں کہ ان کے دو واضح اغراض تھے

۱۔ مشرق کے مردہ جسم میں بیداری کی روح پھونکنا تاکہ وہ ثقافتی۔ علمی۔ تربیتی اور دینی صفائی کے لحاظ سے ترقی کرے اور خرافات سے اپنے عقائد اور اخلاق کو پاک کرے جس سے اس کو دوبارہ عزت اور شرف حاصل ہو۔

۲۔ اجنبی قبضہ کی مخالفت تاکہ بلاد مشرق کو آزادی حاصل ہو اور وہ ایک دوسرے سے مربوط ہو کر رہیں اس سے خطرات ٹلیں گے۔

زندگی بھر وہ دو چیزوں کے علمبردار رہے جب انہوں نے وفات پائی تو ان اعلام کو بعد کے مصلحین نے تھام لیا کسی نے ایک علم اٹھایا تو دوسرے نے دوسرے علم کو تھاما لیکن دونوں علم ایک ذات میں جمع نہ ہو سکے مثلاً محمد عبدہ نے جو ان کے سب سے بڑے اور قابل شاگرد تھے ثقافتی علم اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ سیاست سے وہ تہی دست تھے بعد میں پتہ چلا کہ العروۃ الوثقیٰ میں سیاسی مباحث پر سید جمال الدین کے کہنے سے خامہ فرسائی کرتے تھے اسی واسطے انہوں نے سید صاحب کی خدمت میں گذارش کی تھی کہ وہ اخبار چھوڑ کر ایک مدرسہ قائم کریں جب وہ خود مختار ہوئے تو انہوں نے بیروت میں اپنے آپ کو خالص علمی سرگرمیوں کیلئے وقف کر دیا جب مصر واپس آئے تو ان کے پروگرام میں تعلیم اور ثقافت وسیع معنوں میں شامل تھی ارباب بست و کشاد

سے چاہا تھا کہ وہ انہیں دارالعلوم کا نگران یا استاد مقرر کر دیں لیکن وہ لوگ ان کے سابقہ کردار کی وجہ سے ان سے خائف تھے حکومت نے ان کو قاضی مقرر کر دیا تاکہ ان سے کسی قسم کا خطرہ نہ رہے بلکہ ببانگ دہل یہ اعلان کرتے رہے کہ مصلح پر واجب ہے کہ سب سے پہلے قوم کو مہذب اور تعلیم یافتہ بنائے جس کا نتیجہ آزادی ہو گا بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے تعلیمی پروگرام کے نفاذ کے لئے انگریزوں سے تعاون کیا اور ان سے راہ و رسم پیدا کی اور اندرونی ثقافت کی اصلاح کے لئے ان کی امداد کے طالب ہوئے بس یہی وجہ مخاصمت تھی جو ان کے اور مصطفیٰ کامل کے مابین تھی۔ بعض دفعہ اسی وجہ سے ان کے اور سید جمال الدین کے تعلقات میں بگاڑ پیدا ہو جاتا تھا سید صاحب جب آستانہ میں تھے تو شیخ محمد عبدہٗ نے ایک گمنام خط لکھا تھا جس میں بعض اشخاص کے متعلق اشارے وکنائے سے کام لیا تھا۔ لیکن ان کا نام نہیں لکھا تھا اس سے سید صاحب برافروختہ ہو گئے اور شیخ محمد عبدہ کو گرم گرم جواب دیا جس میں ان کی بزدلی پر توبیخ کی تھی لکھتے ہیں "تم خط کو معمہ بنا کر لکھتے ہو شاید تم موت کو دیکھ رہے ہو تو اس سے خوف تمہیں نجات دے گا عالم کو فیلسوف کی نظر سے دیکھو اور خوف زدہ بچہ نہ بنو" غالباً یہ ان کی آخری خط و کتابت تھی۔

شیخ محمد عبدہ بزدل نہ تھے لیکن شعلہ نوا جسم معتدل جسم کو ٹھنڈا محسوس کرتا ہے سید صاحب نے یہ جواب جو لکھا تو معلوم ہوتا ہے کہ ان پر حدت مزاج طاری تھی۔

بہر حال شیخ محمد عبدہ نے اپنے لئے ایک پروگرام بنا لیا تھا اور اس پر کفایت کر کے بیٹھ گئے اس مقصد کے لئے انہوں نے امکان بھر جدوجہد کی اور صحت۔ عقل اور مال کی بازی لگا دی اور امکان بھر ثقافت کی پرورش اور اس کی اصلاح میں لگے رہے۔

جن لوگوں نے سیاسی علم اٹھایا ان میں عبداللہ ندیم۔ مصطفیٰ کامل و فرید اور سعد زغلول کا نام آتا ہے وہ سید صاحب کے نشان راہ پر چلتے ، اور مغرب کے جدید ترین اسالیب اور وسائل سے کام لیتے رہے۔

مصر کی طرح سارے مشرقی ممالک کا ایسا ہی حال تھا کسی نے اصلاحی اور ثقافتی علم کو تھاما تو کسی نے سیاسی کہاں ہیں سے بعض کا حال ہم آئندہ لکھیں گے اگر سید صاحب آج آنکھیں کھول بیٹھیں تو مشرق کے حالات دیکھ کر اس کی تعریف کریں گے۔ گمان غالب ہے کہ وہ سست گامی سے غضب ناک و ہا کرتے تھے۔ مزاج کے گرم تھے اصلاحی دعوت کی سست رفتاری سے نالاں تھے انہیں تو برق رفتاری پسند تھی بعض دفعہ یہی عجلت پسندی ناکامی کا سبب بن گئی تھی سید جمال الدین جرأت سے آگے بڑھنے والے تھے اور ہر شکل خاطر میں لاتے تھے بغیر وسعت و فطانت جس چیز کو بلند کرتی ہے حدت مزاج اس کو گرا دیتی ہے۔

وہ سب سے زیادہ حضرت علی سے مشابہ تھے مگر امیر معاویہ سے امیر معاویہ کی سیاسی زندگی کا عنوان تھا کہ ہم باطل کی راہ سے سچائی کی منزل تک پہنچیں گے حضرت علی صرف سچائی کی راہ سے منزل مقصود تک پہنچنا چاہتے تھے وگرنہ نہیں سید جمال الدین بھی ان کے نشان راہ پر چل رہے تھے شیخ محمد عبدہ کہتے ہیں کہ اگر وہ ابوالہدیٰ الصیادی کو سلطان سے کہہ کر پانچ سو پونڈ دلا دیتے یا اس کے لڑکے یا لڑکی کا وظیفہ مقرر کرا دیتے تو ان کا کیا بگڑتا اس سے ان کو اصلاحی پروگرام کے نفاذ میں مدد ملتی ابوالہدیٰ چاہتا تھا کہ اگر سید صاحب اس کی موافقت نہ کریں تو مخالفت بھی نہ کریں لیکن سید صاحب کیسے صبر کر سکتے تھے وہ تو ابوالھدیٰ کو کمینہ اور مکار سمجھ رہے تھے۔

جب سید صاحب نے اپنے خاص احباب کو بتلایا کہ خدیو عباس کے بارے میں انہوں نے سلطان کی غلط فہمی دور کر دی ہے اور ان پر واضح کر دیا ہے کہ سب کچھ ابوالہدیٰ کی وسیسہ کاری ہے اور سلطان مطمئن ہو ہو چکا ہے تو عبداللہ ندیم نے کہا کہ کاش آپ ابوالہدیٰ کی شرارتوں اور فتنہ پردازیوں سے سلطان کو مطلع کر دیتے۔ اس پر سید صاحب غضبناک ہو گئے اور کہا پناہ بخدا میں منافق بننا نہیں چاہتا بھلا کیسے میں یہ کام کر سکتا ہوں جسے خود ناپسند کرتا ہوں میں طعنہ باز اور چغل خور بننا نہیں چاہتا۔

اس طرح وہ سچائی کو منتہائے مقصود سمجھتے اور اس کے لئے سچائی کا وسیلہ ڈھونڈتے دنیا ہمیں بتلاتی ہے کہ امیر معاویہؓ کی سیاست کامیاب رہی ہے دنیا کی سیاست کا مدار مصالحت پر رہا ہے ایک چیز کے حصول کے لئے دوسری چیز سے دستبردار ہونا پڑتا ہے کامل حق کس کو ملا ہے؟ اس کی اعلیٰ مثال اخلاق میں ڈھونڈنی چاہئے نہ کہ سیاست میں یا اسے اس انتظار میں رہنا چاہئے کہ سیاست اخلاق کی فرمانبردار بن جائے۔

سید صاحب کے سوانح کا اہم باب ان پر الحاد کی تہمت ہے اس کی تاریخ کافی طویل ہے جب وہ پہلے پہل آستانہ گئے تھے تو انہیں الحاد سے متہم کیا گیا سید صاحب نے دارالفنون میں ایک تقریر کی تھی جس میں کہا تھا کہ انسانی معیشت زندہ بدن کے مشابہ ہے تمام صنعتیں بمنزلہ عضو کے ہیں اسی طرح دماغ کا حال ہے آہن گری بانو اور زراعت جگر کی مانند ہے جسم کی زندگی روح سے ہے اور معیشت انسانی کی روح نبوت اور حکمت ہے۔ اس پر شور و شغب برپا ہوا اور طعن و تشنیع کی گئی کہ آپ نبوت کو صناعت مانتے ہیں بالآخر آپ کو آستانہ سے نکلنے کا مشورہ دیا گیا۔

جب وہ مصر آئے تو شیخ علیش کی طرح بہت سے علماء نے انہیں ملحد کہا۔ ان لوگوں کی نظر میں الحاد

...... آسان سی شے تھا جو کوئی ان سا طور طریقہ اختیار نہ کرتا ان جیسا لباس نہ پہنتا۔ سگریٹ پیتا۔ قہوہ خانہ میں .... نشست و برخاست رکھتا۔ یہود و نصاریٰ اس کے ملنے والے تو جھٹ اس پر الحاد کا فتویٰ جڑ دیتے ہر انسان کا اپنا اپنا عقیدہ ہوتا ہے اسی طرح اس کا تصور الحاد کے بارے میں اس کی ذہنی کیفیت کا مظہر ہوتا ہے۔

سلیم بک عنجوری نے سحر ہاروت میں سید صاحب کے حالات لکھے ہیں اور ان پر الحاد کا الزام لگایا ہے لکھا ہے "کہ وہ علم الأدیان کے ماہر تھے اور عالم کی قدامت کے قائل تھے وغیرہ وغیرہ"

شیخ محمد عبدہ سلیم بک سے ملے اور بلا تحقیق و تدقیق اناپ شناپ لکھنے پر ملامت کی سلیم بک نے اخبارات میں اپنے خیالات سے رجوع کرتے ہوئے کہا شیخ محمد عبدہ نے مجھے حل کر بتایا ہے کہ یہ حسد کی کرشمہ سازیاں ہیں سید صاحب مناظرہ کرتے ہوئے دوسرے مذاہب کے معتقدات کھل کر بتلایا کرتے تھے اور پھر تردید کیا کرتے تھے شاید کسی نے کسی مناظرہ میں ایسی ویسی بات سن کر ان سے منسوب کر دی ہو انہوں نے اپنے کانوں سے سید صاحب سے ایسی باتیں کبھی نہیں سنی تھیں وہ تو دین کی ضرورت اور الوہیت پر اعتقاد کے وہ قائل تھے ہم نے اس تردید کے جلد شائع کرنے کی ضرورت اس لئے سمجھی ہے کہ جو لوگ ان سے ناشناسا ہیں ان پر زبان طعن نہ دراز کرنے لگیں۔

موسیو رینان نے بھی ان پر جو اتہام لگایا اس کا ہم ذکر کر چکے ہیں یہ دقیق ترین موقف ہے کیونکہ رینان وسیع النظر فلاسفر تھا اس کی تعبیر دقیق ہوا کرتی تھی

ہمارے خیال میں سید صاحب نے دین اسلام اور مسلمانوں کی حالت کا جو فرق بتلایا ہے وہ بالکل واضح ہے خصوصاً انہوں نے رینان کے مقالہ میں نقص نکالا تھا کہ رینان نے اس مسئلہ پر بحث نہیں کی کہ یہ تمام تنزل اسلام کا پیدا کردہ ہے یا بعض مسلمان اقوام کے اخلاق سے پیدا ہوا ہے ہمارے خیال میں اس میں ابہام پیدا ہو گیا ہے ان کے خیال میں دین اور علم کا دائرہ جدا جدا ہے اور اگر کسی دین کی علمی صحت ثابت ہے تو وہ علم کے خلاف نہیں ہو سکتا وہ اس کی وضاحت رینان کے رد میں کما حقہ نہ کر سکے خود رینان کا لیکچر بھی مبہم سا تھا اس میں شک نہیں کہ سوچ بچار کے معاملہ میں سید صاحب آزاد خیال تھے مناظرہ پر حاوی ہو جاتے تھے ان کے دلائل کئی طرح کے ہوا کرتے تھے ممکن ہے کہ رینان سے اس قسم کی باتیں ہوئی ہوں جیسا کہ کبار مفکرین سے بعض اوقات ہو جاتیں ہیں لہذا رینان کا مواخذہ کرنا شائل خطا ہے۔

سید صاحب کے قریبی دوست شیخ محمد عبدہ بیان کرتے ہیں کہ سید صاحب مزاج کے لحاظ سے صوفی تھے یہ عقیدہ ایک قسم کا مبہم سا ہوتا ہے جو وحدت الوجود تک منتہی ہوتا ہے خواص کو چھوڑ کر عوام اس کو الحاد سے

ملتبس کر دیتے ہیں اسی وجہ سے شیخ محی الدین بن العربی اور ان جیسے علما پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا جس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے اقوال کی اچھی طرح تعبیر نہ ہو سکی۔

سید صاحب تو عمر بھر دین اور توحید کی دعوت دیتے رہے ان کے رسالہ "الرد علی الدہریین"، العروۃ الوثقی اور خاص مجالس میں ان چیزوں کا چرچا رہا کرتا

ان کے بعض خاص احباب بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے ایک بوڑھے شخص کو انحضرت صلعم کے متعلق ناشائستہ کلمہ منہ سے نکالتے ہوئے سنا انہوں نے اپنے ساتھی پٹھانوں کو اس کی مرمت کا حکم دے دیا انہوں نے مار مار کر اس کو باہر نکال دیا۔

مخزومی نے ایک مجلس کا حال لکھا ہے جب ایک شخص سید جمال الدین سے ملنے ان کے گھر آستانہ آیا تھا۔ دوران گفتگو اس شخص نے کہا میں نے فلاسفروں کی کتابیں پڑھی ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ غیر موجود ہیں بلکہ ان کے وجود کا صرف حیوان ہی اقرار کر سکتے ہیں سید صاحب تنگ دل ہوئے اور کوئی جواب نہ دیئے بغیر حاضرین کو گھر کے پائیں باغ لے گئے جہاں ... مختلف اقسام کے جانور تھے مرغ اذان دے رہے تھے اور چرند پرند چہچہا رہے تھے سید صاحب کہنے لگے ایک ضعیف اور گونگا جانور آدمی سے کس طرح کم حیثیت ہو سکتا ہے جب کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے اور انسان وجود باری ہی کا منکر ہو وہ واجب الوجود کا کیسے انکار کر سکتا ہے۔ جب کہ وہ خود کیڑوں مکوڑوں کی خوراک بننے والا ہے اگر انسان اجرام فلکی سے عبرت پذیر نہیں ہو سکتا تو اسے گلی سڑی ہڈیوں سے ضرور عبرت حاصل کرنی چاہیئے اس پر وہ ملحد شخص بغیر الوداع کہے بھاگ نکلا۔ اس قسم کے اقوال اور تحریریں اور غیرت مندی ایک ملحد شخص کی نہیں ہو سکتی ہاں اگر کوئی تصنع اور نفاق میں مہارت حاصل کرے تو اور بات ہے سید جمال الدین کا عیب نفاق نہ تھا بلکہ اس کا سب سے بڑا عیب صاف گوئی تھا وہ کسی چیز کو چھپا نہ سکتے تھے کہتے تھے "کہ کسی بشر میں کمال نفسی تب ہی پیدا ہوتا ہے جب وہ رازداری چھوڑ کر اعلان حق اختیار کرے" ان کی زندگی کے مصائب بات کو صاف اور کھلے طور پر کہہ دیتے تھے سید صاحب جیسا انسان جو ان اخلاق سے متصف تھا اگر ملحد ہوتا تو لوگوں کو بھی کھلے بندوں الحاد کی دعوت دیتا۔

وہ اصول پر ایمان رکھتے تھے۔ فروع میں عقلی آزادی کے قائل تھے وہ عجیب و غریب نتائج تک پہنچ جاتے تھے اس سے جاہل انسان انہیں ملحد سمجھتے وہ تقلید سے نفرت کرتے اور اجتہاد کے داعی تھے انکی مجلس میں قاضی عیاض کا ذکر ہوتا اور روایت کرنے والے ان سے تمسک کرتے سید صاحب کہتے "سبحان اللہ قاضی عیاض نے جو

کچھ کہا ہے بقدر اپنی عقل و سمجھ اور زمانہ کی ضروریات کے مطابق کہا ہے کیا کسی دوسرے کو اس بات کی اجازت نہیں مل سکتی کہ وہ قاضی عیاض اور دیگر ائمہ سے زیادہ باصواب اور حق سے زیادہ قریب بات کہہ دے کیونکہ قاضی عیاض اور ان جیسے دوسرے ائمہ اپنے پیشرو صاحبان علم سے اختلاف کر سکتے ہیں اور اپنے زمانہ کی ضروریات کے لئے استنباط کر سکتے ہیں تو ہم اپنے زمانہ کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر کیوں نہ احکام مستنبط کریں۔

اجتہاد کا دروازہ مسدود ہونے کے کیا معنی ہیں یہ کس نص سے مسدود ہوا ہے یا کس امام نے کہا ہے کہ میرے بعد دین کے فہم کے لئے اجتہاد کی ضرورت نہیں ہے اور قرآن پاک احادیث صحیحہ اور قیاس سے کام لے کر علوم عصریہ، حاجات زمانہ اور احکام کی تطبیق کا کام نہیں کرنا چاہئے۔

ائمہ اعلام نے اجتہاد کیا ہے اور خوب کیا ہے لیکن یہ اعتقاد رکھنا صحیح نہ ہو گا کہ انہوں نے کہ انہوں نے قرآن پاک کے تمام اسرار کا احاطہ کر لیا تھا قرآن پاک کے علوم و فنون کے مقابلے میں ان کا اجتہاد سمندر کا ایک قطرہ ہے "فضل تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے جسکو چاہتا ہے دے دیتا ہے۔" ان کی رائے تھی کہ اہل السنۃ اور شیعوں کے اختلاف بادشاہوں کی طمع اور عوام کی جہالت کی پیداوار ہیں سب قرآن اور رسالت محمدی پر ایمان رکھتے ہیں تو اختلاف اور جدل و قتال کس واسطے ہے۔ یہ بھی کہتے تھے کہ دنیا کے تین بڑے مذہبوں کی اساس ایک ہی ہے۔ صرف دینی سرداروں اور سودے بازوں نے اختلاف کی خلیج کو وسیع کیا ہے۔

اکثر اسلامی اشتراکیت کا مغربی اشتراکیت سے موازنہ کرتے اور کہتے حاکموں کے جور و ستم، محروموں کے حسد و بغض نے جو وہ امیروں سے رکھتے ہیں مغرب کی اشتراکیت کو جنم دیا ہے اسلام کی اشتراکیت مذہب کے رگ و ریشے میں پیوست ہے خلق کے ساتھ مربوط ہے بھلائی کا جذبہ اس کو حرکت میں لاتا ہے حضرت عمرؓ اور ابوذرؓ کے اعمال اس پر شاہد ناطق ہیں ان کی مجلس میں مرد۔ عورت۔ بے نقابی اور پردہ وغیرہ کا ذکر چھڑ جاتا تو وہ دیر تک گفتگو کرتے رہتے ان کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں تک عقلی تکوین کا تعلق ہے مرد اور عورت برابر ہیں مرد کا بھی سر ہوتا ہے اور عورت کا بھی...... اب ان میں جو جو تفاوت پیدا ہوا ہے وہ تربیت کا نتیجہ ہے مرد کو کھلی چھٹی دے دی گئی اور عورت کو گھر اور بچوں کی پرورش پر لگا دیا گیا جو کہ مردوں کی نسبت اہم اور شریف ترین کام ہے اگر کوئی مرد و عورت کے ہر کام میں مساوات کا نعرہ لگائے تو وہ غلط کار ہے ہر ایک کا وظیفہ کار جدا جدا ہے ان دونوں کے تعاون سے معاشرہ کا قیام ہے اگر عورت کے لئے روزی کمانے والا نہ رہے تو وہ ظروف و احوال سے مجبور ہو کر باہر نکل کر کام کر سکتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ نیت صالح اور دامن پاک رہے پھر کہنے لگے "کہ میرے نزدیک ننگے منہ پھرنے کی قید نہیں اگر فسق و فجور کا

اندیشہ نہ ہو۔

یہ بھی کہا کرتے تھے کہ صحیح دین حقائق علمیہ کا مخالف نہیں ہو سکتا اگر بظاہر مخالف ہوتا ہے تو اس کی تاویل واجب ہے جو لوگ آج عالم بنے بیٹھے ہیں ان میں جہالت اور جمود کی فراوانی ہے حتیٰ کہ قرآن پر زبان طعن دراز کی گئی کہ وہ ثابت شدہ علمی حقائق کا مخالف ہے حالانکہ قرآن ان سب باتوں سے بری ہے اور وہ تو علم حقیقی کی مخالفت نہیں کرتا خاص کر کلیات کے بارے میں۔

سید صاحب باوجود وسعت نظر کے شبلی شمیل کے ملحدانہ نظریات کے سخت ناقد تھے جو مذہب ڈاروِن سے بھی تجاوز کر گئے تھے اس کے ساتھ اس کے صبر و ثبات اور جرأت مندانہ قول کی وجہ سے اسکے مداح تھے۔ اس سبب سے بعض الزام دینے والے ان کو مالوف راستہ سے ہٹا ہوا دیکھتے۔

اس عالم کون و مکان کی یہی سنت رہی ہے کہ مصلحوں کو کفر و زندقہ اور جنون سے نوازا جاتا ہے جو ان کی بھلائی کے درپے ہوتا ہے اسے ستایا جاتا ہے اور بالآخر اسے سعادت کی قربان گاہ کی بھینٹ چڑھایا جاتا ہے اس کی خدمات کی صحیح قدر و قیمت اس کی موت کے بعد لگائی جاتی ہے اور زمانہ گذرنے پر اس کی دعوت کی صحت واضح ہوتی ہے۔

۱۹۲۶ء میں مجھے آستانہ جانے کا اتفاق ہوا تھا اس وقت ان کی وفات پر ۲۱ برس گذر چکے تھے میں نے واجب سمجھا کہ ان جیسے بڑے آدمی کی قبر کی زیارت سے شاد کام ہو کر ان کی عظمت   اور اعمال کے سلسلہ کو یاد کروں۔ بہت سے لوگوں سے ان کی قبر جو پوچھی تو کوئی بھی نہ بتا سکا۔ ایک پٹھان جو مکتبہ شہید علی کا لائبریرین تھا اس نے جگہ بتلائی۔ میں اپنے دوست عبادی کو ساتھ لے کر بتاریخ ۸ جولائی ماچقہ گیا جو باسفورس کے دروازہ کے پاس ایک ٹیلہ تھا جس پر قبرستان تھا وہاں ایک فقیر نے شیخ کی تربت کی طرف راہنمائی کی پتہ معلوم ہوا کہ ان کی قبر ٹوٹ پھوٹ چکی ہے جن لوگوں کے لئے انہوں نے ساری عمر گنوائی تھی کسی نے بھی دھیان نہ دیا ایک امریکی مستشرق ۱۹۲۶ء میں آستانہ آیا اور سید صاحب کی قبر ڈھونڈ نکالی اور اس پر سنگ رخام کا مقبرہ تیار کرا دیا اس کے ارد گرد لوہے کا جنگلہ لگایا۔ کتبہ پر سید صاحب کا نام۔ تاریخ ولادت اور وفات کندہ ہے دوسری طرف یہ مرقوم ہے اس مزار کو مسلمانوں کے مخلص دوست مسٹر چارلس کرین نے ۱۹۲۶ء میں تعمیر کرایا ہے پھر یہ تک ان کی قبر کے پاس ٹھہرے رہے آہ! یہ جگہ نفوس کو زندہ کرنے والے عقلوں کو آزاد کرنے والے دلوں کو گرمانے والے قوموں کو بیدار کرنے والے۔ تاج و تخت کو ہلا دینے والے کی خوابگاہ ہے تھے سلاطین ان کی عظمت سے تھرتھراتے اور ان کی زبان اور رعب و داب سے ڈرتے تھے بڑے بڑے

لشکروں والی حکومتیں ان کی حرکت سے لرزہ براندام اور ان کی آزادی سے بڑے بڑے ممالک تنگدل رہا کرتے تھے جہاں کہیں گئے شعلۂ جوالہ بن کر رہے ۔ افغانستان ہو یا مصر ایران ہو یا پیرس ۔ لندن ہو یا آستانہ انہوں نے عربی اور ایرانی انقلاب کی تخم ریزی کی ۔ اجنبی حکومتوں کے مقابلہ پر تمام عالم اسلام کو آمادہ کیا اور اجتماعی اصلاحات کا مطالبہ کیا ۔ مصر میں استبدادی حکومت سے ٹکر لی ۔ ایران میں شاہ ناصر الدین کی مخالفت کی اور انگریزوں کی پیرس میں ۔ جہالت ناخواندگی اور ذلت کے خلاف مشرق میں اعلان جنگ کیا جاسوسی اور نفاق کے خلاف آستانہ میں لڑے اور موت کے سوا کوئی چیز ان کو مغلوب نہ کر سکی ۔

ہم نے ان کو جلیل القدر اور عظیم الشان سمجھا ان کی یاد ہمارے دلوں کو گرماتی ہے ۔ ان کی موجودگی اور زندگی کا کیا کہنا رحمہ اللہ ۔

مآثر

محمد پاشا المخزومی نے ان کے ملفوظات جمع کئے تھے ان سے نام رکھنے کے متعلق مشورہ کیا فرمایا ان کا نام خاطرات رکھو ۔ مخزومی کہنے لگے کہ بعض دوستوں نے کہا کہ یہ لفظ لغوی لحاظ سے غلط ہے مناسب ہے کہ ان کا نام خطرات یا خواطر رکھ دیا جائے کہنے لگے کہ نام خاطرات ہی رکھو ان لوگوں کی پرواہ نہ کرو جنکی زبان دماغ بگڑ چکی ہے اور وہ اجوف اور مہموز کے سوا کچھ نہیں جانتے اور اب ایک فقرہ بھی نہیں لکھ سکتے جو دل میں اتر جائے یا سننے والوں کے لئے وجد انگیز ہو ۔

جب مصر آئے تو ماسونیوں (Free Masons) کا پروگرام جو حریت ۔ اخوت اور مساوات کی دعوت دیتا تھا ان کو بہت بھایا آپ اس جماعت میں شامل ہو گئے ایک ممبر کے لئے چندہ کا اعلان ہوا سید صاحب نے پوچھا کہ کیا وہ مریض ہے؟ انہوں نے نفی میں جواب دیا پھر پوچھا وہ صحیح الجسم ہے؟ جواب ملا ہاں ۔ آپ نے فرمایا بدنی صحت اور سوال کی ذلت ایک شخص میں کیسے جمع ہو سکتی ہے ۔

جب مصر سے نکالے گئے تو ان کے دوست سویز تک ساتھ گئے اور بڑی رقم پیش کی ان سے درخواست کی کہ وہ یہ رقم قرض کے طور پر قبول کر لیں جواب دیا کہ تم کو اس مال کی زیادہ ضرورت ہے شیر جہاں جائے گا اپنا شکار خود ڈھونڈھ لے گا ۔

جب سلطان عبدالحمید نے ۱۸۹۲ء میں آستانہ آنے کی دعوت دی اور آپ وہاں گئے تو سلطانی خدام ان

کے انتظار میں تھے سید صاحب سے پوچھا کہ آپ کے اسباب کے صندوق کہاں ہیں؟ فرمایا کہ میرے پاس سوائے کتابوں اور کپڑوں کے صندوق کے کوئی شے نہیں ہے خادم نے پوچھا کہ آخر وہ کہاں ہیں؟ کہنے لگے کہ کتابوں کا صندوق سینہ میں ہے اور کپڑوں کا صندوق یہ ہے (اپنی پیشانی کیطرف اشارہ کر کے بتلایا)۔

سلطان عبدالحمید کے ہاں ان کی بکثرت آمد و رفت رہا کرتی تھی لوگوں نے اس کے متعلق رائے پوچھی تو کہا کہ اگر سلطان کا عصر حاضر کے چار ذہین ترین آدمیوں کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو وہ کاوت۔ چالاکی اور سیاست کے لحاظ سے ان کا پلڑا بھاری رہے گا خصوصاً ہم جیسوں کی تسخیر سے لہٰذا یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے کہ وہ دول مغرب کی پیدا کردہ مشکلات سے عہدہ برآ ہو جاتے ہیں ان کا بدترین دشمن بھی ان کی مجلس سے راضی اور مطمئن ہو کر نکلتا ہے چاہے وہ وزیر اور بادشاہ ہو یا امیر اور سفیر ہو لیکن ان میں ایک بڑا بھاری عیب ہے اور وہ بزدلی ہے۔

سلطان عبدالحمید نے ان کو شیخ الاسلام کا منصب پیش کیا تو آپ نے انکار کر دیا اور کہا کہ جب تک نظام حاضر نہ بدلا جائے گا وہ اس رفیع منصب کو منظور نہیں کر سکتے "دینی عالم کا فریضہ سرکاری عہدہ دار جیسا نہیں ہے بلکہ ارشاد و تعلیم ہے اس کے لئے تبحر علم کے ساتھ حسن عمل بھی ضروری ہے۔

سید جمال الدین ساری عمر اہل و عیال کے جھنجھٹ سے آزاد رہے اگر کوئی عیال کی کثرت اور آمدنی کی قلت کا رونا روتا تو بقدر استطاعت اس کی مدد کرتے سلطان نے انہیں قصر یلدیز کی خوبصورت لونڈی کا رشتہ پیش کیا تھا لیکن سید صاحب نہ مانے اس بارے میں ان سے پوچھا گیا کہ کیا وہ ابو العلاء المعری کے ہم نوا ہیں؟ سید صاحب نے جواب دیا کہ ہرگز نہیں ایک عقلمند آدمی شادی کو کیسے سنگین جرم خیال کر سکتا ہے جب کہ بقائے نوع اور عمران کی بقا کی حکمت کا انحصار اسی پر ہے میں حقوق زوجیت اور اس کے تقاضوں سے آگاہ ہوں اور چونکہ میں ان فرائض کی بجا آوری سے اپنے آپ کو قاصر پاتا ہوں اس لئے تجرد کی زندگی گذار رہا ہوں۔

ایک یہودی ڈاکٹر ان کا دوست تھا پوچھنے لگا کہ عدم علم کی بنا پر طبیعت کی مخالفت ایک انسان کیلئے کیسے جائز ہو سکتی ہے؟

سید صاحب مسکرائے اور کہا کہ انسانی طبیعت تم سے زیادہ مضبوط ہے وہ اپنے نفس کی نگہداشت کرتی رہتی ہے آدمی ایک چیز کو چھوڑ کر بھی زندہ رہ سکتا ہے

آپ سے کہا گیا کہ آپ سلطانی تحائف اور ہدایا از قسم مال تو قبول کرتے ہیں لیکن ایک خوبصورت باندی کا

عطا کیا جانا کیوں نامنظور کر دیا جواب دیا کہ جمال و منال کا عطیہ دیا جاتا ہے میں اس کا بدلہ اتار دیتا ہوں لیکن خوبصورت باندی کا بدلہ کیسے اتار سکتا ہوں۔ سید جمال الدین شیخ محمد عبدہ کی ذکاوت اور علم و فضل کے مداح تھے۔ انہیں "صدیقی الشیخ" کے لقب سے یاد کرتے۔ سید عبداللہ ندیم عمر کے آخری ایام میں سید جمال الدین کے ہاں اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ کہنے لگے کہ آپ شیخ محمد عبدہ کا اتنا ذکر کرتے ہیں کہ گویا آپ کا کوئی دوسرا دوست نہیں ہے۔ آپ دوسروں کو ہمارا ساتھی یا ہمارا شناسا کہہ کر پکارتے ہیں۔ سید صاحب مسکرائے اور کہا عبداللہ تم بھی میرے دوست ہو لیکن تمہارے اور شیخ محمد عبدہ کے درمیان یہ فرق ہے کہ انہوں نے مشکل کے وقت میرا ساتھ دیا ہے اور تم نے تونگری میں ..... یہ سن کر عبداللہ ندیم چپ ہو گئے۔

سید جمال الدین ڈارون کے نظریہ تنازع للبقاء کا استہزا کیا کرتے اور کہتے کہ مبدا تو تنازع للفنا کا ہے۔ غیر فانی بقا کی طلب میں تو کوئی تنازع اور نزاع نہیں ہے تنازع جو باقی ہے وہ فنا پذیر اشیاء کا ہے۔ متنازع۔ منازع اور منزوع سب ایک دن فنا ہونے والے ہیں لہذا تنازع للفناء کہنا زیادہ مناسب ہے۔

کہا گیا کہ کیا تمام متمدن عالم ایسی غلطی پر متحد ہو سکتا ہے۔ کہا کہ متمدن عالم کیا ہے؟ بڑے بڑے شہر ہیں اونچی اونچی عمارات ہیں عظیم الشان محلات ہیں جن میں مختلف کیمیاوی اجزا سے رنگا رنگ کا سوتی اور ریشمی کپڑا تیار ہوتا ہے۔ معدنیات کے ذخائر ہیں تجارت پر قبضہ ہے جس سے دولت کی ریل پیل ہے مہلک اور خوفناک ہتھیاروں کی تیاری میں ایک متمدن قوم دوسری قوم سے آگے بڑھنے کی کوشش میں ہے۔ اس کے ماسوا اور کون سا متمدن عالم ہے۔ اگر ہم علمی ترقیوں اور ان سے حاصل شدہ خوبیوں اور عمدگیوں کو کئی گنا دگنا تگنا کر کے ترازو کے ایک پلڑے میں رکھیں اور دوسرے میں جنگوں کی ہلاکت آفرینیوں کو تو علوم مدنیت اور تمدن کا پلڑا جھک جائیگا تو معلوم ہوا کہ یہ ترقی۔ علم اور تمدن جہل محض ہے اور حد درجہ کی وحشت ناکی ہے اور انسان حیوان سے بھی گرا ہوا نظر آتا ہے کیا کسی نے سنا ہے کہ تین لاکھ سانپ ایک دوسرے کے آمنے سامنے آ کر آپس میں لڑ مرے ہوں یا شیروں نے ایک صف میں کھڑے ہو کر ایک دوسرے کا گوشت نوچا اور خون پیا ہو؟ یہ کیسی تہذیب اور کہاں کا تمدن ہے بلکہ جہالت اور وحشت ہے۔ ان کے کئی حکیمانہ اقوال ہیں جو وہ مناسب موقعہ پر کہا کرتے تھے جب قسم کھاتے تو کہتے " وعزۃ الحق وسر العدل۔" حقائق اوہام سے زائل نہیں ہوتے۔ اگر انسان عمر کے تغیر اور بڑھاپے کو فضیلت سمجھے تو یہ اس کی نادانی ہے۔ فخریہ قول کو عملی بزرگی باطل کر دیتی ہے۔ طاقت کی ربوبیت پر ضعیف ہی ایمان لا سکتا ہے۔ ہم عصر اہل علم دوست نہیں ہوا کرتے۔ مقدمات کی طوالت نتائج کے سقیم ہونے کی دلیل ہے۔

جو کسی جرم یا گناہ کے بغیر کسی بادشاہ کو ڈرائے تو وہ درویش ہے۔ صاحب حاجت اگر اپنی حاجت کو بیان نہ کر سکے تو وہ گونگا ہے۔ ہزار باتیں ایک عمل کے برابر نہیں ہو سکتیں۔ صحت ضائع کرنا مال کے اسراف سے زیادہ ضرر رساں ہے۔ تنگی اور دباؤ سے منتشر اجزاء متحد ہو جاتے ہیں۔ خالی گنبد سے صدا پیدا ہوتی ہے۔ جاہل ڈینگیں مارے اور عقل مند چپ رہے تو سمجھو کہ زمانہ برا ہے۔ مشرق میں ادیب کی زندگی دو بھر ہے مرنے کے بعد اسے یاد کیا جاتا ہے۔ عقلوں کا اوہام سے مقید ہونا ہتھکڑی سے زیادہ ذلت آمیز ہے۔ مضبوط درخت دیر سے پھل دیتا ہے۔ عربی زبان کو بدوؤں نے صحرا اور جنگلات میں وسعت دی ہے شہریوں نے اسے تنگ دامن بنا رکھا ہے۔ علم نوجوانوں میں بھی ہو سکتا ہے لیکن تجربہ صرف بڈھوں کو ہوتا ہے۔

سر سید احمد خاں

١٨١٧ — ١٨٩٨

سرسید احمد خاں ہندوستان میں شیخ محمد عبدہ کے مشابہ ہیں جب وہ سید جمال الدین کو چھوڑ کر جلاوطنی سے مصر واپس آ گئے تھے دونوں کے نزدیک عقلی اصلاح تہذیب اور تثقیف سے عبارت تھی۔ دونوں کے نزدیک اصلاح مذہبی تعلیمات کو سہل اور آسان بنانے سے ہو سکتی تھی جس کا لازمی نتیجہ ملک کی آزادی میں ظاہر ہوگا کیونکہ ایک جاہل اور بے وقوف کو آزادی کیسے مل سکتی تھی آزادی کی بنیاد علم ہے اور علم دین اور دنیا کے معاملات کا نام ہے۔ جدید تمدن نے جو علوم پیدا کئے ہیں مثلاً طبیعات۔ کیمیا، ریاضیات۔ فلکیات۔ نفسیات۔ اجتماعیات۔ نظام حکومت وغیرہ ان علوم کے جاننے کا نام علم ہے اس سے دل زندہ اور عقل اوہام کی قید سے رہائی پاتی ہے۔ نفس کو روحانی غذا ملتی ہے۔ فکر تنومند ہوتا ہے اور مذہب اسلام کے اصولوں کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو وہ ان سب باتوں کا ضامن ہو سکتا ہے۔ اسلام علوم کی ترقی اور دنیا کے قوانین میں رکاوٹ نہیں ہے بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اسلامی تعلیمات سے دل زندہ ہوتا ہے اور انسان بھلائی کی طرف راغب ہوتا ہے۔ دونوں دیکھ رہے تھے کہ مصر اور ہندوستان میں سیاسی طاقت انگریزوں کے ہاتھ آ گئی ہے وہ اپنے مادی اسلحہ اور ذخائر سے بحر و بر پر حکومت کر رہے ہیں۔ ان کو وہ علمی اور سیاسی قوت حاصل ہو چکی ہے جس کی تاب مقاومت نہ ہندوستان کو ہے نہ مصر کو۔ تاب مقابلہ تو اتحاد سے ممکن ہے لیکن یہاں تو جہالت اور اخلاق کی کمزوری تھی جو ان کے امراء کو شخصی مصالح سے غرض تھی اس لئے مناسب تھا کہ انگریزوں سے سمجھوتہ کر لیا جائے اور افہام و تفہیم سے کام لیا جائے قوم کی بھلائی کے لئے جو کچھ ہو سکتا تھا اس کے لئے حکومت سے تعاون کیا جاتا تا کہ ان کو پتہ لگ جائے کہ وہ جن قوموں پر حکومت کر رہے ہیں ان کی عقلی اور مادی ترقی ان پر فرض ہے اور وہ ان کی جہالت اور فقر کے لئے جواب دہ ہوں گے روشن خیالی میں حاکم اور محکوم دونوں کا فائدہ ہے صلح صفائی سے جو کچھ مل سکے لے قوم کی رفاہیت پر خرچ کرنا چاہئے زمانہ گذرنے کے بعد اس کے اچھے نتائج برآمد ہوں گے۔

دونوں نے اس راہ میں مصیبتیں اٹھائی تھیں کیونکہ وطن اور آزادی کے دعویدار صلح اور صفائی کے لئے جلد تیار نہیں ہوتے اس کو وہ قومی خیانت خیال کرتے ہیں ان میں سے بعضوں کی رائے ہوتی ہے کہ گفتگو، مطالبات گذارنا

اور صلح جوئی جلاوطنی کے بعد ہو سکتی ہے انہیں رائے عامہ کی مخالفت کا ڈر رہتا ہے دوسری طرف جامد علماء کا طبقہ ہوتا ہے جو اجنبی تہذیب کے علوم و فنون کو مفسد سمجھتا ہے ان کا اعتقاد ہے کہ قوانین دنیا از قسم زراعت۔ اجتماع صحت اور مرض سب سبب اور مسبب پر مبنی ہوتے ہیں جن کا انکار قضا و قدر اور اولیا اور مشائخ کی روحانی اقتدار کا انکار کرنا ہوتا ہے یہ لوگ شیخ محمد عبدہ اور سر سید احمد خاں ...... پر لعن طعن کی بارش کرتے ہیں ان کی دعوت کو اپنے اقتدار کی راہ میں کانٹا خیال کرتے ہیں بعض دفعہ امرا بھی رجعت پسندوں کی مالی امداد کرتے ہیں کہ وہ مصلحین پر اپنے کیچڑ اچھالتے رہیں کہ انہوں نے اجنبی لوگوں سے کیوں مدد حاصل کی جا بالفرض اگر مصلحین ان کے سامنے دست سوال دراز بھی کرتے تو ان کو اس سے کوئی فائدہ نہ حاصل ہوتا مصر اور ہندوستان دونوں کا یکساں حال تھا کیونکہ اشیاء طبعی طور پر یکساں ہوتی ہیں اور قوانین فطرت میں اختلاف نہیں ہوا کرتا انگریزوں اور اجنبی استعمار کے معاملے میں دونوں کی رائے سید جمال الدین کی رائے کے برعکس تھی سید جمال الدین انگریزوں سے حد درجہ نفرت رکھتے تھے افغانستان ہندوستان مصر اور پیرس میں ان کے زخم خوردہ بن کر رہے تھے۔ اس پر ان کے بعض دوستوں نے ان کو ملامت کی اور کہا کہ آپ شخصیات اور قوموں پر حکم لگانے میں انصاف سے کام لیتے ہیں ان کی نیکیاں اور برائیاں گناتے رہتے ہیں لیکن انگلستان کے بارے میں آپ کا حال دوسرا ہے سید صاحب نے جواب دیا کہ انگریز سب سے زیادہ ترقی یافتہ قوم ہے عدل و انصاف کے مفہوم سے آشنا ہے اس پر کاربند بھی ہے لیکن صرف اپنے لوگوں کے معاملے میں پھر احباب کو ان کی کارستانیوں سے مطلع کیا جو انہوں نے ہند اور مصر میں کی تھیں۔ سید صاحب کی اجمالی رائے تھی کہ مشرق والوں نے اپنے املاک۔ اراضی اور ممالک میں مسرفانہ تصرف کیا ہے قضاء و قدر کو منظور تھا کہ ان پر مغرب مسلط ہو جائے لیکن مغرب کی مصلحت اسی میں ہے کہ مشرق والے بدا طوار اور بیوقوف بنے رہیں بلکہ اس کی آرزو ہے کہ وہ گمراہی اور اسراف میں بڑھتے جائیں تاکہ ان پر تسلط جما رہے۔ یہ تھا سید جمال الدین کا عقیدہ جس کا ہم نے ان کے حالات میں ذکر کیا ہے۔

سر سید احمد خاں اور شیخ محمد عبدہ کا خیال تھا کہ انگریز شریف اور معقول دشمن ہے۔ اس سے سمجھوتہ ہو سکتا ہے قوم کی بہبود کے لئے اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے جب قوم سمجھدار ہو جائے تو جملہ حقوق کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ جہالت اور غفلت سے کسی چیز کا حصول ناممکن ہے۔

○

سید احمد خاں سید محمد متقی خاں کے فرزند تھے ان کا خاندان شریف اور قدامت پسند تھا ان کے اسلاف عرب

سے ہرات اور ہرات سے دہلی اکبر شاہ کے عہد میں آئے تھے۔ سید احمد خاں کی پیدائش بتاریخ ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء ہوئی تھی جب ان کی عمر ۲۲ سال کی ہوئی تو ان کے والد انتقال کر گئے۔ انہوں نے اہل زمانہ کی عادت کے مطابق دینی تعلیم حاصل کی۔ ان کے خاندان والے انگریزوں کی ملازمت سے گریزاں تھے لیکن وہ گھر والوں کی مخالفت نظر انداز کرتے ہوئے دہلی میں قارق امین بن گئے پھر ترقی کر کے منصف بن گئے۔ فتح پور اور بعد ازاں بجنور میں رہے جب ۱۸۵۷ء کا غدر شروع ہوا تو بجنور کا ضلع باغیوں کی زد میں آ گیا جنہوں نے ریلوے لائن توڑ دی۔ انگریزوں کو قتل کیا اور جو چیز ہاتھ آئی تباہ کر دی۔ رائے عامہ بھی انگریزوں کے خلاف بھڑکی ہوئی تھی لیکن سر سید کے کوہ وقار میں جنبش نہ آئی ان کی رائے میں غدر بے فائدہ تھا جس کے بعد انگریزوں نے دوبارہ متمکن ہو جانا تھا اس سے جانبین کے جانی نقصان کے سوا اور کوئی فائدہ نہ تھا انگریزوں خاص کر شہری انگریزوں کا قتل غیر انسانی فعل تھا انہوں نے امکان بھر انگریزوں کی جانیں بچانے کی کوشش کی۔ ان کے اور ان کے ساتھیوں کی کوشش سے بہت سوں کی جانیں بچ گئیں لیکن انہیں بہت سا مالی نقصان اٹھانا پڑا اور ان کے رشتہ داروں کو تکالیف کا سامنا کرنا پڑا اور بہت سے جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ ان کی والدہ ان ہولناک صدمات سے وفات پا گئیں جب شورش دبی تو انگریزوں نے ان کے فضل و کمال کا اعتراف کیا ان کے احسانات کو یاد رکھا اور ان کی بہت کچھ مدد کی۔ اس وقت سے ان کے اور انگریزوں کے درمیان اتحاد کا رشتہ مضبوط ہو گیا جس سے انہوں نے نہ ہندوستانیوں کی حمایت کی ہے نہ انگریزوں کی۔ اس میں بعض انگریز اخباروں کی تردید کی ہے کہ بغاوت کی آگ افغانستان یا روس نے بھڑکائی تھی۔ اس قول کو انہوں نے بے حقیقت گردانا ہے بلکہ یہ لکھا ہے کہ غدر ایک عوامی تحریک تھی۔ لوگ کئی سالوں سے تکلیف میں مبتلا تھے اور حکومت حقیقت حال سے بے خبر تھی۔ رعایا کی تکالیف کا مطلقاً احساس نہ تھا برخلاف اس کے عوام حکومت کو متہم گردانتے تھے کہ اس نے ان کی تکالیف کے ازالہ کی کوئی کوشش نہیں کی۔ لوگوں کو خیال ہو چلا تھا کہ حکومت ان کے دینی عقائد اور مذہبی شعائر میں دخل دیتی ہے اور خفیہ طور پہ مشنریوں کی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ انہوں نے تمام اسباب کو بصراحت لکھا ہے یہاں ہم ان کی اصلاحی دعوت اور ان کے اعمال کا ذکر کرینگے۔ انہوں نے دیکھا کہ ان کے سات کروڑ ہم مذہب غربت، جہالت، تنگدستی اور پریشانی میں مبتلا ہیں۔ جو کوئی دینی تعلیم حاصل کرتا ہے تو اس سے نہ اس کی نظر میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ نہ زندگی کی کوئی امید۔ لوگ علما پرست تھے جنہوں نے رسوم کو دین سمجھ رکھا تھا اور اس کوشش میں تھے کہ اپنی تنگ نظری سے وسعت پذیر تمدن کو شکست دے دیں

یہ لوگ زمانہ اور زندگی کے تغیرات کے معترف نہ تھے علمی ترقی کا ان کو پتہ نہ تھا خود آنکھیں بند کر کے بیٹھے ہوئے تھے اور سارا عالم ان کے گرد موج زن مقاصد جدید تمدن کے نظم. وسائل اور مقاصد کو کفر خیال کرتے تھے مسلمانوں کو ضرورت نہ تھی کہ ان سے استمداد کریں یا ان کے کارپردازوں سے تعاون کریں وسیع ان کے نزدیک بے دینی تھی ہر شہر میں ایک ملا تھا جو ان کے ذہنوں پر چھایا رہتا تھا جب مشنریوں نے مدارس قائم کئے تو علماء نے ان مدارس کی تعلیم کو حرام قرار دیا خود ان کو ان جیسے مدارس کھولنے کی ہمت نہ تھی سرکاری مدارس کو بھی شجر ممنوعہ سمجھتے تھے ہندو اپنے بچوں کو ان مدارس میں تعلیم دلاتے تھے جس سے وہ کار گہ حیات کے لائق ہو کر سرکاری ملازمتیں حاصل کرتے تھے مسلمانوں کا ملازمتوں میں کوئی حصہ نہ تھا کیونکہ ان کے دینی مدارس زندگی سے الگ تھلگ تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کے محکموں خصوصاً بڑے عہدوں پر مسلمانوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی دینی اصلاح کی تحریکات جن کو بعض علمائے دین لیکر اٹھے تھے یا تو سلبی قسم کی تھیں جن کی علمی قیمت نہ تھی ۱۸۰؁ میں حاجی شریعت اللہ نے ایک اصلاحی جماعت بنائی جس کا یہ مقصد تھا کہ ہندوستان میں جمعہ کی نماز نہیں ہو سکتی کیونکہ ہندوستان دارالحرب ہے اس مسئلہ پر ان کا فکر۔ وقت اختلاف اور جدل مرکوز رہا اور اس میں بہت سے مسلمانان پنجاب[1] شامل ہو گئے تھے ۔

دوسرے مصلح سید احمدؒ تھے (۱۷۸۲ء۔ ۱۸۳۱ء) حج کرنے گئے تو محمد بن عبدالوہاب کے خیالات سے سرشار ہو کر لوٹے۔ عدم زیارت قبور کی دعوت دینے لگے اولیاء کی شفاعت کے منکر تھے کہتے تھے کہ ہندوستان دارالاسلام نہیں بلکہ دار حرب ہے لہذا مسلمانوں پر جہاد واجب ہے اس پر ان کے پیروؤں کا حکومت انگریزی[2] سے تصادم ہوا لیکن ان کی قربانیوں کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا

اس قسم کے حالات سے سرسید احمد خاں ناخوش تھے وہ سوچ رہے تھے کہ اس جہالت۔ تنگ نظری۔ تنگ دستی اور بدحالی کی کیا وجہ ہے ان کی گہری سوچ نے اس کا علاج تعلیم بتلایا ۱۸۵۷ء کے غدر نے عقل مند مسلمانوں پر واضح کر دیا تھا کہ انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دیکر دیگر قوموں سے پیچھے نہیں رہنا چاہیئے اس غور و فکر کا نتیجہ علی گڑھ کی وہ اصلاحی تحریک تھی جو مسلمانان ہند کی تاریخ میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ سرسید احمد خاں اپنی قوم سے مخاطب ہو کر کہتے کہ انگلستان کی طرف دیکھو تعلیم سے ان کی قومی ثروت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے صدیوں پہلے ان کے راستہ میں بے شمار مشکلات حائل تھیں وہاں نہ ریلوے لائن تھی نہ طباعت کے لئے میکانکی آلات تھے

۱؎ یہ بنگالی تحریک تھی مترجم ۔ ۲؎ حکومت انگریزی سے نہیں بلکہ سکھوں سے

لیکن ان کے پاس وسعت نظر اور قوت ارادہ تھی اگر ۱۸۵۷ء میں ہندوستانی اپنی اور انگریزوں کی قوت کا صحیح اندازہ کر لیتے اور معاملات کے نتائج سوچ لیتے تو غدر کا المیہ نہ پیدا ہوتا اس فتنہ کی جڑ جہالت ہے۔

۱۸۶۱ء میں سر سید علی گڑھ میں سب جج تھے تو انہوں نے ایک علمی اور ادبی انجمن قائم کی جس کی غرض تاریخ اقتصادیات اور دیگر علوم کی جدید آراء کی اشاعت تھی اور ان موضوعات کی اہم کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنا تھا ان کی یہ رائے تھی کہ ان علوم کی تعلیم انگریزی میں ہی حیثیت سے محدود طبقہ فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس سے ملک کو اچھی طرح فائدہ تبھی ہو سکتا ہے کہ انگریزی علوم و فنون کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کر دیا جائے۔ وہ اگرچہ انگریزی زبان اور انگریزی ثقافت کے جان دادہ تھے لیکن عوام کے فائدہ کیلئے کوئی چیز بھی

لیکن علماء اور قدامت پسندوں نے شورش کی ان کو فسادِ عقل فساد دین اور فساد وطن کا طعنہ دینے لگے اس معرکہ میں ان کی جماعت کامیاب رہی اور بالآخر غازی پور میں ایک مدرسہ کا سنگ بنیاد رکھنے میں کامیاب ہوئے

۱۸۶۹ء میں اتفاق سے حکومت انگریزی نے ان کے لڑکے سید محمود کو سرکاری وظیفہ پر بغرض حصول تعلیم انگلستان بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ سر سید احمد خاں نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا اور سید محمود کے ہمراہ انگلستان چلے گئے۔ جہاز میں ان کے ساتھ عجیب و غریب واقعات پیش آئے جو انہوں نے بیان کئے ہیں۔ دین کے بارے میں انہوں نے اپنے انگریز دوستوں سے جو گفتگو کی تھی وہ ان کی دینی حمیت اور وسعت عقل پر دال ہے۔ جب جہاز جزیرہ عرب کے ساحل سے گذر رہا تھا تو ان کی خوشی و مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی تھی کیونکہ یہاں آنحضرت صلعم کی بعثت ہوئی تھی۔ انگلستان پہنچ کر بہت سے اکابر سے ملے۔ ان میں طامس کارلائل بھی تھا سر سید احمد خاں نے اس سے آنحضرت صلعم کے متعلق دیر تک گفتگو کی۔ کارلائل نے اپنی کتاب البطال اور البطال پرستی میں جو عمدہ فصل آنحضرت صلعم کے بارے میں لکھی ہے اس میں یہ اثر محمود نمایاں ہے۔ سر سید نے انگلستان کے نظام تعلیم و تربیت کا بھی مطالعہ کیا ان کی دلچسپی خواص کو چھوڑ کر عوام کے طرز تعلیم و تربیت پر مرکوز تھی۔ ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب۔ انہوں نے دیکھا کہ وہاں کے ملازم بھی لکھ اور پڑھ لیتے ہیں گاڑی بان بھی اخبار بینی کے شوقین ہیں سواریوں کے انتظار میں اخبار پڑھ لیتے ہیں آخر کار ان کو قائل ہونا پڑا کہ جو لوگ ہندوستانیوں کی اصلاح چاہتے ہیں انہیں چاہئے کہ یورپی علوم و فنون کو دیسی زبان میں منتقل کرنے کا نصب العین بنائیں۔ کہتے تھے کہ میں آئندہ نسل کی یادداشت کے لئے اس رائے کو کوہ ہمالیہ پر بڑے موٹے موٹے حرفوں سے لکھ دینا چاہتا ہوں۔ مغرب کی ترقی کا راز یہ ہے کہ وہاں کے لوگوں نے علوم و فنون اپنی زبان میں حاصل کئے ہیں اگر انگلستان کا ذریعہ تعلیم لاطینی یا یونانی یا عربی یا فارسی زبان ہوتا تو اہل انگلستان بھی ہندوستانیوں کی طرح جاہل رہ جاتے۔

شائد قاری کے ذہن میں بلاد عربیہ کی حالت پھر جائے اور کہنے لگے کہ کتابی اور عامی عربی کیوں نہ ایک زبان بن گئی اور علوم و فنون عامی زبان میں نہ منتقل ہو سکے جو کہ گھروں ۔ بازاروں اور لین دین کی زبان ہے اس کے بغیر حقیقی اصلاح کی کیسے امید ہو سکتی ہے۔ خداوند تعالیٰ میرے استاد علی بک فوزی کا بھلا کرے۔ میں آستانہ میں ان سے ملا اور دیر تک ملاقات رہی میں ان سے ترکی انقلاب اس کے نتائج۔ اس کے محاسن و مساوی کے متعلق دیر تک سوالات کرتا رہا۔ ایک دن کہنے لگے کہ کاش تم ترکی زبان سیکھ لیتے کیونکہ اس کا ادب بلند پایہ ہے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ترکوں نے اپنی زبان و ادب سے کام لے کر اپنے معاملات کی کس طرح اصلاح کی ہے پھر کہنے لگے مصر کی اصلاح اسی صورت ممکن ہے جب کہ علم اور بول چال کی زبان کو ایک کر دیا جائے اس سے فکر صحیح اور عوام کی ترقی ہو سکے گی۔

میں ایک دفعہ مصر کے ایک بڑے ادیب سے مشرق کے ایک بڑے آدمی کا تعارف کرا رہا تھا اس نے مجھ سے حیرت انگیز سوال پوچھا کہ وہ مصری ادیب عوام کے لئے لکھتا ہے یا خواص کے لئے ۔ پھر پوچھا تو عوام کے لئے کون لکھتا ہے میں نے پھر جواب دیا کہ کوئی نہیں انہوں نے یہ سن کر نہایت افسوس ظاہر کیا۔

سر سید احمد خاں نے عوامی مدارس اور انگریزی یونیورسٹیوں میں نظام تعلیم کا خاص طور پر مطالعہ کیا۔ کہتے تھے کہ انگلستان کے مدارس میں طالب علم پرورش پاتا ہے اور مہذب بنتا ہے لیکن ہندوستان کے مدارس میں متعلم بنا رہتا ہے تربیت اور تعلیم میں بڑا فرق ہے ایک نوجوان ہندوستانی یونیورسٹیوں میں بہت سی محرک جذبات چیزیں دیکھ کر اخلاق باختہ بن جاتا ہے کیونکہ ان یونیورسٹیوں میں اخلاق، رسم و آداب اور دین کا کوئی اہتمام نہیں ہے استادوں اور مدرسوں کا اعتقاد ہے کہ اسباق دینے کے بعد ان کے فرائض ختم ہو جاتے ہیں نوجوانوں کی غرض مقصود سرکاری ملازمتیں رہ جاتی ہیں ان کو نہ اپنے نفس کے فرائض کا دھیان رہتا ہے نہ قوم کا۔

پس یہ نظام تعلیم قابل تغیر ہے اور مسلمانوں کے لئے خاص نظام تعلیم کی ضرورت ہے۔

(۲)

سر سید احمد خاں انگلستان سے لوٹے تو ہندوستانی مسلمانوں کی عقلی ۔ دینی ۔ لغوی ۔ خلقی اجتماعی اصلاح کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا وہ جہالت اور جمود سے جنگ کرنے کا ارادہ کر کے اٹھے تھے اور چاہتے تھے کہ جیسا بھی ہو سکے ہندوستانی مسلمان جدید علوم و فنون کو اچھی طرح قبول کریں اور ان سے ترقی حاصل

کرنے کا کام یہی اسلام اور جدید تمدن میں توافق پیدا کریں کیونکہ اسلام جوہر اور اصل کے لحاظ سے عقل پسند ہے۔ لی احکام کے قبول کر لینے کے لئے اس کا سینہ کشادہ رہتا ہے اگر زوائد اور الحاقی تعلیمات سے اس کو الگ کر دیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ مسلمان جدید علم کو بغیر کسی پس و پیش کے قبول کریں انگلستان سے واپسی کے بعد ان کا مقصد اولین ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ایک ایسی یونیورسٹی کی تاسیس تھا جسطرح انگلستان میں آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیاں ہیں یہ یونیورسٹی پہلے خاص آدمیوں کی تربیت کرے گی اور یہ خاص آدمی عوام کی تربیت کریں گے وہ اسی دھن میں لگے رہے چندہ جمع کرتے رہے راہ کی مشکلات و عوائق کا مقابلہ کرتے رہے آخرکار مشہور و معروف علی گڑھ یونیورسٹی قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے ان کے نزدیک یونیورسٹی کی تین اغراض تھیں

۱۔ بلا کسی تعصب و جمود کے مسلمانوں کو مغربی و مشرقی ثقافت کی تعلیم دینا۔

۲۔ طلبۂ کی حیات اجتماعی کا اہتمام تاکہ وہ بڑے بڑے شہروں کے مفاسد سے بچے رہیں جس سے طلبۂ کے والدین کو اطمینان ہو گا کہ ان کے لڑکے اچھی سوسائٹی میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں جو ان کے آداب کو ترقی دینے میں کوشاں ہے۔

۳۔ کالج میں تعلیم کے ساتھ عقلی ترقی۔ تربیت بدنی اور تہذیب خلقی کا انتظام دوسرے الفاظ میں تعلیم کے ساتھ تربیت بھی غرض مقصود ہو گی۔

جب کالج بن چکا اور طلبہ داخل ہو چکے تو ان کو لائحہ عمل کے مطابق تعلیم دی جانے لگی اس تعلیم سے مسلمانوں کی جدید نسل تیار ہو کر نکلی جو وسعت عقل کے ساتھ مذہب میں بھی روادار تھی اس کالج کے فارغ التحصیل سارے ملک میں کالج کا پیغام یعنی روشنی پھیلا رہے تھے لفظ علی گڑھ ایک کالج یا یونیورسٹی کا نام نہ تھا بلکہ خلقی اور اجتماعی اعتبار سے ایک امتیازی نشان تھا۔

بعض وطن پرور مسلمانوں نے اس کالج کے تعلیم یافتگان پر مواخذہ کیا تھا کہ وہ باوجود علم و فضل کے سیاست میں حصہ نہیں لیتے اور نہ ہی وہ ہڑتالوں وغیرہ میں حصہ لیتے ہیں لیکن سرسید نے جو رنگ قائم کر دیا تھا وہ قائم رہا یعنی علم پر توجہ اور سیاست سے دوری۔

جب وہ کالج کے دھندوں سے فارغ ہوئے تو انہوں نے ایک ماہانہ رسالہ تہذیب الاخلاق کے نام سے جاری کیا جس میں اجتماعی اور دینی مشکلات کا جرأت اور صراحت سے حل پیش کیا جاتا تھا انہوں نے قرآن پاک کی تفسیر بھی لکھنی شروع کی تھی کہتے تھے کہ اگر قرآن کو اچھی طرح سے سمجھا جائے تو وہ عقل کا ساتھ دے سکتا ہے کیونکہ صحیح نظریے

حرفوں سے زیادہ روح پر اعتماد ہو سکتا ہے اور قرآن کی تفسیر عقل اور ضمیر کی روشنی کے مطابق ہونی چاہیئے۔ ان کی یہ رائے راہ صواب سے متجاوز ہے کہ وحی بالمعنی ہے اور لفظی نہیں ہے اس بارے میں وہ بعض علمائے متقدمین کے پیرو تھے جن کی آراء امام سیوطی نے اتقان میں نقل کی ہیں "بعضوں نے ذکر کیا ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام معانی لے کر اترتے تھے اور آنحضرت صلعم ان معانی کو سمجھ کر ان کی عربی زبان میں تعبیر کر دیا کرتے تھے" اس نظریہ کے قائل بظاہر اللہ تعالیٰ کے اس قول سے تمسک کرتے ہیں "روح الامین نے اس کو تمہارے قلب پر اتارا تھا" (اتقان جلد اول ص ۵۴ مطبع کنشلیمہ) اس سے علمائے دین میں ہیجان پھیلا اور عوام نے شورش کی ان کی زندگی خطرہ میں پڑ گئی ایک آدمی نے خنجر سے بھی حملہ کر دیا لیکن وہ معجزانہ طور پر بچ گئے اور وہ لگی لپٹی رکھے بغیر نہایت ثابت قدمی سے اپنے کام میں لگے رہے ان کو نہ تنقید کی پروا تھی نہ قتل کی دھمکی سے خطرہ تھا۔

اگر وہ اپنے مذہبی افکار کی اشاعت میں نڈر تھے تو سیاسی معاملات پر بھی بے لاگ رائے زنی کیا کرتے تھے ان کا اعتقاد تھا کہ ہندوستانی ایک قوم ہیں اور ہر ایک فرد کو اپنے اپنے مذہب کا حلقہ بگوش رہنا چاہیئے جس کا متحدہ وطنیت پر کوئی اثر نہ پڑے ہر قوم اپنے اپنے مذہب پر قائم رہ کر وطنیت میں حصہ لے۔ ملکی آزادی تب ہی حاصل ہو گی جب دین کو عقیدہ میں منحصر کر دیا جائے اور ہر فرد اور فرقے میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا کر دیا جائے وہ کہا کرتے تھے کہ ہندوستان کئی طبقوں میں منقسم ہے اور یہاں بے شمار دینی عوامل سرگرم کار ہیں لوگوں میں ابھی تک صحیح قسم کی تعلیم نہیں پھیلی جس کی بدولت یہ ایک دوسرے سے انصاف کر سکیں میرا اعتقاد ہے کہ مجالس کے انتخاب اور نمائندگی میں نفع سے زیادہ نقصان ہو گا اس بنا پر وہ سیاسی مجالس میں شرکت سے اجتناب کرتے رہے بعض سیاسی لیڈر ان پر غضبناک ہوئے لیکن دینی علماء کی طرح انہوں نے ان کی بھی پرواہ نہ کی وہ تعلیم کی مجلس اعلیٰ اور وائسرائے کی کونسل کے ممبر رہے اور علی گڑھ کالج کی خدمت کرتے رہے۔ ان کی فائدہ مند سوچ بچار سے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد پڑی ہندوستان کے مختلف گوشوں سے اکابر مسلمان جمع ہوتے اسلامی معاملات پر تقریریں کرتے مسلمانانِ ہند کی پستی کے اسباب بتلاتے اور ان کے ازالہ کی تدابیر سوچتے اور اس کے بعد مفید قراردادیں پاس کرتے اس سے غرض وحید مسلمانان ہندوستان میں الفت پیدا کرنی تھی اس کام میں انہیں خوب کامیابی ہوئی اپنی وفات سے پانچ برس قبل انہوں نے اس تعلیمی کانفرنس کی صدارت کی تھی اس کے بعد ان کے رفقاء اور ہم خیالوں کی سرکردگی میں یہ کانفرنس ہوتی رہی۔

ان کی زندگی اور موت کے بعد بھی ان کی روح اس کانفرنس میں کام کرتی رہی اس کے مقاصد میں مغربی تمدن

میں سے اچھی چیزوں کا انتخاب کرنا تھا خاص کر علوم و آداب " کل مشرق سے علم کا نور طلوع ہوا تھا لیکن آج مغرب سے اس کی ضیاء پاشی ہو رہی ہے لہٰذا ہم پر واجب ہے کہ یورپ سے علوم و تمدن لے کر زمانہ کے ساتھ ساتھ میدانِ حیات میں رواں دواں ہوں لیکن شرط ہے کہ مسلمان شخصیت اور دین کو بھی تھامے رہیں جہالت سے یہ چیزیں کھو جاتی ہیں " زمانہ ماضی میں تعلیم صرف دینی ہوا کرتی تھی دنیاوی معاملات سے اس کو کوئی سروکار نہ تھا کیا ہی اچھا ہو اگر دین و دنیا کو مجتمع کر دیا جائے " اب علم نے نیا مذہب اختیار کر لیا ہے اب ارسطو کی طبیعات - ابن سینا کے نظریات - خیام کا جبر و مقابلہ ابن جابر کا کیمیا کس شمار میں ہیں ہاں تاریخی حیثیت سے ان کو پڑھایا جا سکتا ہے - کانفرنس سے وہ تعلیمی معاملات اور اس کے نصاب پر تنقید و تبصرہ کا کام لیتے ان کا نصب العین علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی کے درجہ پر پہنچانا تھا تاکہ ممالک اسلامیہ سے طلباء آ کر اس منبع العلوم سے اپنی پیاس بجھائیں بعید نہیں کہ آج بھی ابن سینا اور ابن رشد جیسے عالم پیدا ہو سکیں جو مباحث تجارب کیمیاویہ - طبیعیہ - فنون عصریہ میں علمائے سلف کی یاد تازہ کر دیں ملک میں ابن موسیٰ اور طوسی کی طرح محقق پیدا ہوں جو جدید آلات کی اختراع کریں سیاروں کا انکشاف کریں ان کی منزلوں کی حد بندی کریں اور جدید علم ہیئت پر کتاب تالیف کر دیں -

ہم چاہتے ہیں کہ ہماری اولاد حضرات - اوہام فاسدہ اور عادات سخیفہ کو چھوڑ کر آزادی کے عالم میں پرورش پائیں -

تم علم کو لازم پکڑ لو اگر کچھ حاصل کرنا چاہتے ہو تو قدیم عادات اور برے اخلاق سے کنارہ کش ہو جاؤ جادۂ حیات میں علم کی روشنی میں چلو -

ہم پر لازم ہے کہ علوم و فنون کی تحصیل اور اختراع عمل میں مغربی قوموں کے دوش بدوش چلیں یہی چیزیں ہمیں غربت اور جہالت سے نجات دے سکتی ہیں - زندگی کی دوڑ میں کامیابی کے لئے ان کی ہمسری ضروری ہے -

یہ اقوال ان کے ساتھیوں کے تھے جنہوں نے ان کے کام کو جاری رکھا اور وہ ان کی تعلیم و روح سے سرشار تھے -

ان خطبات کے لئے ملاحظہ ہو اخبار المؤید ۱۹۰۱ء و ۱۹۰۲ء - وہ تمام عمر مسلمانوں کی حمایت میں لڑتے رہے - ادھر ان پر کفر - الحاد اور وطن دشمنی کے تیروں کی بارش ہوتی رہی اور کہا گیا کہ وہ انگریزوں کے آلہ کار ہیں لیکن وہ صبر سے یہ طعن و تشنیع برداشت کرتے رہے جو کوئی ان کا راستہ روکتا اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ان کی رائے میں مسلمان بیمار تھے وہ جب تک عافیت کا مزہ نہ چکھ لیں مرض کا اچھی طرح سے اندازہ نہیں کر سکتے مزید یا کھانا کھانے

ان کو غربت۔ بدحالی کا احساس ہو سکتا ہے پس لازم ہے کہ تندرستی اور امارت کا مزہ چکھیں تاکہ وہ بیماری اور غربت کا تدارک کر سکیں۔

مسلمانان ہندوستان نے جلد ہی دیکھ لیا کہ علی گڑھ کی تحریک نے ایک نئی فکری تحریک کو جنم دیا ہے ایک نئی پود معرض وجود میں آ رہی ہے جو عقل مند و مفکر۔ مہذب اور زندگی کا صحب حال ہے جدید اسلوب کے ساتھ کتابیں تالیف کر رہی ہے اور مسلمانوں کی زندگی میں نیا خون دوڑ رہا ہے تو ان کو یقین آ گیا کہ سر سید احمد خاں بجائے مصیبت اور تکلیف کے نعمت اور برکت کا سرچشمہ ہیں اگرچہ ان کو ان کی بعض آرائے سے اختلاف تھا سر سید نے اردو ادب کی اصلاح کا بھی بیڑا اٹھایا ان سے قبل اردو زبان پر عربی کی طرح اندھیر چھایا ہوا تھا عشق و محبت اور مدح سرائی اس کا سرمایہ تھا اسلوب بیان بلند بانگ اور پیچ باطن تھا انہوں نے اسکو نئے آفاق سے روشناس کرایا اب اردو زبان میں سیاست۔ اجتماع اخلاق۔ دین۔ تاریخ اور ادب پر مضامین ایسے سنجیدہ طرز تحریر میں لکھے جانے لگے جو خالی از تصنع تھا اور جس میں زور بیان سلاست۔ صفائی۔ وسعت اور معنوں کی کثرت تھی۔

سر سید احمد خاں اوائل عمر میں ناقابل التفات شاعر بھی رہے تھے لیکن جب انہوں نے نثر کی طرف توجہ کی تو انہیں حیرت انگیز کامیابی حاصل ہوئی پہلے وہ سید الاخبار میں مضامین لکھا کرتے تھے اس کے بعد انہوں نے تہذیب الاخلاق نکالا اس کی زبان کی بہت سے انشاپردازوں اور اخبار نویسوں نے تقلید کی اور نئے موضوعات پر خامہ فرسائی ہونے لگی اس طرح اردو ادب نے ترقی کی طرف قدم بڑھانا شروع کیا ایک جگہ لکھتے ہیں "میں نے اردو زبان کے ذریعہ سے علم و ادب کو پروان چڑھانے کی امکانی کوشش کی ہے میں نے ایسا اسلوب بیان پسند کیا ہے جس میں سہولت اور جزالت دونوں شامل ہیں تعقید اور تکلف کا گذر نہیں بھاری بھرکم الفاظ اور خیالی استعارات و کنایات جو دل تک پہنچ نہیں سکتے ان سے پرہیز کیا ہے۔ جو کچھ میں نے لکھا ہے۔ اس میں پڑھنے والے کو شوق دلانے اور اپنے جذبات و احساسات کو اس تک پہنچانے کی امکان بھر کوشش کی ہے۔

ان کی تحریر کے موضوع متعدد ہوا کرتے تھے وہ ہر موضوع کو اتنا کھول کر بیان کرتے کہ اس کے تمام گوشے نظر کے سامنے آجاتے انہوں نے لوگوں کو ادب اردو کی طرف توجہ دلائی غیر ملکی ادب کے شہ پارے اردو میں منتقل کرائے اردو میں ترجمہ کرنے کے متعلق ان کی رائے نئی تھی ان کی رائے میں لفظی پابندی سے اسلوب بیان سست پڑ جاتا ہے وہ کہتے تھے کہ مطالب کو اچھی طرح سمجھ کر ایسے نئے پیرایہ میں پیش کر دینا چاہیے جو ہندوستانیوں کے ذوق اور افکار کے مطابق ہو اس وقت اردو میں علمی اصطلاحات کا فقدان تھا زبان کی صفائی کے ساتھ ساتھ انہوں

نے وضع اصطلاحات کی بھی کوشش کی آج بہت سے طالب علم ان کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔

ہندوستان کے بڑے عالم استاذ شبلی النعمانی لکھتے ہیں "لبسا اوقات دینی آراء کے معاملہ میں میرا اور ان کا شدید اختلاف ہو جایا کرتا تھا اور میں ان کے مرقومات کا ابطال کیا کرتا تھا لیکن باوجود اس کے ان کے اسلوب بیان کا جس سے کام لیکر وہ اپنے افکار کی تشریح کیا کرتے تھے مداح ہوں ان کا طرز تحریر بے نظیر اور شیریں بیاں تھا جس میں فکاہت اور ظرافت کی آمیزش ہوتی۔

ایک دفعہ مولوی علی بخش نے ان کی بُری طرح خبر لی تھی مولوی صاحب حج کرنے گئے اور علماء مکہ سے ان کی تکفیر کا فتویٰ لے آئے اس پر سر سید احمد خاں نے تہذیب الاخلاق میں لکھا "میرا الحاد بھی کتنا عجیب ہے مجھے تو کافر بنا دیا اور اس کو مومن اور حاجی میں اسکا فتویٰ دیکھنے کے لئے بے چین ہوں اس کے شروع میں لکھا تھا "چوں بُت خانہ خراب می گردد کعبہ مے شود" میرا الحاد اس بارش کی طرح ہے جس سے باغوں میں گلاب پیدا ہوتا ہے اور وادیوں میں خار و خس تہذیب الاخلاق کو بند کرتے ہوئے انہوں نے آخری نمبر میں لکھا "میں نے قوم کو جگانے کے لئے دروازہ پر دستک دی ہے اگر وہ جاگ اٹھے تو یہی میری مراد ہے اگر وہ اٹھ کر ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارنے لگے تو یہ امر مجھے ناپسندیدہ ہوگا لیکن اس سے مستقبل میں بیداری کی توقع رکھی جاسکتی ہے خدا کرے کہ ایسا ہی ہو جب ماں بچے کو مریض دیکھتی ہے تو اسے کڑوی دوا اصرار سے پلاتی ہے میں بھی مریض بچوں کو چیخ چیخ کر دوا پلاؤں گا کہ وہ گھونٹ گھونٹ کر کے دوا پی لیں بغیر کھائے پیئے کہ زندگی کی کس طرح امید رکھی جاسکتی ہے وہ دروازہ کھٹکھٹاتے گئے اور بجبر دوا پلاتے گئے یہاں تک کہ لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ ان کی لغوی عقلی اور تعلیمی ترقی کے لئے کوشاں ہیں خوردان کے دینی افکار قابل سرزنش ہوں اور وہ خود سیاست سے بے تعلق ہوں۔

جب وہ پنجاب آئے تو ان کا شاہانہ اور فاتحانہ استقبال ہوا جس سے وہ سابقہ کلفتیں بھول گئے

اکاسی برس کی عمر میں وہ اپنے خالق سے جا ملے انگریزوں ہندوؤں اور مسلمانوں نے عقائد مذاہب اور سیاست کے اختلاف کے باوجود ان کا ماتم کیا ان کی دلیری مخالفین سے بے پروائی اور خلوص کی یاد لوگوں کو رہ رہ کر آتی تھی وہ انگریزوں کے غرور اور تمکنت اور قوم کی پستی کے ناقد تھے علماء کے جمود اور سیاسی مدبروں کی خیال آرائیوں کو ناپسند کرتے تھے قوم ماتم کناں تھی کہ وہ عملی مصلح تھے نرے مفکر نہ تھے اپنے افکار اور مبادیات کو عمل میں لانے کی سر توڑ کوشش کرتے یہی ان کا امتیازی وصف تھا جو مصلحوں میں النادر کالمعدوم کی حیثیت رکھتا ہے اسی بنا پر ان کی اصلاح کا نتیجہ عملی شکل میں ظاہر ہوا آج مسلمانان ہندوستان نے علمی۔ فکری۔ خلقی اور ادبی لحاظ سے بڑی ترقی کی

ہے ان میں زندگی کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے اگر ہم کہہ دیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ نے ان کی زندگی کی بدولت ایک نیا رخ اختیار کیا ہے تو یہ سچائی سے بعید نہ ہوگا

ہم بعض مصلحین میں ایک بڑا عیب دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے جانشین ذکار کی اچھی طرح تربیت نہیں کرتے اسکا سبب یہ ہے کہ ان کو اپنی شخصیت پر اتنا اعتماد ہوتا ہے کہ وہ دوسری شخصیت کو اپنے علاوہ ابھرتے ہوئے دیکھنا پسند نہیں کرتے ان کے ارد گرد ایسی کمزور شخصیات جمع ہوجاتی ہیں جو ان کی خوشامد اور چاپلوسی میں لگی رہتی ہیں اور اس کے اعمال و اقوال وعظمت کی بدولت پرورش پاتی ہیں ان کی قومی شخصیات دور رہتی ہیں ان کی خودرائی دوسرے کی بات نہیں مانتی یا اگر مانتی بھی ہے تو منافقت کا اظہار کرتی ہے لیکن ایسے لوگوں کے مرنے سے ان کی دعوتی اصلاح بھی مرجاتی ہے جسکا تذکرہ تاریخ کے اوراق میں رہ جاتا ہے لیکن سر سید احمدخاں دوسری قسم کے آدمی تھے وہ اپنی آراء اور افکار کے اظہار میں بلند آہنگ تھے عمل میں دلیر تھے لیکن اس کے ساتھ ہی بردبار اور شریف ناقد تھے انہوں نے اپنے ہمراہیوں کی اچھی طرح تعلیم و تربیت کی تھی اپنے دوستوں اور شاگردوں کی رائے سنتے تھے ان کو اظہار رائے کا موقع دیتے تھے اس واسطے ان کے بعد ان کے دوستوں نے ان کے ناتمام کام کی تکمیل کی ان کی اصلاحی تحریک کے علم کو تھامے رکھا ان کے تعلیمات کی اصلاح کی انہیں مولوی چراغ علی اور سید امیر علی قابل ذکر ہیں۔

○

سید امیر علی

سید امیر علی سر سید کی طرح علمی مصلح تھے بلکہ زندگی کے حقائق اور واقعات کا ان سے زیادہ صحیح اندازہ لگاتے تھے۔

سید امیر علی انگلستان میں سر سید احمد سے مل چکے تھے پھر ہندوستان آکر دوبارہ ملاقات کی ہندی مسلمانوں کی اصلاح کے بارے میں سر سید سے اختلاف بھی رکھتے تھے سر سید کی رائے تھی کہ سیاست میں حصہ لئے بغیر اصلاح کا ذریعہ صرف تعلیم و تربیت ہو سکتا ہے سید امیر علی کہتے تھے کہ تربیت ترقی کا صحیح راستہ ہے لیکن مسلمانان ہند کے سیاسی معاملات پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی ہستی مٹ جائے گی بنا بریں مسلمانوں کی سیاسی تنظیم اور طریق کار کا تعین بھی ضروری ہے لیکن سر سید احمد تعلیم کی رٹ لگائے جاتے تھے لہذا دونوں نے الگ الگ راستے اختیار کرلئے سید امیر علی نے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ اور سیاست میں حصہ لینے کے لئے محمڈن ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی اور سر سید احمد کو شرکت کی دعوت دی لیکن وہ نہ مانے۔

سرسید کی زندگی کے آواخرِ ایام میں مسلمانوں نے بعض واقعات کی بنا پر سید امیر علی کے موقف کو صحیح سمجھتے ہوئے مسلم لیگ کی تاسیس کی۔

سید امیر علی مشرقی اور مغربی ثقافتوں کے عالم تھے شروع میں عربی اور فارسی کی تعلیم پائی تھی زمانہ شباب میں بعض انگریز ادباء سے بھی میل جول رکھتے تھے انگریزی ادب کا وسیع اور گہرا مطالعہ کیا تھا شیکسپیر کے ڈرامے۔ ملٹن کی فردوس مفقود شیلے۔ کیٹس۔ بائرن اور مور کے کلام پر گہری نظر تھی۔ والٹر سکاٹ کے ناولوں اور گبن کی تاریخ زوالِ روما وغیرہ پڑھ چکے تھے اس کے علاوہ انگلستان جانے سے قبل قانون کی ڈگری بھی حاصل کر لی تھی سرکاری وظیفہ پر انہیں انگلستان جانے کا موقع ملا تو انہیں ادب اور تاریخ کے مطالعہ کی فرصت ہاتھ آئی پھر وہ اپنی ذاتی شخصیت۔ شرافت اور خاندانی وجاہت کی بدولت اونچی سوسائٹی میں بار پانے لگے جس سے دوستی کا رشتہ استوار ہونے میں مدد ملی اور انہوں نے انگلستان کی حیاتِ اجتماعی کا گہرا مطالعہ کیا۔

اس تعلیم اور تجربے کی بنا پر انہوں نے اصلاح کا طریقہ ڈھونڈ نکالا اپنی ادبی استعداد اور ادبِ انگریزی کے عمیق مطالعہ کی بدولت انہیں انگریزی انشاء پر غیر معمولی قدرت تھی جس سے انہوں نے اسلام کی حمایت و مدافعت میں تصانیف و تالیف سے کام لیا۔

انگلستان میں اپنی تعلیم کے اختتام پر کتاب "محمد صلعم اور ان کی تعلیمات شائع کی جس سے ہندوستان اور یورپ کے علمی حلقوں میں دھوم مچ گئی مشہور مستشرق اسلبورن (Osborn) نے لکھا تھا "کہ یہ کتاب بجا طور پر اعجاز کی مستحق ہے مصنف کو انگریزی زبان پر حیرت انگیز قدرت حاصل ہے بہت کم انگریز ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور ان خطاؤں اغلاط سے خالی ہے جن کا ارتکاب تعلیم یافتہ ہندوستانی کرتے ہیں مسلمانانِ ہند قابلِ تہنیت ہیں کہ ان کا ایک فرد علمی ترقی کے اس درجہ پر پہنچا ہے جس کے اعمال کا آغاز اس کتاب سے ہو اُس کے مستقبل کا قوم پر گہرا اثر ہو گا۔ جہاں تک موضوع کتاب کا تعلق ہے ہمیں بہت سے مسائل سے اختلاف ہے اور وجہ خلاف ہم بعد کو لکھیں گے"

انہوں نے اپنے بلیغ قلم سے دو اور بڑی کتابیں لکھیں جن کا نام مختصر تاریخ العرب اور روح الاسلام (اسپرٹ آف اسلام) ہے پہلی کتاب میں مسلمانوں کی سیاسی تاریخ اور حالاتِ اجتماعیہ کا وجد انگیز اسلوب بیان سے نقشہ کھینچا ہے دوسری میں دینِ اسلام کا تعارف کرایا ہے اور ظاہر ہے کہ اسلام کی تعلیمات دائمی ترقی اور نمو کی مظہر ہیں اسلام کے متعلق جو بہترین کتابیں لکھی گئیں ہیں ان میں اس کتاب کا مقدمہ بھی شامل ہے ایک مختصر کتاب میں اسلام کی طرف دعوت بھی دی گئی ہے۔

ان کتابوں کی زبان ..... نہایت فصیح و بلیغ تھی جسکا ناقابل مثال اثر ہوا یہ کتابیں اسلام اور اس کے محاسن پر ایک غیور مسلمان کے قلم سے نکلی تھیں اس سے قبل تو لوگ اسلام کے متعلق مستشرقین سے سنا کرتے تھے وہ ہندوستان واپس آکر محکمہ قانون سے وابستہ ہو گئے اور شریعت اسلامی اور (محمڈن لا اور پرسنل لا) پر ایک کتاب لکھی جس میں عقلیات کی بھی آمیزش تھی ان کا خیال تھا کہ انہیں احکام میں اجتہاد کرنے کا حق حاصل ہے۔

وہ ہندوستان میں اسلامی سیاست کی تحریکوں کی قیادت بھی کرتے تھے اور اس راہ میں بہت سی تکالیف برداشت کیں جن میں بعض تو انگریز حکام کی پیدا کردہ تھیں اور بعض ہندوؤں کی کہ وہ مسلمانوں کی اصلاح میں حارج ہوتے تھے بہت سے مسلمان بھی ان سے ناراض تھے کہ انہوں نے ایک انگریز خاتون سے شادی کر لی ہے اور ان کا رہن سہن بھی انگریزی ہے لیکن اس مخالفت کے باوجود وہ اپنے کام میں مشغول رہے اس کے لئے مختلف انجمنیں قائم کرتے رہے۔ کہا کرتے کہ طبقاتی اور مذہبی اختلافات کے باوجود ان کا نصب العین ایک صالح شعور کا پیدا کرنا ہے۔ وقت آگیا ہے کہ مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کیا جائے اور سیاسی معاملات میں ان کی راہنمائی کی جائے۔

بس یہ دعوت تھی جس کی طرف وہ عمر بھر بلاتے رہے وہ ہندوؤں اور انگریزوں سے صلح رکھتے جب تک وہ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کرتے اگر کوئی دست درازی کرتا تو وہ بھی خلوص نیت اور شدت سے مدافعت کرتے ایک تقریر میں انہوں نے کہا تھا "ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق ہیں جو انگریزوں اور ہندوؤں سے پوشیدہ نہیں ہیں اگر ان کو پورا نہ کیا گیا تو مجھے ڈر ہے کہ ان کے مطالبات شدت نہ اختیار کر لیں مسلمان تو صرف انصاف کے طلبگار ہیں وہ ایسی سیاسی نمائندگی چاہتے ہیں جو ان کی تعداد۔ اہمیت اور تاریخ سے مطابقت رکھتی ہو مسلمانوں کو یہ پسند نہیں کہ سیاسی حقوق میں ہندو... ان سے بڑھ جائیں جب سب قوموں سے مساوات کا سلوک ہوگا تو مسلمان اصلاح کا خیر مقدم کریں گے۔"

انہوں نے اپنے اثر و رسوخ اور قلم و زبان سے مسلمانوں کی بڑی خدمت کی انہیں اپنے حقوق و مطالبات سے آگاہ کیا چاہے وہ ہندوستان میں ہو یا انگلستان میں جس نے مسلمانوں سے ناانصافی کی آپ نے خم ٹھونک کر اس کا مقابلہ کیا اس بارے میں وہ ہندوستان اور انگلستان کے انگریز سیاست دانوں سے خط و کتابت رکھتے تھے۔ ٹائمز اور گزٹ وغیرہ میں مضامین لکھا کرتے تھے اور جرأت اور صراحت سے اپنی رائے کا اظہار کیا کرتے تھے آخر کار ایک دوست نے انہیں حکومت کا پیغام پہنچایا کہ اب حکومت ہندوستان کو ان پر بھروسا نہیں رہا۔

پہلی جنگ عظیم میں دولت عثمانیہ کو شکست ہوئی تو یہ اس کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کو جوں کا

ترں برقرار رکھنے کا مطالبہ کیا ہندوستان کے مسلمانوں کو ترکوں کی تائید کرنے کیلئے برانگیختہ کیا اس بارے میں انہوں نے مضامین لکھے تقریریں کیں اور جلسوں میں سخت موقف اختیار کیا جب ایک مقرر نے تجویز پیش کی کہ قسطنطنیہ کو آزاد شہر بنا دیا چاہیئے تاکہ وہ جمعیۃ الاقوام کا مرکز بن سکے تو آپ نے فوراً اس کی تردید کی اور کہا کہ اس کام کے لئے فلسطین زیادہ مناسب ہے کیونکہ وہ دنیا میں امن وسلامتی کا گھر ہے اور ایک ہزار سال سے لوگوں کو عام بھلائی کی دعوت دے رہا ہے۔

علمی وسیاسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ وہ مسلمانانِ ہند کی حیات اجتماعی کی اصلاح کیلئے بھی کوشاں تھے۔ اس کے لئے وہ اوقاف کی اصلاح کرنا چاہتے تھے ان کا مطالبہ تھا کہ اوقاف کو شخصی ملکیت سے نکال کر ان کی تنظیم کی جائے اور ان کے کام کی نگرانی کی جائے اس راہ میں انہیں شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا وہ عورت اور اس کی تعلیم کی بھی اصلاح کرنا چاہتے تھے سر سید احمد خاں کی وفات پر انہوں نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بھی صدارت کی تھی اور اپنے خطبہ صدارت میں دو اہم باتوں کی طرف توجہ دلائی تھی ۱۹۰۲ء میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا "اوقاف نے تمام ممالک اسلامیہ میں علم کی اشاعت میں بے حد مدد دی ہے ان سے علوم و معارف نے ترقی پائی ہے ہندوستان میں بھی ان سے بڑا نفع پہنچا ہے لیکن انقلاب زمانہ کے باعث بہت سے اوقاف مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گئے ہیں اور اب غیروں کے تصرف میں ہیں لہذا میں تمام مسلمانوں کو دعوت دیتا ہوں کہ اس بارے میں کوشش کریں اور حکومت سے مطالبہ کریں کہ وہ اوقاف پر توجہ مبذول کرے اور جو اس کے قبضہ میں ہیں ان کی اچھی طرح نگہداشت کرے کیونکہ یہ اوقاف فقر و فاقہ اور کڑے دنوں کے مقابلہ میں اسلامی قلعے ہیں اور مایہ ناز ہیں" عورت کے متعلق کہا کہ مسلمانوں پر ایک وقت ایسا آیا ہے جب کہ وہ عورتوں کو امہات الرجال کے نام سے موسوم کیا کرتے تھے کیا اب ہم نے ان کو اس صفت سے موصوف نہیں کر سکتے؟ افسوس اب وہ مردوں کے ہاتھ آلہ بن گئی ہیں جس طرح چاہتے ہیں ان سے کام لیتے ہیں۔ اگر ہم تمدنی ترقی کے زینہ پر چڑھنا چاہتے ہیں اور اقوام میں اپنے کو باعزت دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں بچیوں کی تربیت کا انتظام کرنا چاہیئے تاکہ وہ دوبارہ امہات رجال بن سکیں میرا تو یہ اعتقاد ہے کہ بچیوں کی بھی بچوں کے ساتھ ساتھ تعلیم و تربیت ہونی چاہیئے اگر ہم نے نصف بہتر کو ضائع کر دیا تو اس سے برے نتائج برآمد ہوں گے کیونکہ تعلیم یافتہ لڑکا ان پڑھ لڑکی سے نفرت کرے گا اس کی صحبت سے دور رہیگا اور زندگی کے ایسے راستہ پر چل نکلے گا جو شرف و وقار کے منافی ہو گا لہذا میں اس امر کو ضروری سمجھتا ہوں کہ ان اوقاف کی آمدنی سے مسلمانان ہندوستان اپنی لڑکیوں کی تعلیم کا بندوبست کریں اور اپنی آنکھوں کے سامنے زندگی کا وہ طریق کار

رکھیں جس پر وہ چل کر اعلیٰ مدارج تک پہنچ سکتے ہیں۔

سید امیر علی کا ایک اور نیک کارنامہ قابلِ ذکر ہے جنگ طرابلس کے موقعہ پر انہوں نے دیکھا کہ انجمن صلیب احمر کی کوشش اور توجہ کا مرکز صرف زخمی عیسائی بنے ہوئے ہیں مسلمان زخمیوں کو کوئی بھی نہیں پوچھتا اور نہ ان کی کوئی خبر گیری کرتا ہے اس مقصد کے لئے انہوں نے ایک انجمن قائم کی اس کا مقصد مخیر لوگوں سے چندہ جمع کرنا اور عرب اور ترک زخمی سپاہیوں کی امدادی جماعتوں کے درمیان رابطہ پیدا کرنا تھا دو سال تک آپ اسی کام میں لگے رہے جب کسی نے یہ پوچھا کہ اس انجمن کا مقصد صرف مسلمان زخمی سپاہیوں کا علاج ہے تو آپ نے جواب دیا کہ ہاں اس کا مقصد اولین صرف عرب اور ترک زخمی سپاہیوں کا علاج معالجہ کرنا ہے لیکن بوقت ضرورت عیسائی اور یہودی زخمیوں کی بھی مدد کی جا سکتی ہے جنگ بلقان اور دوسری جنگ عظیم کے دوران بھی انہوں نے اور ان کی انجمن نے زخمیوں اور مصیبت زدوں کی اسی طرح مدد کی تھی

سید امیر علی عقیدہ میں مخلص ہونیکے باعث ممتاز تھے چاہے یہ دینی عقیدہ ہو یا قومی اور وطنی۔ قدرت نے انہیں زبان اور قلم پر قدرت عطا کی تھی وہ خطیب اعظم اور سحر انگیز نثر نگار تھے انہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے دین کی خدمت کی وہ اسلام اور پیغمبر اسلام صلعم کے متعلق لکھتے رہتے تھے اور ان یورپین لوگوں میں اسلام کا پیغام پہنچاتے تھے جن کے کان ابھی تک اسلام اور پیغمبر اسلام سے ناآشنا تھے ان کو ایسا معلوم ہوتا کہ انہوں نے پہلی بار یہ باتیں سنی ہیں جب پڑھنے والوں کو سیرت پر کتاب ملی تو انہوں نے اس کے حسن اثر کا اعتراف کرتے ہوئے اسکو داخل درس کر لیا کہ ایک دن اس کا سبق ہوا کرے گا وہ قلم اور زبان سے مسلمانوں کی خدمت کرتے رہے ان کو ابھارتے رہے ان میں اتفاق پیدا کرتے رہے ان کے حقوق کی حفاظت کرتے اگر وہ قومی معاملات سے دلچسپی نہ رکھتے تو ان پر مال و متاع کی بارش ہو سکتی تھی وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت بڑے بڑے القاب حاصل کر سکتے تھے لیکن قناعت کے ساتھ انہوں نے ضمیر کی راحت کو زیادہ پسند کیا دولت مندی، فخریہ القاب اور ضمیر دشمنی انہیں بھاتی نہ تھی ان کو تصنیف و تالیف اور دین کی حمایت کی دولت ملی ہوئی تھی جس کے آگے ہر قسم کا جاہ و مال اور دنیاوی عزت ہیچ ہے جس دن ان کا انتقال ہوا تو ان کے بہت سے یورپی اور دیسی دوست پھولوں کے ہار لے کر ان کی تربت پر حاضر ہوئے ان میں ایک جماعت کی طرف سے جس کے وہ نگران رہے تھے ایک گلدستہ پر یہ لکھا ہوا تھا "کہ اس قبر میں محو خواب ہونیوالے کی بدولت بہت سے بھوکوں کو روٹی ملی۔ بہت سے ننگوں نے لباس زیب تن کیا اور بہت سے مریضوں نے شفا پائی

ان کے کارناموں سے بہت سے لوگوں کو اطمینان قلب نصیب ہوا بہت سے بھٹکے ہوئے بچے اپنی ماؤں سے مل گئے۔ جنگ نے جن اراضی کو خراب کر دیا تھا وہاں کے لوگوں نے ان کی سعی و کوشش سے دوبارہ زندگی پائی۔

ہم اس تحریر کی تکمیل اس طرح کر سکتے ہیں کہ زبان و قلم سے انہوں نے بہت سے نفوس کو زندہ کیا۔ مردہ عقلوں کو بیدار کیا۔ گم کردہ راہوں کو راہ ہدایت سجھائی بگڑے ہوؤں کی اصلاح کی اور ٹیڑھوں کو سیدھا کیا۔ مسلمانوں کو ان کے حقوق دلائے بچیوں کی تعلیم کی دعوت دی جس سے زندگی میں مسرت پیدا ہوئی اور قوم نے سعادت پائی۔

○

خیر الدین پاشا تونسی

۱۲۲۵ھ — ۱۳۰۷ھ

۱۸۱۰ء — ۱۸۸۹ء

خیر الدین پاشا نے ہوش و تمیز کی آنکھیں آستانہ میں تحسین بک نقیب الاشراف[1] کے گھر میں کھولیں ان کا گھرانا دوسرا تھا گھر کی مالکہ ان کی ماں نہ تھی نہ تحسین بک ان کا والد تھا کسی کو چپکے چپکے کہتے سنا کہ وہ تو غلام ہے لیکن وہ اس لفظ کی کنہ کو نہ پا سکا۔ اس کی پیدائش کہاں ہوئی تھی اس کا خاندان کس جگہ ہے یہ سب سوالات حیرت ناک تھے اور بقول ابو العلاء المعری

مایاختیاری میلادی ولا ھرمی — ولا حیاتی فھل لی بعد تخییر

(میری پیدائش اور بڑھاپا اور زندگی میرے اختیار میں نہیں ہے کیا مرنے کے بعد بھی مجھے اختیار حاصل ہوگا)

ایک دن اس نے دیکھا کہ تحسین بک اسے ایک دوسرے آدمی کے سامنے پیش کر رہا ہے اس نے خیر الدین کو سر سے لے کر پاؤں تک اس طرح دیکھا جس طرح کسی چیز کو پرکھا جاتا ہے پھر تحسین بک نے رقم لے کر خیر الدین کو اس کے سپرد کر دیا۔ اس نے اسے جہاز پر سوار کرا کر تونس بھیج دیا اب وہ احمد بائے۔ بائی تونس کے گھر میں تھا۔

اس معاملہ کی حقیقت کیا تھی

آخر کار پوچھ گچھ سے اسے اپنی اصلیت کا پتہ چلا

وہ چرکسی النسل تھا اباظہ کے خاندان سے تعلق تھا جب ان کے ہاں چھاپہ پڑا اور ان کے خاندان نے ہجرت کی تو وہ بچھڑ گیا اور اغوا کر لیا گیا اور آستانہ میں بردہ فروشوں کے بازار میں بیچ دیا گیا جہاں کہ تحسین بک نے انہیں خرید لیا۔ اور ان سے بائی تونس کے ایجنٹ نے جو کہ غلاموں اور باندیوں کی خرید پر متعین تھا۔

مصیبت غم وحزن کو جنم دیتی ہے وہ مادری اور پدری شفقت سے محروم رہے تھے آزادی کی نعمت بھی نہ پائی تھی ان چیزوں کی کسی نعمت سے بھی تلافی نہیں ہو سکتی چاہے تحسین بک کا محل ہو یا بائے تونس کا قصر شاہی

لبیت تخفق الارواح فیہ — احب الی من قصر منیف

وہ خیمہ جو ہواؤں کی گذرگاہ میں ہے مجھے اونچے محل سے زیادہ پیارا لگتا ہے

1. THE CHEIF OVER THE REGISTERED DESCENDANTS OF THE PROPHET.

آخر کار ان شاندار کھانوں اور چمکیلے لباس اور ناز و نعمت کی حقیقت ہی کیا ہے جب کہ تحسین بک یا بائی تونس انکو زر خرید غلام سمجھتے ہیں۔

اس حقیقت کا انہیں اچھی طرح یقین تھا انہیں اس بات کا بھی پتہ چل گیا تھا کہ ان کا ایک بھائی مصر میں اعلیٰ عہدہ پر فائز ہے اور بڑی دولت کا مالک ہے لیکن ان کی غیرت اور رشک نے اس امر کی اجازت نہ دی کہ وہ اس سے خط و کتابت کر کے اسے اپنی حالت سے باخبر کریں انہوں نے اس بھید کو ظاہر کرنا بھی مناسب نہ سمجھا۔

عالم اسلام میں چرکسی ہمیشہ سے مشہور و معروف چلے آ رہے تھے یہ بدوی قبائل تھے جو بحیرہ قزوین اور بحیرہ اسود کے شمال مغربی اطراف میں کثیر تعداد میں آباد تھے جب روس نے ان کے ملک پر قبضہ کیا تو وہ ترکی اور ایشیائے کوچک میں آ کر آباد ہو گئے تھے انہیں اسلام لائے تین صدیاں گذر چکی تھیں

وہ پٹھانوں کی طرح بہادر اور کریم تھے پاکیزگی اور خوبصورتی کی وجہ سے ممتاز تھے۔ ان کے بچوں بچیوں اور نوجوان لڑکیوں کو پکڑ لیا جاتا اور مملکت اسلامیہ بھیج دیا جاتا عباسی عہد کے آغاز ہی سے ایسا ہوتا چلا آیا ہے۔

مصریوں کو تو یاد ہو گا کہ چرکسی غلاموں نے ۷۸۴-۹۲۳ھ ان پر حکومت کی ہے سلاطین مصر نے ان کی بھاری تعداد منگوا کر رکھی ہوئی تھی ان کو اعلیٰ مناصب پر فائز کیا جاتا اور جنگی مہمات ان کے سپرد ہوا کرتی تھیں قلعے اور حصار ان کے قبضہ میں تھے ایک دوسرے کی مدد و اعانت کیلئے مشہور تھے۔ موقع پا کر انہوں نے حکومت پر قبضہ کر لیا اور ملک پر حکومت کرنے لگے ان میں کا پہلا سلطان برقوق تھا بالآخر سلطان سلیم کے ہاتھوں انہیں شکست ہوئی ان کے آخری بادشاہ طومان بائی کے ہمراہ چالیس ہزار چرکسی تھے یہ سب مصریوں کے ساتھ گھل مل گئے یہ بھی یاد رہے کہ اعرابی پاشا کی بغاوت کی اصل وجہ مصری سپاہیوں کا یہ اعتقاد تھا کہ چرکسی سپاہیوں کے معاملہ میں ان سے اچھا سلوک نہیں کیا جاتا

○

جب خیر الدین کو تونس لایا گیا تو تونس کی حالت عام مشرقی ملکوں جیسی تھی وہ ایک زوال پذیر تمدن کا مرکز تھا جو اب بے روح ہو چکا تھا علمی زندگی میں مصر قبل از عہد محمد علی سے زیادہ مشابہت رکھتا تھا ابتدائی مکاتب قصبوں اور دیہات میں پھیلے ہوئے تھے جن کی غایت کلام پاک کے حفظ کرانے کی ہوتی بہت کم لوگ یہ سعادت حاصل کر سکتے نصاب تعلیم ایسا تھا کہ دس سال ہی برباد کرنے کے بعد ہی طالب علموں کو عبارت صحیح

پڑھنی یا لکھنی نہ آتی ہوشیار طالب علم قرآن پاک یا اس کے چند اجزا ازبر یاد کرلیا

سب سے بڑی درسگاہ جامعہ زیتونیہ تھی اُس زمانہ میں یہ ازہر کا چھوٹا نمونہ . . . . تھی اس میں تفسیر حدیث فقہ۔ عقائد۔ نحو۔ صرف معانی اور بیان پڑھائے جاتے دروس میں متون۔ شروح اور حواشی داخل تھے بیشتر وقت تعبیرات کی تفہیم۔ اعتراضات اور جوابات پر صرف ہوتا حقیقی علم مفقود تھا نتیجہ جدلیات کی صورت میں نکلتا نہ کہ حقائق کی شکل میں۔ امتحان میں وہی طالب علم کامیاب سمجھا جاتا جو جدلیات کا ماہر اور مصطلحات شکلیہ کا حافظ ہوتا اکثریت تحصیل اور عدم تحصیل میں مساوی ہوتی جب انہیں باہر کی عملی دنیا میں قدم رکھنے کا موقع ملتا تو سخت مناظرہ اور مباحثہ ہوتا کہ سگریٹ پینا حلال ہے یا حرام۔ غیبت زیادہ حرام ہے یا آلات موسیقی کا سننا اور خیال الظل[1] کا دیکھنا جائز ہے یا ناجائز

باشندوں کی غالب اکثریت بدوؤں پر مشتمل تھی جو سوائے شہادتین کے اسلام سے بیگانہ تھے بعض جگہوں پر صوفیوں نے زاویے اور تکیے بنا رکھے تھے وہاں لوگوں کو دینی تعلیم کی شُد بُد حاصل ہو جایا کرتی تھی فرانسیسی اطالوی اور انگریزی مشنوں نے مدارس قائم کر رکھے تھے جن میں ان کے ہم قوم زیادہ اور ملکی باشندے بہت کم زبان دانی۔ جغرافیہ۔ تاریخ۔ حساب الجبر اور جیومیٹری کی تعلیم پاتے تھے طالب علم جب یہاں سے پڑھ کر نکلتے تو زندگی کے حقائق سے زیادہ واقف ہوتے اور عملی زندگی میں قدم رکھتے ہوئے ملکی دولت پر قابض ہو جاتے ۔

لوگوں کی گذران زراعت پر تھی اس کے آلات و اسالیب وہی تھے جو زمانہ قبل از اسلام یا رومی عہد سے چلے آتے تھے بعض فرنگیوں نے بھی کھیتی باڑی کا کام شروع کیا تھا انھوں نے درخت لگائے تھے ان پر تلقیح کا کام کر کے . . . . خوب منافع اٹھایا بڑھتے بڑھتے انہوں نے روغن زیتون کی تجارت پر قبضہ کر لیا روغن زیتون نکالنے کے لئے ایک کارخانہ بھی قائم کیا جو بھاپ سے چلتا تھا آہستہ آہستہ وہ بیرونی تجارت پر بھی قابض ہو گئے تونسی ایک قسم کا کپڑا بنانے تھے جسکا نام شاشیہ تھا۔ اس کے بہت سے کارخانے تھے جن پر ان کی روزی کا مدار تھا یہ تمام کارخانے قدیم آلات سے کام کرتے تھے جب یورپ میں کپڑے کی صنعت کو فروغ ہوا اور کارخانوں میں بھاپ سے کام لیا جانے لگا تو پیداوار میں اضافہ ہونے لگا جس سے نرخ ارزاں ہو گئے اور مقامی صنعت کو زوال آگیا ہزار میں سے تیس کارخانے باقی رہ گئے اس سے غربت اور بے کاری

---

[1] پتلیوں کا تماشہ

میں اضافہ ہوا ملک کا میزانیہ بگڑ گیا۔ درآمد کی کثرت اور برآمد میں کمی واقع ہوئی اب منڈیوں پر فرانسیسیوں اور اطالویوں کا قبضہ تھا۔

ذرائع آمد و رفت کی خرابی سے تجارت کو ضعف پہنچا باشندے اونٹوں۔ گھوڑوں۔ گدھوں اور گاڑیوں پر غلہ لے جاتے۔ بدوی قبائل قافلوں سے اناج منتقل کرتے۔ سردی کا موسم ہوتا اور بارش پڑتی تو آمد و رفت بند ہو جاتی سرکاری محکموں میں ابتری انتہا کو پہنچ چکی تھی حاکم اپنے افعال میں خود مختار تھا۔ اسے وہی آدمی اچھا لگتا جو حلال و حرام سے اس کی جیب بھر دیتا آمدنی اور خرچ کا کوئی گوشوارہ نہ تھا عدل و انصاف مبنی بر اتفاق تھے اگر کوئی حاکم منصف مزاج ہوتا تو انصاف ہوتا اور یہ اس کی زندگی تک رہتا عدلیہ فوج ٹیکس اور مال گذاری کا طریقہ فرسودہ تھا بہت سے امور زبانی حکم سے سرانجام پاتے جن کا نہ کوئی ریکارڈ ہوتا نہ حساب۔

تونس اس وقت بایات کے اقتدار میں تھا تونس میں بائی کا لقب ایسا ہے جیسا مصر میں خدیو کا۔ بائی تونس رسمی طور پر دولت عثمانیہ کا محکوم تھا۔ ... سے مدد کرتا اور بہت سی رقم اور ہدایا بھیجا کرتا اگر تونس کے سیاسی معاملات میں کوئی مشکل آ پڑتی تو رفع نزاع کے لیے سلطان اپنا نمائندہ بھیج دیتا ماسوائے اس کے تونس بالکل آزاد تھا اور بائی تونس بالکل خود مختار۔

فرانس نے الجزائر پر قبضہ کر رکھا تھا اب وہ اس کوشش میں تھا کہ تونس اور دولت عثمانیہ کے روابط میں ضعف پیدا ہو جائے تو وہ ملک پر قبضہ کرے۔

اس وقت تونس کا بائی احمد شاہ تھا جس نے خیرالدین کو خریدا تھا سلطان محمود اس پر مہربان تھا اس نے اس کو خلعت و القاب سے نوازا تھا سلطان محمود نے بیرونی دباؤ سے مجبور ہو کر حکومت کے اداروں کی مغربی طرز پر تنظیم کی تھی اس نے بائی احمد کو پیغام بھیجا تھا کہ وہ بھی تونس کے داخلی محکموں کی تنظیم کرے خصوصاً فوج کی۔ ملک کی عادات حقیقت اور استعداد کو دیکھتے ہوئے بائی نے مہلت طلب کی پھر فوج کی تنظیم شروع کر دی یہ تھے تونس کے حالات جب کہ خیرالدین نے تونس میں قدم رکھا۔

(۲)

احمد بائی کے قصر میں خیرالدین نے پرورش پائی اس کا احسان ہے کہ اس نے خیرالدین کی تعلیم کا اہتمام کیا سوقت

Beys.

تونس میں تعلیم کا رنگ تمام تر دینی تھا۔ نصاب تعلیم میں قرأۃ خوشخطی۔ قرآن پاک کا حفظ اور تجوید شامل تھی۔ تھوڑی سی فقہ اور توحید بھی تھی علماء کی صحبت اور استفادہ سے خیرالدین نے علوم شریعت میں کافی استعداد پیدا کر لی علوم لغت کے مطالعہ۔ انشاء پردازی کی مشق اور کتب تاریخ کے مطالعہ سے استعداد اور بھی پختہ ہو گئی۔

آپ گھر میں دینداری۔ دینی شعائر کی پابندی اور احترام شریعت اور رجال شریعت کے اعزاز و احترام کی وجہ سے مشہور تھے اس کے علاوہ انہوں نے خود شوق سے فرانسیسی زبان اچھی طرح سیکھ لی تھی وہ عربی۔ فرانسیسی اور ترکی زبانیں اچھی طرح سے جانتے تھے۔

اتفاق سے دولت عثمانیہ حکومت کے مختلف شعبوں کی تنظیم میں مصروف تھی خاص کر فوج کے معاملات میں۔ مختلف صوبوں کو بھی دعوت اصلاح دی گئی۔ بائی تونس بھی فوج کو منظم کرنے لگے اور اس بارہ میں فرانس سے مدد کے طلبگار ہوئے فرانس نے فوجی مشن کماندان کامیئوں کی سرکردگی میں بھیج دیا یہ کامیئوں وہی ہے جو بعد میں وزیر حرب بنا تھا۔ خیرالدین فوج میں بھرتی ہو کر اس مشن سے عسکری تعلیم حاصل کرنے لگے یہ کام ان کے چرکسی مزاج کے موافق بھی تھا شروع میں وہ گھوڑ سوار رسالہ کے افسر ہوئے پھر علم خیالہ کے کمانڈر بن گئے۔

پہلی تربیت نے انہیں دیندار۔ ماضی کے واقعات کا عالم اور علماء اور عوام کا محبوب بنا دیا تھا دوسری تربیت کی وجہ سے وہ ضابطہ پسند۔ عزم کے دھنی اور سرعت پسند بن گئے تھے۔

بعض ناگزیر ظروف و احوال کی وجہ سے انہیں سیاست میں سرگرم حصہ لینا پڑا اس زمانے میں تونس کے سیاسی سٹیج پر تین کردار مصروف عمل تھے۔ بائی احمد پاشا۔ مصطفیٰ خزانہ دار اور محمود بن عیاد۔ احمد پاشا جو خیرالدین کا آقا تھا۔ بلند نظر والی تھا ملک کی ترقی سے دلچسپی رکھتا تھا فوج کی تنظیم اور علم کی نشر و اشاعت میں حوصلہ افزائی کرتا تھا علماء کے وظائف مقرر کر رکھے تھے جامعہ زیتونیہ میں ایک عظیم الشان کتب خانہ کی بنیاد رکھی حکومت کے انتظامی شعبوں کو جدید طرز پر منظم کیا ساتھ ہی حد درجہ فضول خرچ تھا انجام پر نظر نہ تھی محکمہ مالیات کے بعض ظالم افسروں کے ہاتھ میں کھلونا بنا ہوا تھا یہی کمزوری بہت سے مفاسد کا پیش خیمہ بنی

مصطفیٰ خزانہ دار وزیر مالیات تھا اصل میں یہ مغرب کا رہنے والا تھا تونس آیا تو اس کی عمر دس سال سے بھی کم تھی احمد پاشا نے خیرالدین کی طرح اس کی تعلیم و تربیت کی۔ مناصب میں ترقی کرتا کرتا وزیر بن گیا۔ اس کی شخصیت عجیب و غریب تھی۔ منکسر مزاج تھا اور مزاج کا نرم تھا چاہے کوئی اس سے کچھ بھی مانگتا اسکو نفی میں جواب دینے کی اسے عادت نہ تھی بظاہر وعدہ کر لیتا لیکن باطن میں عدم وفائی کا عہد کر لیتا۔ عفیف اللسان تھا۔ نماز۔ اوراد

اور وظائف کا پابند تھا تہجد گذار بھی تھا لیکن ساتھ ہی مال جمع کرنے کا لالچ حد سے بڑھا ہوا تھا اس بارے میں چوروں اور غاصبوں کا ساتھ دینے میں بھی اسے عار نہ تھی پینتیس سال سے وزیر مالیات چلا آتا تھا اس اثنا میں رعایا کو ٹیکسوں کے بوجھ سے لاد دیا تھا دن کو ٹیکس لگاتا اور رات کو تہجد پڑھتا مال غصب کر کے مسجدیں بنواتا۔ شروع میں تو ہاتھ کا سخی تھا لیکن اخیر عمر میں مال جمع کرنے کی طمع حد سے بڑھ گئی تھی احمد پاشا کے مزاج میں اتنا دخل حاصل کر لیا کہ اس کو ظلم و فساد کی تمیز نہیں رہی تھی اپنا اثر رسوخ قائم رکھنے کے لئے ہر اس شخص سے مخاصمت پیدا کر لیتا جو احمد پاشا کا مقرب بارگاہ بننا چاہتا احمد پاشا کو جائز اور ناجائز خرچ کی عادت ڈال دی تھی وہ شاہانہ شان و شوکت کا دلدادہ اور فضول خرچ ہو گیا تھا اس طرح وہ ہر ممکن وسیلہ سے رعایا کا خون چوستا محمود بن عیاد مصطفی کا بازو تھا اور لوٹ کھسوٹ میں اس کا شریک و معاون اس کا کام ٹیکسوں کی تحصیل اور حکومت کی ضروریات کا انتظام کرنا تھا بیس سال سے وہ اس کام میں مصروف تھا۔ وہ ذہین اور خبیث تھا ٹیکسوں میں حد درجہ زیادتی کی تھی اس کی کوشش تھی کہ والی تک کوئی شکایت نہ پہنچ سکے اگر پہنچ جاتی تو حیلہ بہانہ سے بے اثر کر دیتا اس طرح اس نے آٹھ ملین قرش تونسی جمع کر لئے تھے۔

جب اس نے رعایا کی آہ وزاری سنی اور خیال کیا کہ اس سے اس کی بدنامی ہو گی کیونکہ وہ شریک عمل تھا تو اپنے مال و متاع کو فرانس منتقل کر دیا اس نے اپنے آپ کو مریض ظاہر کیا اور مشہور کر دیا کہ وہ علاج کرانے کے لئے فرانس جانا چاہتا ہے فرانس پہنچ کر فرانسیسی قومیت حاصل کر لی۔

اس کے فسق و فجور کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس نے تونسی حکومت سے چالیس ہزار ملین فرانک رقم کا مطالبہ کیا اس کے زعم میں یہ رقم حکومت تونس کے ذمہ واجب الادا تھی اس معاملہ نے بھاری اہمیت حاصل کر لی کیونکہ دعویدار اب فرانسیسی قومیت رکھتا تھا۔

احمد بائی نے خیر الدین تونسی کو اس قضیہ کے نپٹانے کے لئے فرانس بھیجا تاکہ اسے سمجھائے کہ اس مطالبہ سے تونسی حکومت کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا معاملہ کی نزاکت کا اس امر سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ابن عیاد کے پاس سرکاری دستاویزات بھی تھیں یہ مقدمہ تین سال تک دائر رہا اس اثنا میں خیر الدین حکومت کی وکالت کرتے رہے ابن عیاد نے سارا ملک سر پر اٹھا لیا۔ اس کے ذرائع وسیع تھے اور وہ بے دریغ روپیہ صرف کر رہا تھا اس نے فرانس میں املاک اور جائیداد بھی خرید لی تھی لیکن خیر الدین اکیلا سب کچھ برداشت کر رہا تھا۔

بالآخر فرانس کی وزارت خارجہ نے ایک کمیٹی کی تشکیل کی جسکا صدر نپولین ثالث تھا اس کی مداخلت سے ابن عیاد کے مطالبہ کی مقدار ساٹھ ملین قروش سے پانچ ملین رہ گئی اور حکومت تونس کو چودہ ملین قروش ادا کرنے کا فیصلہ دیا۔ اس سفر میں خیر الدین نے دوسرے اہم امور بھی انجام دیئے القرم کی جنگ میں بائی احمد نے دولت عثمانیہ کی مدد کے لئے چودہ ہزار فوجی اسلحہ اور جہاز دیکر بھیجے اس سے حکومت تونس کو زیر باری ہوئی جائے نے خیر الدین کو اپنے جواہرات فروخت کرنے کے لئے پیرس بھیجا وہ ان کی قیمت سے بائی کو مطلع کرتے رہے حتی کہ بائی نے فوری فروخت کا حکم دیدیا۔

ان جواہرات کی فروخت سے قرضہ نہ اترا تو بائے نے خیر الدین کو حکم دیا کہ وہ فرانس سے قرضہ حاصل کرنے کی بات چیت کرے۔ .... اسی وجہ سے خیر الدین کی غیور طبیعت قرضہ مانگنے کی طرف راغب نہ ہوتی تھی وہ ٹلتے رہے بائی فالج کا مریض تھا آخر کار وہ مرگیا اور قرضہ کی بات چیت نامکمل رہ گئی یہ بھی خیر الدین کا اہل تونس پر احسان تھا نئے بائی محمد باشا خاص طور پر شاکر تھے اور ان کا ذکر خیر کرتے تھے ان خدمات کے صلہ میں ان کو ۱۲۷۲ھ میں "فریق" کے منصب پر سرفراز فرمایا۔

فرانس کے قیام نے انہیں نئی دنیا اور اس کے نظام سے روشناس کرایا سیاسی مدبروں کی ملاقات نے ان کی اغراض سمجھنے میں مدد دی۔ وہ قوموں کی ترقی کے اسباب پر غور کرتے اور ان کا موازنہ تونس سے کرتے کہ دیگر قوموں نے کس طرح ترقی کی ہے اور تونس کس طرح ترقی یافتہ ہو سکتا ہے یہ امور ان کی آئندہ زندگی پر بعید اثر انداز ہوئے ان کو اپنی قوم پر بھروسہ .. اور امیدوں کے برآنے کا یقین پیدا ہوا۔

افسوس کا مقام ہے کہ اتنی رسوائی کے باوجود غاصب مصطفیٰ وزارت کے عہدہ پر فائز رہا۔

خیر الدین تونس لوٹے تو محمد پاشا نے انہیں وزیر حرب مقرر کردیا وہ اس عہدہ پر ۱۲۷۳ھ سے لیکر ۱۲۷۹ھ تک فائز رہے اس اثنا میں انہوں نے بہت سی اصلاحات عمل میں لائیں تونس کی سب سے بڑی بندرگاہ حلق الوادی تھی اس کو درست کرایا اور حکم دیا کہ اس کی وزارت کی ہر شے کا ریکارڈ رکھا جائے جدید نظام حکومت کی طرف یہ پہلا قدم تھا جہاز سازی اور ان کی مرمت کے لئے ایک بڑا کارخانہ کھلا یہ سڑکوں کی توسیع ... تنظیم کی لیکن ان کا اہم ترین کارنامہ دستوری حکومت کا قیام تھا حکومت عثمانیہ نے اس کے ماتحت صوبوں نے اجنبی دباؤ سے نمائندہ حکومت کی تجویز منظور کرلی تھی عوام اصلاح حال چاہتے تھے اس تحریک کی عقل فعال خیر الدین تھے اور نمائندہ مجلس کی قانون سازی کا سہرا ان کے سر تھا۔ لیکن جلد ہی اس مجلس کا تصادم دو گروہوں سے ہو گیا علمائے

دین کو سرے سے یہ بات پسند نہ تھی کیونکہ بعض قانونی احکام سیاسی تھے شرعی نہ تھے قانون کثرت آرا پر نافذ ہوتا تھا اور اکثریت کبھی اس نتیجہ پر پہنچی ہے جسے شریعت ناپسند کرتی ہے۔ سلطان اور اس کے حاشیہ نشین الدولی اور پر اس نظام حکومت سے ناخوش تھے کیونکہ انہیں اپنا اقتدار خطرہ میں نظر آتا تھا لیکن سلطان اور وزیر یا لیا نہ کا یہ مقصد تھا کہ اس پبلک تسیت کارروائی کر کے اپنے سیاسی غرض میں استعمال کریں اور مجلس کا ہر ممبر ہاں میں ہاں ملاتا رہے لیکن خیر الدین چاہتے تھے کہ ہر ممبر صدق و خلوص اور جرأت سے اظہار رائے کرے، اس سے وجہ نزاع پیدا ہوگی خیر الدین چاہتے تھے کہ حکومت کا حق مجلس کو حاصل رہے۔

ایک فرانسیسی کمپنی زغوان کے پانی کو قرطاجنہ اور پھر وہاں سے مرسی وصافرہ تک پہنچانا چاہتی تھی اس معاملہ میں بہت سے منافع دحضرات تھے ممبر آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے بعض منافع کی بنا پر شرکت پسند کرتے تھے تو بعض اجنبی اثر و نفوذ اور مداخلت کے ڈر سے گریزاں تھے اور چاہتے تھے کہ تونسی حکومت اس کام کو ہاتھ میں لے اس بنا پر اکثریت نے یہ تجویز نامنظور کر دی تو لی کو خبر ملی تو اس نے کہا کہ میں نے تو فرانسیسی قونصل سے اس کی منظوری کا وعدہ کیا تھا اس پر خیر الدین جرأت کر کے بولے تو ہمیں اکٹھا کرنے کی کیا ضرورت تھی آپ کا فرمان ہمارے لئے کافی ہوتا بعض ممبروں نے تجویز پیش کی تھی کہ اوقاف کی فاضل آمدنی فوجی اصلاحات پر خرچ کی جائے اس کی تائید میں انہوں نے ایک مالکی عالم کا فتویٰ بھی پیش کر دیا خیر الدین نے اس تجویز کی مخالفت کی اور اپنے نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ کہ فوجی امور کے لئے میزانیہ مختص کیا جاتا ہے ہاں اگر ملکی آمدنی فوجی اخراجات کی متحمل نہ ہوسکے تو پھر اوقاف کی فاضل آمدنی کو کام میں لایا جا سکتا ہے اب حال یہ ہے کہ قوم کا سرمایہ ادھر ادھر بکھر اجارہا ہے اور سرکاری رقوم من مانی خواہشات پر صرف ہو رہی ہیں تو اوقاف پہ دست تصرف دراز کرنا ناروا اور ناجائز ہے تیسرا فریق بھی تھا جسے نظام شورائی اور اقامت عدل پسند نہ تھا یہ حکومت فرانس تھی جسے ڈر تھا کہ جدید نظام کے قائم ہونے سے وہ اپنا تسلط ملک پر قائم نہ کر سکے گی اس بنا پر فرانسیسی نمائندے سلطان کو مجلس شوریٰ کے بے اثر کرنے کے مشورے دے رہے تھے جب نپولین ثالث الجزائر میں آیا اور بای تونس اسے ملنے گیا اور جدید نظام قانون کا ایک نسخہ پیش کیا تو نپولین نے ظاہری طور پر اظہار مسرت کیا لیکن ایک نجی ملاقات میں اس پر سخت تنقید کی اور کہا کہ اگر عرب انصاف اور حریت سے مانوس ہونے لگے تو ہمیں الجزائر میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا ان ممالک میں فرانسیسیوں کی سیاست دو محوروں پر گردش کرتی تھی۔ بظاہر اصلاحی تحریکات کی حوصلہ افزائی کرنا اور بباطن ان کی جڑ کاٹنا اس طرح دن بدن مشکلات پیدا ہوتی گئیں۔ نزاع اور مخاصمت بڑھتی رہی ان جیسے آدمیوں کے ساتھ اصلاحی کام کس طرح ہو سکتا تھا چنانچہ خیر الدین نے

استعفیٰ پیش کر دیا اور کہا کہ میں نے خلوص اور نیک دلی سے اپنے فرائض منصبی کو ادا کرنا چاہا تھا لیکن میری تمام کوششیں رائگاں گئیں میں مادر وطن کو دھوکہ نہیں دینا چاہتا میرا تجربہ ہے کہ بائی تونس اور خاص کر وزیر اعلیٰ مصطفیٰ خزنہ دار اصلاحی قانون کو چلنے نہیں دیتے ہیں نے مجلس شوریٰ کی صدارت اور وزارت حرب سے استعفیٰ دے دیا ہے اور پرائیویٹ زندگی لبسر کرنی شروع کر دی ہے۔

وزارت سے علیحدہ ہونے کے بعد نہ تو انہوں نے کوئی نئی سیاسی پارٹی بنائی اور نہ کسی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی کیونکہ یہ چیزیں ان کے مزاج کے خلاف تھیں اور پھر حالات بھی ناسازگار تھے۔ اس کے علاوہ ارکین حکومت سے ان کے مضبوط روابط تھے۔ بائی تونس ان کے آقا تھے مصطفیٰ خزنہ دار ان کا خسر تھا اجنبی ممالک ان سے آزردہ ہو گئے ہوئے تھے انہوں نے گوشہ نشینی اور امن و عافیت کی زندگی پسند کی۔ ان کو دوبارہ وزارت میں واپس لانے کی کوشش کی گئی لیکن وہ نہ مانے یہ حالت نو برس رہی اس عرصہ میں دو واقعات قابل ذکر پیش آئے وہ بائی کی طرف سے سفیر بن کر جرمنی۔ فرانس۔ انگلستان۔ اٹلی۔ آسٹریا۔ سویڈن۔ ہالینڈ۔ ڈنمارک اور بلجیم گئے ان سفروں سے انہیں مغربی تمدن کے ان اصولوں کے مطالعہ کا موقعہ ہاتھ لگا جن پر بڑی قوموں کی طاقت اور ان کا اثر و نفوذ قائم ہے۔ دوسرا اقوام المسالک فی معرفۃ احوال الممالک کی تالیف۔

۳

وزارت سے علیحدہ ہونے پر وہ اقوام المسالک فی معرفۃ احوال الممالک کی تالیف میں مشغول رہے اس کے فرانسیسی ترجمہ کا نام "الاصلاحات الضروریۃ للدول الاسلامیۃ" ہے اس کی تالیف کے وقت ان کا مقصد تھا کہ عصری تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر تاریخ ابن خلدون کی پیروی کی جائے یہ کتاب ایک مقدمہ اور تاریخ پر مشتمل تھی مقدمہ میں انہوں نے ممالک اسلامیہ ان کے عروج۔ زوال اسباب اور طریق اصلاح پر بحث کی ہے تاریخ میں مغربی ممالک کے سیاسی حالات سے قطع نظر کرتے ہوئے ان کے نظام حکومت۔ مالیات کے نظم و نسق اور بحری اور بری طاقت کا حال لکھا ہے اسی نمونہ پر انہوں نے دولت عثمانیہ اور مغربی ممالک انگلستان۔ فرانس۔ روس۔ جرمن۔ اطالیہ۔ ہسپانیہ۔ ہالینڈ۔ ڈنمارک۔ بلجیم۔ سوئٹزرلینڈ اور یونان وغیرہ کا ذکر کیا ہے اس کے بعد یورپ کا طبعی جغرافیہ لکھا ہے اس تذکرہ سے ان کا یہ مقصد تھا کہ عربی پڑھنے والے یورپ کے قوانین سلطنت اس کی ترقی اور اسباب ترقی سے متعارف ہو سکیں تاکہ ان میں جو چیز ان کے مزاج کے مناسب ہو اسے اخذ کرکے اس پر عمل کریں کتاب ایک لحاظ سے ان کی سیاحت کے افکار۔

اور تأثرات پر مبنی ہے۔

ہمیں یہاں کتاب کے مقدمہ سے غرض ہے جس میں مسلمانوں کی موجودہ حالت اصلاح کی ضرورت اور اس کے طریق کار سے بحث ہے وہ مسلمانوں کو ملامت کرتے ہیں کہ انہوں نے قوم کی اصلاح میں مغربی تمدن کے اسالیب سے کام نہیں لیا اور وہ یورپ کی ہر چیز کو حرام سمجھتے ہیں اس کی مختلف طریقوں سے تعلیل کرتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو شریعت اسلامی کے خلاف ہے یا مشرقی قوموں کے مزاج کے نامناسب ہے یا فصل مقدمات میں بڑی دیر لگتی ہے یا مغربی نظام حکومت کے رائج کرنے سے حکومت کے محکموں میں توسیع کرنی پڑے گی اس سے سرکاری ملازموں کی تعداد میں اضافہ ہوگا جن کی تنخواہوں کے ادا کرنے کے لئے ٹیکس لگانے پڑیں گے اور رعایا مزید ٹیکسوں کی ادائگی کی متحمل نہ ہو سکے گی۔

ان مزعومات کی انہوں نے اس طرح تردید کی ہے۔ دینداری ہمیں دوسری قوموں کے احوال پر نظر رکھنے سے نہیں روکتی اور نہ دنیوی مصالح میں اچھی باتوں کے اخذ و اقتباس سے منع کرتی ہے سچائی آدمیوں سے نہیں پہچانی جاتی بلکہ سچائی سے آدمی پہچانے جاتے ہیں دانائی تو مومن کی گمشدہ چیز ہے جہاں بھی مل سکے وہ حاصل کر سکتا ہے جب حضرت سلمان فارسی نے غزوۃ الاحزاب کے موقعہ پر آنحضرت صلعم سے خندق کھودنے کی درخواست کی تو آپ مان گئے۔ حالانکہ عرب خندقوں وغیرہ سے ناآشنا تھے پہلے مسلمانوں نے یونانی علوم حاصل کئے تھے جن میں منطق بھی شامل ہے امام غزالی کہتے ہیں جو عالم منطق نہیں جانتا اس کے علم پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا جب حضرت ابوبکر صدیق رض نے حضرت خالد بن ولید رض کو مرتدین سے جنگ کرنے بھیجا تو کہا جب تمہاری ان سے مڈبھیڑ ہو تو انہی جیسے ہتھیاروں سے لڑو تیر کا تیر سے نیزے کا نیزے سے اور تلوار کا تلوار سے مقابلہ کیا جائے اگر وہ اس زمانہ میں ہوتے تو جدید جنگی اسلحہ کا ذکر کرتے موجودہ حالت میں علم اور اسباب تمدن کے ذریعہ سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے جو لوگ مغربی تمدن کو اچھا نہیں سمجھتے ہم ان سے کہتے ہیں کہ تم تنظیم اس کے نتائج ۔ حکومت ۔ نظام حکومت اور عدل و انصاف کو تو برا جانتے ہو لیکن مغربی ملبوسات ۔ مغربی اسباب خانہ داری ۔ مخترعات اور اسباب زیب و زینت کو کیوں نہیں برا سمجھتے جن لوگوں نے زیب و زینت اور عیش و آرام کی چیزیں بنائی ہیں انہی نے جدید اسلحہ اور نئے نئے علوم و فنون کی ایجاد کی ہے۔ کیا یہ جائز ہے کہ آپ نافع اشیاء کا دروازہ عوام پر بند کر دیں اور مضرت رساں چیزوں کا دروازہ وا کر دیں؟ یہ کہاں تک روا ہو گا کہ ہم ان سے اخذ و استفادہ نہ کریں اور وہ ہمارے ملکی ذرائع اور زراعت پر قابض ہو کر عیش و عشرت کی زندگی گذاریں اور ہم ان کے خوان نعمت کے بچے کھچے ۔ ۔ ٹکڑوں پر کفایت کریں انہوں نے علوم و فنون کے

سے ہم پر تسلط قائم کیا ہے ان کے ہاں علوم و معارف کی ترقی عدل و انصاف اور آزادی کی راہ سے آئی ہے عقلمند ان حقائق سے کس طرح نظر پوشی کر سکتا ہے اور اوہام و خرافات کی طرف کیسے متوجہ ہو سکتا ہے سیاسی حریت کے متعلق بعض مصنفوں نے لکھا ہے "جو قوم حربی اور عسکری میدان میں اپنے پڑوسیوں کے ساتھ ساتھ نہیں چلتی وہ ان کا لقمہ بن سکتی ہے" انہوں نے جنگی تنظیم کا اس لئے ذکر کیا ہے کہ یہی کتاب کا موضوع ہے ورنہ زندگی کے ہر شعبہ پر یہی حکم لگایا جا سکتا ہے۔

افسوس کا مقام ہے کہ مختلف ممالک اسلامیہ میں یورپی تہذیب و تمدن کے متعلق نظر و فکر کا کم و بیش یہی حال ہے وہ نسوانی تعلیم سے ڈرتے ہیں اور جدید قوانین سے ہراساں ہیں یہی وجہ ہے کہ عیسائی جدید تمدن اختیار کر کے مسلمانوں سے گوئے سبقت لے گئے ہیں بعض لوگ اس کو اسلام کے فطری مزاج سے منسوب کرتے ہیں حالانکہ اسلام اچھی باتوں کے اختیار کرنے سے نہیں روکنا چاہے وہ کہیں ہوں۔

○

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مغربی تہذیب و تمدن مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی سے مناسبت نہیں رکھتے ہم ان کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ نشأۃ ثانیہ کے وقت یورپ کا ہم سے بھی زیادہ برا حال تھا اور آج اگر ان کی پوشیدہ حریت کو جلا دی جائے تو مسلمان اپنی عقلیت۔ استعداد اور سابق تمدن کی بدولت جادۂ ترقی پہ گامزن ہو سکتے ہیں آزادی اور بلند نگاہی مسلمانوں کے گوشت پوست میں رچی اور بسی ہوئی ہیں جن کو دینی تعلیم نے اور زیادہ مضبوط کر رکھا ہے مقصود کلام یہ ہے کہ وہ لوگ جو ان کے راہنما ہیں اور قوانین حکومت اور حریت کی تاسیس میں لگے ہوئے ہیں ان کو چاہئے کہ مسلمانوں کے ظروف اور احوال کو بھی دھیان میں رکھیں ان کے سامنے وہی چیز پیش کریں جس کو وہ ہضم کر سکتے ہوں اسباب تمدن میں فراخی سے یہ عمل روز بروز وسیع ہوتا رہے گا۔

فصل خصومات میں جو دیر لگتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حاکم معاملہ کی چھان بین کر کے معاملہ کی تہہ تک پہنچنا چاہتا ہے فریقین کو دلائل پیش کرنے کا پورا موقع دیتا ہے تاکہ اس میں کسی کو مجال شک نہ رہ جائے یہ دیر تو ہزار درجے بہتر ہے بہ نسبت عجلت سے فیصلہ کیا جائے اسی طرح دوسرے سیاسی معاملات کا حال ہے اگر دیر صواب اور حقیقت معلوم کرنے کی وجہ سے ہو تو اس میں کونسا حرج ہے شروع شروع میں ضرور دیر لگتی ہے لیکن مشق اور تجربے سے رفتار عمل تیز ہو سکتی ہے۔

اب رہا زیادہ ٹیکس ... لگانے کا ڈر تو معاملہ اس کے برعکس ہے کیونکہ مجلس شوریٰ بنا بر مصلحت ٹیکس لگائے گی اور یہ ٹیکس اہل حل وعقد کی مرضی سے لگیں گے کیونکہ استبدادی حکومت تو حاکم کی مرضی اور خواہشات کیمطابق ٹیکس عائد کرتی ہے حکومت کے قوانین اور اس کے معاملات کی تنظیم آمدنی پر موقوف ہوتی ہے جب آمدنی میں اضافہ ہوگا تو عوام کی حالت درست ہوگی اس وقت ٹیکس لگانے سے ملک کو نفع پہنچے گا آج تو یہ حال ہے کہ حاکم کی مرضی اور خواہش سے بے حساب ٹیکس لگانے کی سوجھتی ہے۔

انصاف کی بات ہے کہ مسلمانوں کی اصلاح نظام شوریٰ سے ہو سکتی ہے جو حاکم کے اختیارات محدود کر دے اس لئے ضروری ہے کہ یورپی تہذیب و تمدن سے حسب مصلحت اخذ و استفادہ کریں یہ کہنے میں ہمیں کوئی باک نہیں کہ جو لوگ اصلاح کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ وہ دنیا کی ترقی سے ناواقف ہیں ان کو پتہ ہی نہیں کہ عیوب کی کس طرح اصلاح کی جاتی ہے اور کس طرح حکومت کا انتظام کیا جا سکتا ہے جہالت انہیں نظم و نسق کی خرابی دیکھنے نہیں دیتی وہ اصلاح کو بدعت سمجھتے ہیں کہ وہ دھوکے میں مبتلا ہیں انصاف اور حریت حکومت کے دو ستون ہیں ان سے مسلمانوں کو ترقی ملی تھی یورپ ان سے ناآشنا تھا تو ضعف و فساد میں مبتلا تھا بعد میں اس کے حال کی درستی ہوئی یورپ کی فضا اور مٹی اصلاح حال کے لئے زیادہ مناسب نہیں ہے وہاں کے لوگوں نے علوم، صناعات اور زراعت میں جو ترقی کی ہے اور تجارت سے جو کچھ کمایا ہے وہ سب عدل اور حریت کی پیداوار ہے یہی قانون فطرت ہے جسکی خلاف ورزی نہیں ہو سکتی عدل و حریت سے ملکی آبادی بڑھتی ہے استبداد اور ظلم سے اسمیں کمی آتی ہے۔

عدل اور حریت کی اس طرح تنظیم کرنی چاہئے جو ان کے دوام کی ضامن ہو سکے ان کے وجود کی ضامن انتخابی مجلس ہی ہو سکتی ہے بعض بادشاہ ایسے ہوتے ہیں کہ مشورہ کے بغیر حکومت کے انتظام کو اچھی طرح چلا سکتے ہیں لیکن یہ وقتی بات ہوتی ہے جو ان کے زوال سے زوال پذیر ہو جاتی ہے لہٰذا واجب ہے کہ اہل حل وعقد بادشاہوں کے ساتھ رہیں کلیات سیاسیہ میں ان کے شریک عمل ہوں اور وزراء ان کے سامنے جوابدہ ہوں مسلمان پر جو مصیبت پڑی ہے تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ملک کو حاکم کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا اور وزراء اس کے اشاروں پر چلنے لگے کہ جب بیت المال خالی ہو جائے اور لوگوں سے ٹیکس لینے کی ضرورت پڑے تو ابن الاعرابی کہتے ہیں ...

...... تو ٹیکس کھلے بندوں وصول کر کے عدل و انصاف سے خرچ کرنے چاہئیں نہ کہ ایک جماعت کی مرضی کے مطابق ایک یورپی مدبر سے باتیں کر رہا تھا وہ اپنے ملک کے حسن نظم اور کارکردگی میں رطب اللسان تھے میں نے ان سے پوچھا کہ تم سیاسی آزادی کے متعلق کیوں جھگڑتے رہتے ہو کہنے لگے تو ہمارے

بعد اس کی استقامت اور بقا کا کون ذمہ دار ہوگا۔ خیر الدین نے اس کے بعد نپولین کے ایک مؤرخ کا قول نقل کیا ہے کہ نپولین نے اپنی عظمت کے باوجود استبداد کی غلطی کی تھی فرانسیسی قوم کو چاہیئے کہ وہ اس کی غلطیوں سے سبق سیکھے، کسی فرانسیسی کو زیبا نہیں کہ وہ کسی کی خاطر اپنی آزادی کو خطرہ میں ڈالے اور نہ اتنی افراط سے کام لے کہ اس کی عزت وحرمت ہی جاتی رہے۔ خیر الدین نے اپنے نظریہ کی تائید میں تاریخ اسلام کے واقعات پیش کئے کہ امت اسلامیہ نے کیوں کر ترقی پائی اور کس طرح زوال پذیر ہوئی اور یورپ علمی ترقی میں کس طرح پیچھے تھا اور کس طرح آگے بڑھا اور کمال کو پہنچا۔

اس نے مسلمانوں کو ان کے زوال کا ذمہ دار قرار دیا لیکن یورپ نے جس طرح ممالک اسلامیہ پر اپنا تصرف قائم کیا ہے اس پر بھی خوب نقد و تبصرہ کیا خاص کر امتیازات الاجنبیہ کے بارے میں کہ ان کے عہد و پیمان کا تو وقت ہی گذر گیا ہے لیکن ابھی تک اس کی من مانی تفسیریں اور تشریحیں ہو رہی ہیں یہ سب اساسی اور بدیہی قانون کے سراسر خلاف ہیں۔ اگر کوئی کسی جگہ جاتا ہے تو اسے لازمی طور پر وہاں کے قانون کا احترام کرنا پڑے گا اگر کہا جاتا ہے کہ مملکت اسلامیہ نظم و نسق کے معاملے میں دوسرے متمدن ممالک سے پیچھے ہے تو اور بھی ممالک موجود ہیں جن کا نظم و نسق ممالک اسلامیہ سے بھی گیا گذرا ہے وہاں تو یورپی سلطنتیں کسی قسم کے امتیاز کی طالب نہیں ہوتیں اگر دعویٰ کیا جاتا ہے کہ بعض مسلمان نصاریٰ سے نفرت کرتے ہیں اور ان سے بدسلوکی کرتے ہیں تو ہم بھی جوابی الزام دے سکتے ہیں کہ عیسائی بھی مسلمانوں پر مظالم توڑتے ہیں اور ان پر ظلم و ستم روا رکھتے ہیں۔

اس کے علاوہ بعض یورپی ممالک اسلامی ملکوں کی تنظیم کے معاملات میں مشکلات کھڑی کر دیتے ہیں اس طرح وہاں کی حکومتیں اصلاح اور عدم اصلاح کے چکر میں پڑ جاتی ہیں۔

مسلمانوں کی ترقی کے راستے میں دو طبقوں کی موجودگی رکاوٹ بنی ہوئی ہے علمائے دین صرف شریعت کو جانتے ہیں اور دنیاوی امور سے ناواقف ہیں اور نئے حالات سے صرف نظر کر کے تمام دینی احکام کی مطابقت چاہتے ہیں سیاسی مدبر صرف دنیا کو دیکھتے ہیں اور دین سے ناواقف ہیں اور وہ مذہب کی طرف رجوع کئے بغیر یورپ کے قوانین کا نفاذ چاہتے ہیں ہم پہلے طبقہ سے کہیں گے کہ دنیا کو اچھی طرح پہچانو۔ دوسرے کی خدمت میں گذارش کریں گے کہ دین سے واقفیت بہم پہنچاؤ علماء دنیاوی معاملات چھوڑ بیٹھے جس سے ضرر پیدا ہوا سیاست مدار مذہبی اصولوں سے جاہل ہو بیٹھے تو اس سے بھی قوم کو نقصان پہنچا یہ امر ضروری ہے کہ دونوں طبقوں کو ملا دیا جائے اور ان کا تعاون حاصل کیا جائے واجب ہے کہ دینی اصولوں

کو مدنظر رکھا جائے اور جن امور کے متعلق مذہبی احکام میں کوئی صراحت نہیں آئی ان پر قوم کی مصلحت دیکھتے ہوئے نفع اور نقصان کا حکم لگا دیا جائے اور عقل سے کام لیا جائے۔

پھر آپ نے جدید مدنیت کے وہ مبادیات بیان کئے ہیں جن پر اس کی عمارت قائم ہے اور جن کو اخذ و اقتباس کے بعد مملکت اسلامیہ میں رائج کیا جا سکتا ہے جیسے آزادی اس کی دو قسمیں ہیں۔ حریت شخصی انسان کو روزی کمانے کی آزادی اس کے نفس، عزت اور مال کا تحفظ۔ تمام باشندوں کے حقوق و واجبات میں مساوات دیتی ہے۔ حریت سیاسی مملکت کے نظم و نسق میں شرکت اور ملکی مصالح کے انتخاب میں دخل اندازی۔ قانون سازی۔ راعی اور رعایا کے حقوق کا تعین اور مجلس شوریٰ میں عوام کے سامنے وزراء کی جواب دہی کا نام ہے۔

انہوں نے اس رائے پر بحث کا اختتام کیا ہے کہ ایسے نظام کی ایجاد ہی وقتی ضرورت ہے اور جو اس راہ میں رکاوٹ ڈالے گا وہ اپنے ملک اور حکومت کا خیر خواہ نہ ہو گا' یہ ان کے مقدمہ کا خلاصہ ہے جو سو صفحات پر محیط ہے۔ جس سے ہم اصلاح کے بارے ان کے خیالات اور نظریات سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں اب ہم ان کی زندگی کے باقی ماندہ واقعات پیش کرتے ہیں۔

○

خیر الدین نے وزارت کو خیر باد کہا اور اصلاحی کوششوں سے دست بردار ہو گئے تو اب سیاسی میدان مصطفیٰ خزنہ دار کے ہاتھ تھا عوام کو مظالم اور لوٹ کھسوٹ سے تنگ کرنے لگا باکی محمد صادق پاشا نرم مزاج تھا نہ کسی مشکل کو دیکھنا چاہتا تھا اور نہ کسی شکایت کو سننا چاہتا۔ تمام امور سلطنت پر وزیر حاوی تھا اسے صرف اتنا خیال رہتا تھا کہ وہ بائی کو عیش و عشرت کے لئے روپیہ دیتا رہے۔ نمائندہ مجلس اس کے استبداد کی راہ میں کانٹا بنی ہوئی تھی اس نے مجلس کو معطل کر دیا جس سے معاملات پرانی ڈگر پر چلنے لگے وزیر جیسے چاہتا نئے ٹیکس عائد کرتا اور جس طرح چاہتا وصول کرتا آہستہ آہستہ ملک کی مالیات کا منبع سوکھنے لگا اس نے یورپ سے قرض لینے کی گفت و شنید کی سات سال میں قرض کی مقدار ۱۰۰ ملین فرانک تک پہنچ گئی۔

ملک مصائب میں پھنس گیا لوگ ٹیکسوں کی روز افزوں گرانباری سے حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے کیونکہ ان کی تحصیل میں سختی سے کام لیا جاتا تھا جس کا نتیجہ افلاس پر منتج ہوا۔ بالآخر ملکی خزانہ میں بائی کے خاندان کے وظائف اور سرکاری ملازموں اور سپاہیوں کی تنخواہ ادا کرنے کے لئے کچھ بھی نہ رہا لوگ اپنی عورتوں کو گھاس پھونس اور درختوں

کی بڑتیں جمع کرنے کے لئے باہر بھیجنے لگے تاکہ ان سے خوراک کا کام لیں۔ جس کسی کے پاس تھوڑا سا مال رہ گیا تھا وہ اس نے چھپا لیا اور غربت ظاہر کرنے لگا۔ رات کو گھروں میں آٹا گے بجائے صرف گندم اُبالی جاتی تھی تاکہ کوئی فراخی کا الزام نہ دے اس سے بیماری خوب پھیلی اور موت کا بازار گرم ہو گیا۔ دول یورپ کو اپنے قرض کی حفاظت کے بہانے دخل اندازی کا موقعہ ملا حکومت فرانس نے مالی کمیٹی کی تشکیل کی درخواست کی انگلستان اور اطالیہ نے بھی موافقت کی بائی کے فرمان کے مطابق ۱۲۸۶ھ میں ایک کمیٹی بنائی گئی جس کا صدر فرانسیسی اور ممبر اطالیہ اور انگلستان تھے اس کی غرض قرضہ کو یکجا کرنا اور اس کی ادائیگی کے لئے ایک شعبہ قائم کرنا تھا۔

یہ سیاسی کہانی ایک ہی قسم کی تھی جو کبھی مصر تو کبھی تونس میں دہرائی جاتی ہاں اس کے کردار مختلف ہوتے۔

اسی خلفشار کے زمانہ میں بائی نے خیر الدین کو اس کمیٹی کا صدر بننے کو کہا۔ خیر الدین نے معذرت پیش کر دی زیادہ اصرار کیا تو انہوں نے مان لیا ملک اور بیرون ملک میں یہ جان جوکھوں کا کام تھا خیر الدین وزیر کے لقب سے ملقب ہوئے ظرفہ تماشہ یہ ہے کہ اس تمام تر تباہی کے ذمہ دار مصطفیٰ کو بائی نے وزارت پر بحال رکھا اس کی وجہ بائی کی کمزوری اور بزدلی تھی اس کی حالت اژدہا کے مقابلہ میں چڑیا کی تھی۔

اب خیر الدین کو مشکل ترین معاملات سے واسطہ پڑا مالی کمیٹی ہر ملکی معاملہ میں ہاتھ ڈالنا چاہتی تھی کیونکہ سب چیزوں کا تعلق مالیات سے تھا مدرسہ کا مدرس اور محکمہ کا قاضی بھی اس کی زد میں تھے اس سے ملکی آزادی کو بھی خطرہ تھا۔

دوسری مشکل یہ تھی کہ لوگوں کو فقر و فاقہ کے چنگل سے نکال کر ان کے دلوں میں حکومت کا اعتماد پیدا کرنا تھا۔

تیسری مشکل مصطفیٰ وزیر کا وجود تھا جو جاہ و جلال کے علاوہ مال و منال کا بھو کا تھا قاعدہ ہے کہ جو ایک دفعہ ان کاموں کا چسکہ لے وہ ان سے از خود علیحدہ نہیں ہو سکتا وہ طبعی اور تاریخی طور پر تمام اصلاحات کا دشمن تھا اور اپنے اقتدار میں کسی کی شرکت کو گوارہ نہ کرتا تھا

پہلی مشکل پر تو انہوں نے اس طرح قابو پایا کہ کمیٹی کے ارکان سے طویل طویل گفت و شنید کے بعد اس کا دائرہ کار محدود کر دیا اور انہیں آمادہ کر لیا کہ بجٹ کی تنظیم کے بعد قرض خواہوں کا قرض اتارنے کا بندوبست کیا جائے۔ دوسری جانب انہوں نے دیکھا کہ ٹیکسوں کی کثرت سے زراعت کا ستیاناس ہو کر ملک ویران ہو گیا ہے جب لوگوں نے دیکھا کہ زراعت سے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوتا تو انہوں نے زراعت ہی چھوڑ دی آپ نے ٹیکس کم کئے اور ان کی وصولی کی تنظیم کی ...... قانون کی نظر اندازی کو جرم قابلِ مواخذہ قرار دیا کھجور اور زیتون کی کاشت کی حوصلہ افزائی کی نئے کاشت کار کو بیس سال تک مالیہ سے معاف رکھا۔ بقایا جات بخش دیئے سابقہ حکومت کے ہاتھوں

عوام جن مصائب میں مبتلا تھے ان کا ازالہ کیا تونس کے میدان میں ایک صندوق رکھ دیا جس میں ہر مظلوم بغیر نام کی تصریح کے عرضداشت ڈال سکتا تھا صندوق کی چابی ان کے قبضہ میں رہتی تھی یہ صندوق وہ خود کھولتے عرضداشتوں کو پڑھتے اور ان پر مناسب احکام صادر کرتے۔

تیسری مشکل مصطفیٰ وزیر کا وجود نامسعود تھا اب اس کے عیوب سے پردہ اٹھا تو لوگوں نے اس کی برطرفی کیلئے اصرار کیا بالآخر ۱۲۹۱ھ میں وزارت سے معزول کر دیا گیا لوگوں نے بے حد خوشیاں منائیں خیر الدین نے حکم دیا کہ الزامات کی بنا پر اس پر مقدمہ چلایا جائے مقدمہ چلا تو اس کو پچیس ملین فرنک دینے آئے اس طرح .... مصطفیٰ کی عملی زندگی اختتام کو پہنچی۔ تیس سال کی مدت میں اس کی مردہ ضمیری کی وجہ سے قوم کو بے شمار مصائب کا سامنا کرنا پڑا تھا لوگوں میں اس کے خلاف آواز اٹھانے کی ہمت نہ تھی کہ وہ اس کی علیحدگی کا مطالبہ کرتے۔ ان ذلت آمیز حالات کی برداشت کو سوائے قوم کی بدبختی کے اور کسی چیز پر محمول نہیں کیا جا سکتا ان حالات میں خیر الدین وزارت عظمیٰ پر فائز ہوئے تو انہوں نے سرگرمی سے قابل اصلاح امور کی اصلاح کی۔ سب سوائے مغربی استعمار کے کوئی طاقت بھی ان کے کام میں مداخلت نہ کر سکتی تھی لہذا انہوں نے ملک کی سیاسی۔ زراعتی۔ تعلیمی اقتصادی۔ مالی۔ انتظامی اور عدلی اصلاح کا کام ہاتھ میں لیا۔ وہ یورپ کی قونصلوں سے دانشمندی کا برتاؤ کیا۔ ان کے معقول مطالبات کی طرف توجہ دیتے اور غیر معقول کو ٹال دیتے اس بارے میں نرمی اور منافقت سے کام نہ لیتے۔ لہذا وہ ان کا احترام کرتے اور ان سے ڈرتے تھے بظاہر مجاملت سے پیش آتے لیکن بباطن ان کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتے۔ زراعت کو منظوں پر تقسیم کیا ٹیکس کی وصولی کے لئے انسپکٹر مقرر کئے جو کوئی نقد ٹیکس ادا کرنا چاہتا اس سے نقد رقم لی جاتی خائن انسپکٹر کو سزا دی جاتی۔ مالکوں اپنے مزارعوں اور حکومت کے درمیان تعلقات استوار کئے جو ٹیکس غیر معقول تھے یا جن کی ادائیگی کی مزارعوں کو استطاعت نہ تھی معاف کر دیئے۔ بالجبر وصولی کی ممانعت کر دی۔ کیونکہ اس سے فوجیوں کو لوٹ کھسوٹ کا موقعہ ہاتھ آتا تھا ان تدابیر سے لوگوں میں اطمینان خاطر پیدا ہوا سرکاری ہیبت اور وقار بحال ہو گیا لوگ کھیتی باڑی میں لگ گئے قابل کاشت زمین کا رقبہ ساٹھ ہزار ہکٹر سے بڑھ کر ایک ملین ہکٹر تک جا پہنچا۔

تعلیم کے لئے مدرسہ عصریہ قائم کیا جس میں علوم عربیہ اور شرعیہ کے ساتھ ساتھ ترکی اطالوی اور فرانسیسی زبانوں کی تعلیم دی جاتی تھی جامعہ زیتونیہ کی اصلاح کی مخطوطات حساب میں بکھرے پڑے تھے ان سب کو اکٹھا

کرکے ایک عظیم الشان کتب خانہ کی بنیاد رکھی۔ سرکاری مطبع کے انتظام کو . . . . . بعقول بنایا اسے علمی اور ادبی کتابوں کی اشاعت کا ذمہ دار ٹھہرایا "الرائد التونسی" سرکاری اخبار تھا اس کے انتظام کو بہتر بنایا اس میں سیاسی مقالات کی اشاعت کی حوصلہ افزائی کی اور تمام سرکاری ملازموں کیلئے اس کا پڑھنا ضروری قرار دیا اس کے بعد ملک کی اقتصادی جانب متوجہ ہوئے۔

○

آپ نے سرکاری ملازمتوں کی تنظیم کی ان کے گریڈ مقرر کئے شاہی محل کے اخراجات کو محدود کیا سرکاری بجٹ کو صحیح بنیاد پر مرتب کیا مراسلات کا نظم وضبط قائم کیا ان کا دفتر قائم کیا تاکہ بوقت ضرورت آسانی سے ان کی طرف رجوع ہو سکے مغربی صناعات میں جدت پیدا کی جیسے عمارتوں پر نقش ونگاری کا کام ۔ مختلف شہروں سے کاریگر بلا کر نوجوانوں کی تعلیم ان کے سپرد کی۔

اوقاف کی تنظیم کی اس سے پہلے ان کے بیع وشراء اور آمدنی کا کوئی حساب کتاب نہ رکھا جاتا تھا ان کی آمدنی کا سرچشمہ سوکھنے لگا تھا انہوں نے اس کے لئے ایک ادارہ قائم کیا سید محمد بیرم کی سرکردگی میں ایک کمیٹی بنائی جو اوقاف کی تنظیم میں ان کی مدد کرتی تھی انہوں نے محکمہ قانون اور انصاف کی طرف نظر دوڑائی تو اس کو بھی ابتر حالت میں پایا۔ یورپین اپنے کو ملکی قانون کی پابندی سے آزاد سمجھتے تھے ان کو کسی قانون کا پابند کرنا آسان نہ تھا ملک میں حنفیوں اور مالکیوں کے لئے الگ الگ قاضی مقرر تھے بسا اوقات وہ مماثل مقدموں میں مختلف فیصلے دیتے غیر ملکیوں کی اطاعت کے لئے ضروری تھا کہ کوئی منظم قانون موجود ہو جس میں کسی اجتہاد یا حیلہ جوئی کی گنجائش نہ ہو خیر الدین نے قانون دانوں کے ذمہ یہ کام لگایا کہ دولت عثمانیہ مصر اور یورپ میں جن قوانین پر عمل ہو رہا ہے ان کا مطالعہ کرکے تونس کے حسب حال قانون بنا دیں یہ کمیٹی دیر تک کام کرتی رہی لیکن اس کے اتمام کار سے قبل ان کو وزارت سے دست بردار ہونا پڑا ان کوششوں سے ملک میں امن چین۔ خوشحالی اور فارغ البالی کا دور دورہ ہوا ہر شعبہ زندگی میں ترقی ہوئی اب تونس بھی مصر کے نقش قدم پر چل رہا تھا بیرونی ممالک نے کئی قسم کی پیچیدہ مشکلات پیدا کر رکھی تھیں۔ فرانس تونس کی طرف گھات لگائے ہوئے تھا۔ مداخلت کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتا ملک پر جا بجا شرکت غیر سیادت کا حق جتلاتا لوگوں کو بڑے بڑے مناصب کے عہدوں کا لالچ دیتا بعضوں کو باقی کا ٹھیکہ پیش کرتا جب وہ پھندے میں پھنس جاتے تو آنکھیں پھیر لیتا لالچ اور حرص میں اٹلی بھی فرانس سے کم نہ تھا ۱۸۷۰ء میں فرانس اور جرمنی کے درمیان جنگ ہوئی تو فرانس کو شکست فاش نصیب ہوئی اس پر اٹلی کو اپنے اثر و نفوذ کے وسیع کرنے کا خیال پیدا

ہوا اور تونس مغربی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا اکھاڑا بن گیا۔

ان مطامع اور خطرات کی موجودگی میں خیر الدین کو ایک طاقت کو دوسری طاقت سے لڑانے کی سوجھی۔ انہیں تونس اور دولت عثمانیہ کے درمیان تعلقات کی تجدید اور روابط کی پختگی کا دھیان آیا کیونکہ اکیلا تونس اپنی حفاظت کا انتظام نہ کر سکتا تھا ان دونوں ملکوں کے تعلقات مضبوط کرنے کیلئے انہوں نے ایک لائحہ عمل بنایا اس بارے میں انہوں نے باب عالی میں عرضداشت گذاری اور اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کی گفت وشنید کے لئے باب عالی نے تونسی نمائندہ طلب کیا حکومت تونس نے خیر الدین کو قسطنطنیہ بھیج دیا گفت وشنید کامیابی پر منتج ہوئی اور ایک سلطانی فرمان کی رو سے دونوں ملکوں کے اختیارات اور دائرہ کار کا تعین اس طرح ہوا کہ تونس دولت عثمانیہ کے زیر فرمان رہے گا اس کے والی کو مناصب شرعیہ ، عسکریہ ، ملکی اور مالیہ پر قابل لوگوں کی تقرری کا حق حاصل ہوگا۔ انصاف کی رو سے ان کے عزل کا بھی اختیار ہوگا ۔ بیرونی ممالک سے عام تعلقات قائم کر سکے گا سیاسی امور ۔ جنگی مہمات اور ملکی حدود میں تغیر وتبدل دولت عثمانیہ کے ذمہ ہوگا ۔ دولت عثمانیہ نے موجودہ حکمران خاندان میں حق توریث تسلیم کر لیا بشرطیکہ نماز جمعہ میں سلطان کے نام کا خطبہ پڑھا جائے اور اس کے نام کا سکہ چلے امور داخلہ میں قوانین شرع کی پیروی کی جائے۔ زمانہ اور حالات کے پیش نظر قوانین عدل کو ملحوظ رکھا جائے جس کی رو سے عوام کا جان ومال اور عزت وناموس محفوظ رہے گا ۔ یہ فرمان ۱۲۸۸ھ میں صادر ہوا تو لوگوں نے خوشی سے اسکا استقبال کیا باب عالی نے دول یورپ سے ان شرائط کو منوانا چاہا لیکن اس کی اندرونی وبیرونی خلفشار کی وجہ سے یہ کام رہ گیا فرانس نے یہ جدید نظام ماننے سے انکار کر دیا

یہ تھا خیر الدین کا پروگرام جس پر وہ کاربند ہو کر ملک کی داخلی اور اجتماعی اصلاح کرنا چاہتے تھے خارجی معاملات میں وہ دولت عثمانیہ سے تعلقات قائم کرنے کے لئے کوشاں تھے تاکہ وہ فرانس اور اٹلی کی شاطرانہ چالوں کو مات دے سکیں لیکن تاریخ ہمیں سبق دیتی ہے کہ ہر مصلح کو ستایا گیا اور اس پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا۔

(۵)

اصلاح کا کام زور شور سے جاری تھا کہ مختلف دشمن عناصر ان کے راستہ میں رکاوٹیں ڈالنے لگے یہ لوگ ان کی بددیانتی اور بدمعاملگی کی خبریں پھیلاتے ان کی نیکی کو برائی کا جامہ پہناتے ۔ رائی کو پربت بناتے آخر کس مصلح سے غلطیاں نہیں ہوتیں۔؟

بائی محمد صادق خائن مصطفیٰ کو انصاف پسند اور معاملہ فہم خیر الدین زیادہ سے زیادہ چاہتا تھا کیونکہ خیر الدین تو مقررہ رقم بائی کو دیتے تھے اور وہ بھی رعایا کے مصالح کو پیش نظر رکھتے ہوئے لیکن مصطفیٰ منہ مانگا مطالبہ منظور کر لیا کرتا تھا چاہے اس سے انصاف کا خون ہو اور قوم کا نقصان ہو ایک خشک تو دوسرا نرم خو۔ بائی جیسے امراء کا وہی منظور نظر ہو سکتا ہے جو ان کی خواہشات اور رغبات کو پورا کرتا رہے اس بنا پر بائی ان سے نفرت اور دشمنی کرنے لگا لیکن لوگوں میں انکی مقبولیت دیکھتے ہوئے علی الاعلان مخالفت بھی نہ کر سکا ظاہر میں ان کی موافقت کرتا اور باطن میں مخالفت پھر مصطفیٰ کے اعوان و انصار بھی تھے جو اس کے خوان کرم کے زلہ ربا تھے یہ لوگ سفارشی بن کر خوب کماتے تھے اور ٹیکسوں پر بھی ہاتھ صاف کرتے تھے یہ لوگ خیر الدین کو لوٹ کھسوٹ میں مانع سمجھتے تھے کیونکہ قاعدہ اور انصاف کے سامنے ان کی ایک نہ چلتی تھی یہ لوگ روشنی کے بجائے اندھیرے کو پسند کیا کرتے تھے بالآخر خیر الدین کے گرد سازشوں کا جال بچھا یہ وہ لوگ تھے جن کو اٹالیہ اور فرانس کی حمایت حاصل تھی بیرونی ملکوں نے انہیں جاہ و منصب کا لالچ دے رکھا تھا اور وہ ہمیشہ ایسے حالات پیدا کرنے کی فکر میں رہتے جن سے غیر ملکیوں کو اندرونی معاملات میں دخل اندازی کا موقعہ ملتا

خیر الدین نے تونس اور دولت عثمانیہ کے درمیان جو روابط قائم کئے تھے وہ فرانس کو ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ وہ ملک پر اپنا تسلط قائم کرنے کی فکر میں لگا ہوا تھا ایک دفعہ خیر الدین قسطنطنیہ کے سفر پر عازم ہوا چاہتے تھے کہ ایک شخص ان سے ملاقاتی ہوا یہ فرانسیسی سفارت خانہ کا طرجمان تھا اس نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ واقعی عزم سفر رکھتے ہیں؟ آپ نے اثبات میں جواب دیا تو اس نے درخواست کی کہ آپ دو تین دن تک فرانسیسی قونصل کا انتظار کریں وہ پیرس سے واپس آرہا ہے۔

خیر الدین: تم جیسے فوجیوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں اپنی حکومت کی نافرمانبرداری نہیں کرنا چاہتا اور نہ اپنے فرائض کو چھوڑ کر تمہارے قونصل کی مجاملت کرنا چاہتا ہوں میں تو مقررہ وقت پر روانہ ہو رہا ہوں۔

فوجی: میں آپ کو متنبہ کرتا ہوں کہ ہم بزور و جبر آپ کو جانے سے روک سکتے ہیں۔

خیر الدین: آپ جو چاہے کر سکتے ہیں میں فرانسیسی قونصل کے زیر فرمان نہیں ہوں کہ اس کے احکام و اوامر پر چلوں نہ اپنا پروگرام تبدیل کر سکتا ہوں۔ ہماری حکومت تو آزاد ہے سفر سے واپسی پر آپ کے آقا کو کافی وقت دوں گا اور بالمشافہ اپنا عندیہ ظاہر کروں گا۔ جہاز وقت مقرر پر چل دے گا تم جس چیز کی دھمکی دیتے ہو اسکو عمل میں لے آؤ میں اس سے نپٹ لوں گا شام کو جہاز روانہ ہوا تو ایک فرانسیسی کشتی میں اس کے تعاقب میں گئی وہ بہر

لحظہ واپسی کا اشارہ کرتی رہی بالآخر صبح ہوئی تو یہ فرانسیسی کشتی ناکام واپس آگئی

اب بہت سے عناصر ان کے زوال کے درپے تھے ان کو بدنام کرنے کے لئے اتہام باندھے جاتے۔ مشہور ترین الزام دو تھے۔

(۱) ان کے سیاسی مخالفوں نے تہمت لگائی تھی کہ وہ الجزائر اور تونس میں ریل گاڑی چلانے کے لئے ایک فرانسیسی فرم کو ٹھیکہ دینا چاہتے ہیں خیرالدین فرانس کے ناپاک عزائم سے باخبر تھے وہ جانتے تھے کہ اگر فرانس کو تونس میں ریل گاڑی بچھانے کی اجازت مل گئی تو وہ الجزائر سے فوج لا کر تونس پر قبضہ کر سکتا ہے پھر یہ معاملہ خالی از خطرہ نہ تھا۔ مخالفوں نے اس الزام کو خوب بڑھا چڑھا کر بیان کیا وہ ایک پتھر سے دو شکار کرنا چاہتے تھے ایک تو وطن دوست حلقوں میں ان کو بے اعتبار کرنا دوسرے دولت عثمانیہ کے دربار میں ان کو بے آبرو کرنا جو ان کو اپنا آدمی سمجھتی تھی۔۔

خیرالدین اور ان کی جماعت جواب میں یہ کہتی تھی کہ اس مسئلہ کی طویل تاریخ ہے مصطفی وزیر خزانہ کے زمانہ میں ایک۔۔۔۔ انگریزی فرم نے تونس اور حلق الوادی کے درمیان ریلوے کی پٹڑی بچھانے کی اجازت طلب کی تھی جو اس کو دیدی گئی اس نے یہ ریلوے لائن ایک اطالوی فرم کے ہاتھ بیچ دی پھر اسی انگریزی فرم نے تونس کے دوسرے شہروں میں بھی ریلوے لائن بچھانے کی اجازت مانگی ہاتی اور مجلس شوریٰ نے اجازت دیدی کیونکہ وہ مواصلات کی آسانی۔۔۔۔۔ کے لئے ریل لائن کو ضروری سمجھتے تھے لیکن یہ کمپنی سرمایہ فراہم نہ کر سکی بلکہ حکومت سے چوتھائی خرچہ برداشت کرنے کو کہا لیکن حکومت نے کوئی جواب نہ دیا اس پر کمپنی مہلت پر مہلت طلب کرتی رہی تا آنکہ ٹھیکہ ہی ختم ہو گیا۔

خیرالدین کی وزارت کے زمانے میں ایک فرانسیسی کمپنی نے الجزائر اور تونس کے درمیان ریلوے لائن تعمیر کرنے کی اجازت مانگی خیرالدین نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ حدود کا مسئلہ ہے جو باب عالی کی اجازت کے بغیر طے نہیں ہو سکتا کمپنی نے یہ سمجھا کہ اگر باب عالی سے اجازت طلب کی تو اس کا یہ مطلب ہو گا کہ تونس پر باب عالی کی سیادت مان لی گئی ہے ناچار اس نے انگریزی فرم کی جگہ لینی چاہی اور اس کے شرائط کی پابندی بھی مان لی کیونکہ اس سے معاملہ تونسی حکومت کی حدود میں رہ جائے گا۔ خیرالدین نے یہ معاملہ مجلس وزراء میں پیش کیا جس نے منظور کر لیا ان کی معزولی کے آٹھ ماہ بعد کمپنی کو الجزائر تک ریلوے لائن کی توسیع کرنے کا فرمان مل گیا

خیرالدین کہتے تھے کہ میں نے سرحدوں تک ریلوے لائن بچھانے کی اجازت نہیں دی یا اگر برطانیہ کی طرح فرانس کو بھی یہ اذن مل جاتا تو اس سے کئی قسم کی مشکلات پیدا ہو جاتیں یہ درست ہے کہ ریلوے لائن کی تعمیر میں حکومت کی مصلحت ہے اور بہتر تھا کہ حکومت یا مقامی باشندے یہ کام سرانجام دیتے لیکن حکومت کے ذرائع محدود ہیں۔

جن کا بڑا حصہ سود کی ادائیگی میں اٹھ جاتا ہے اور لوگ یا تو جاہل ہیں یا امیر جنہیں .... ٹیکہ وغیرہ کا کچھ علم نہیں اور وہ کسی قسم کا انتظام نہیں کر سکتے ہیں اب دو صورتیں ہیں یا تو بیرونی کمپنی کو کام دیا جائے یا بالکل صبر کر کے بیٹھا جائے سچ بات یہ ہے کہ خیر الدین کا موقف کمزور تھا یہ امر تو بدیہی تھا کہ ریلوے لائن کے تعمیر ہونے سے غیروں کو پاؤں پسارنے کا موقع مل جاتا ہے حزم واحتیاط کا تقاضا تھا کہ شروع میں انکار کیا جاتا۔

سقوط تونس کے بعد ان کو اپنے دلائل کے بودا پن کا احساس ہوا انہوں نے یہ کہہ کر اپنے ضمیر کو تسلی دی کہ فرانسیسیوں نے طبرق اور بنزرت سے فوج لا کر تونس کی حدود میں داخل کر دی ہے اور ریلوے لائن سے کام نہیں لیا۔

وہ کہتے تھے کہ ریلوے لائن کی تعمیر نے تونس کو کچھ نقصان نہیں پہنچایا اور نہ ہی اس کی عدم تعمیر ملک کے بقا کی ضامن تھی بلکہ ملک کی سالمیت دولت عثمانیہ کی وحدت پر منحصر تھی جو کہ مغربی ضمیر کے رحم وکرم پر تھی یورپ نے فرانس کو تونس میں من مانی کاروائی کرنے کی کھلی چھٹی دے رکھی تھی اس وجہ سے ریلوے لائن بن کر رہی یہ تو ایک قسم کی مایوسی تھی جس کا ایک مصلح کے دل میں گذرنا قرین صواب نہیں ہے۔

بعض لوگ نکتہ چینی کرتے تھے کہ وہ جب دوبارہ وزارت پر فائز ہوئے تو انہوں نے برائیوں کی اصلاح کی نہ قوانین شوریٰ کو بحال کیا بلکہ اپنی مرضی کے مطابق کام کرتے رہے اور کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی حاکم خود رائے مگر انصاف پسند ہو تو اس کے انصاف کی کوئی چیز ضامن نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ تو اس کی شخصیت اور اس کے عہد سے وابستہ ہے اس کو چاہیئے کہ نمائندہ حکومت سے ملک کو استوار کرے تاکہ عوام اس کے لذت شناس ہو کر اس کے منافع سے بہرہ ور ہو سکیں۔

اس کے جواب میں وہ یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ مملکت اسلامیہ میں نمائندہ حکومت کے لئے دو چیزوں کی شرط ہے بادشاہ یا امیر کی ذاتی خواہش یا اس کے لئے عوام کا پر زور مطالبہ یہ دونوں باتیں تونس میں ناپید ہیں۔ بای کو تو سرے سے یہ نظام ناپسند ہے اور رائے عامہ ابھی تک جاہل ہے اس کو چند لکھے پڑھے اشخاص ہی سمجھ سکتے ہیں ہم فرض کر لیتے ہیں کہ امیر ملک اس نظام کو مان لے گا لیکن جونہی اسے فرصت ہاتھ آئے گی وہ اسے کالعدم کر کے رہے گا جیسے کہ پہلے ہو چکا ہے جدید نظام کے برقرار رکھنے کے لئے عوام کی طاقت ضروری ہے ان کے مخالف ان کے دلائل کو نا قابل اعتنا سمجھتے تھے کیونکہ وہ جب دوبارہ وزیر بنے تھے تو تمام امور کے خود نگران تھے اگر وہ دباؤ ڈالتے تو بای نمائندہ حکومت پر راضی ہو سکتا تھا اور عوام بھی ہم نوا اور مطمئن ہو کر اس ضرورت کے قائل ہو سکتے تھے۔

ان کے محاسن و معائب کا یہ مختصر سا تذکرہ ہے دوسری بار جب وہ وزیر بنے تو انہوں نے اپنی مرضی مگر انصاف سے حکم چلایا اس وقت ملک میں انتشار اور بدنظمی کا دور دورہ تھا انہوں نے مفسدوں اور فتنہ پردازوں کو اپنے آہنی پنجہ سے پکڑے رکھا۔ سارے ملک کو ایک امیر کی اطاعت کے آگے جھکایا سیاسی امور کو عقلمندی اور ہوشیاری سے نپٹایا اب تمام معاملات کا درد بست ان کی ذات سے وابستہ تھا۔

بائی چغلخوروں اور دسیسہ کاروں کی افواہوں پر کان دھرنے اور ان سے اعراض کرنے لگا ان کے متعلق متناقض افواہیں پھیلائی جاتیں ایک فریق کہتا کہ خیر الدین فرانس کو ملک سپرد کرنے والے ہیں کیونکہ ریلوے کی تعمیر کا ٹھیکہ فرانسیسی فرم کو دیدیا گیا ہے دوسرا یہ کہتا کہ وہ ملک کو دولت عثمانیہ کی نگرانی میں دے کر اس کی آزادی سلب کر دینا چاہتے ہیں۔ ان کے بعض دوستوں نے انہیں نصیحت کی تھی کہ وہ اپنے تصرفات میں دیگر وزراء کو بھی شریک کیا کریں تاکہ جوابدہی کے لئے سب ذمہ دار ہوں اور وزارت کو مختلف شعبوں میں تقسیم کر کے سیکرٹریوں کے ذمے چھوٹے موٹے کام لگا دیں۔ تاکہ تقسیم کار سے وہ اہم معاملات کی طرف زیادہ توجہ دے سکیں لیکن وہ ان لوگوں میں تھے جن کو اپنی ذات اور اللہ تعالی پر بھروسا ہوتا ہے وہ ڈرتے تھے کہ اس تقسیم کار سے اور زیادہ الجھنیں نہ پیدا ہو جائیں لہذا تمام امور سلطنت انہوں نے اپنے ہاتھ میں رکھے

بالآخر فتنہ پردازوں کی شرارتیں رنگ لا کر رہیں بائی اور ان میں اختلافات کی خلیج بڑھتی گئی دوسری مصیبت یہ ہوئی کہ ترکی اور روس میں جنگ چھڑ گئی۔ باب عالی نے دیگر صوبوں کی طرح تونس سے بھی مدد کی درخواست کی بائی نے تو اس درخواست کو ٹالنا چاہا لیکن خیر الدین نے جوش حمیت میں دالفنیر بھیجنے کی اپیل کی اور اہالیان تونس سے جو کچھ امداد ہو سکی وہ انہوں نے باب عالی کی خدمت میں روانہ کر دی اس سے بائی کا دل خیر الدین سے اور ہٹا کیونکہ وہ تونس اور ترکی کے درمیان ارتباط اور تعلق کا حامی نہ تھا۔

خیر الدین کو عوام میں بے پناہ مقبولیت حاصل تھی اور بائی ان پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ڈرتا تھا لیکن جب اس نے مختلف افواہیں سنیں تو اظہار ناراضگی کیا اس پر خیر الدین نے استعفیٰ پیش کر دیا جو منظور کر لیا گیا یہ ۱۲۹۴ھ کا واقعہ ہے۔ بائی نے سرکاری عہدے داروں کو خیر الدین سے ملنے جلنے پر روک دیا بعضوں نے اجازت مانگی تو نہ مل سکی بلکہ ان کے گھر کے ارد گرد جاسوس بٹھا دئے گئے اب وہ ایک طرح سے نظر بند تھے جب خیر الدین اس زندگی سے اکتا گئے تو انہوں نے علاج کی غرض سے یورپ کے سفر کی اجازت مانگی پہلے تو بائی نے انکار کیا۔ لیکن بعد میں اس شرط پر راضی ہو گیا کہ وہ واپسی پر سیاسی معاملات میں دخیل نہ ہوں گے خیر الدین نے یہ شرط قبول نہ کی اس پر ان پر سخت پابندیاں لگا دی گئیں۔

خیر الدین نے وزارت سے علیحدہ ہونے پر سختی کا زمانہ گذارا اب ان کے پاس نہ کوئی آتا تھا اور نہ وہ کسی سے ملتے تھے اس دفعہ انہیں تالیف و تصنیف کا بھی شوق نہ پیدا ہو سکا زمانہ ماضی میں جب وہ وزارت سے علیحدہ ہوئے تھے تو لکھنے پڑھنے کا شغل اختیار کر لیا تھا لیکن اب وہ بوڑھے ہو چکے تھے اور مایوس ہو کر دیکھ رہے تھے کہ بائی اور اس کے اعوان و انصار نے ان کے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا ہے اب فرانس ملک ہڑپ کرنے کے لئے قدم بڑھا رہا تھا خیر الدین یہ دیکھ کر دل گرفتہ ہو جاتے اور سوچتے سوچتے ان کے اعصاب تھک جاتے بالآخر وہ کھلی فضا میں سانس لینے کے لئے یورپ چلے گئے لیکن وہاں کی فضا بھی انہیں راس نہ آئی اور وطن کی یاد انہیں ستانے لگی وہ دو دفعہ ایسا کر چکے تھے گویا کہ وہ بیماری کا بیماری سے علاج کر رہے تھے ایک دفعہ انہیں آستانہ میں حاضر ہونے کا پیغام ملا بائی تو انہیں اجازت دینے میں متردد تھا لیکن دول یورپ کے قونصلوں سے مشورہ لینے پر بالآخر مان گیا خیر الدین نے ۱۲۹۵ھ میں آستانہ کا سفر اختیار کیا یہ سفر بڑا المناک تھا کیونکہ بائی نے کسی کو ان سے ملنے کی اجازت نہ دی تھی - انہوں نے اپنے مال و منال اور اہل و عیال کو ایک ایسے شخص کی حفاظت میں چھوڑا جس پر کچھ زیادہ اعتماد نہ ہو سکتا تھا ان کی جائداد زرعی اور سکنی بھی تھی پہلے بائیوں نے انہیں محلات اور زیتون کے باغات حسن خدمت کی وجہ سے عطا کئے ہوئے تھے آپ نے تونسی حکومت کو ان کی خرید کے لئے کہا کیوں کہ آپ کا ارادہ آستانہ میں مستقل اقامت اختیار کرنے کا تھا لیکن حکومت نے انکار کر دیا آپ نے کھلے نیلام کا اعلان کیا لیکن بائی کے ڈر سے کوئی بھی خریدنے کی حامی نہ بھرتا تھا جب ایک سال کے بعد فرانسیسیوں سے سودا ہوا تو انہوں نے بہت کم قیمت ادا کی -

جب آستانہ پہنچے تو سلطان عبد الحمید کے نمائندے سلیمان انشا حمدی پاشا اور علی فواد اول سیکرٹری سلطان کو منتظر پایا وہ انہیں قصر یلدز لے گئے جہاں سلطان نے انکو شام کے وقت شرف باریابی بخشا دیر تک بات چیت کی اور ان کی فہم و فراست کا امتحان لینے کے لئے رات کے کھانے تک ٹھہرائے رکھا۔

سلطان کے حکم کے مطابق انہیں رہائش کے لئے محل عطا کیا اور سلیمان پاشا کو انکے اہل و عیال کو لانے کیلئے تونس بھیجا گیا زیادہ دیر نہ گذری تھی کہ انہیں وزارت سے سرفراز کیا گیا جہات مسائل میں ان کا مشورہ ناگزیر تھا۔ اس کے بعد سلطان نے انہیں وزیر انصاف مقرر کرنا چاہا تو آپ نے سلطان سے ل کر اس پیشکش کو نامنظور کر دیا اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے بقول ملک کی کما حقہ خدمت وہی شخص انجام دے سکتا ہے جو اس کے حالات سے اچھی طرح واقف ہو اس کے باشندوں کو خوب پہچانتا اور اچھی طرح واقفیت رکھتا ہو اور ذرائع اصلاح سے باخبر ہو۔ تو ظاہر میں صورت حال تھی اندرونی طور پر وہ جانتے تھے کہ ملک کا علاج جدید وسائل کو بروئے کار لائے بغیر نہیں ہو سکتا۔

اس کے علاوہ انہیں وطن کی یاد بھی رہ رہ کر ستا رہی تھی وہ جلد از جلد تونس واپس جانا چاہتے تھے۔

۴ر دسمبر ۱۸۷۸ء کی صبح کو........ سلطان نے انہیں یاد کیا اور وزارت عظمیٰ پیش کی جب انہوں نے ... معذرت کی ..... تو معلوم ہوا کہ اس قسم کا فرمان جاری ہو چکا ہے۔

ان کی وزارت عظمیٰ کے زمانہ میں ترکی شدید خطرات میں گھرا ہوا تھا اور مختلف قسم کی پیچیدہ مشکلات درپیش تھیں اس وقت ترکی روس سے برسرپیکار تھا۔ اور ترکی فوجیں پسپا ہو رہی تھیں روسی پیشقدمی سے قسطنطنیہ کو خطرہ لاحق ہو رہا تھا برطانوی بیڑہ آبنائے باسفورس میں موجود تھا ملک کی داخلی اور مالی حالت اچھی نہ تھی سکہ کی قیمت گرنے سے بازار بند ہو رہے تھے دارالخلافہ میں ۳۸۰۰۰ مہاجر موجود تھے جن کا کوئی والی وارث نہ تھا ۱۸۷۸ء کے معاہدہ سٹیفانو منعقدہ برلن کی شرائط بڑی لمبی چوڑی تھیں اس کی رو سے روس اور ترکی میں صلح نامہ ہوا تھا لیکن روس نے کہہ دیا تھا کہ جب تک صلح کی تمام شرائط پوری نہ ہو جائیں وہ اپنی فوجیں ترکی سے باہر نہیں نکالے گا ادھر انگریز بضد تھے کہ جب تک روسی فوجیں ترکی میں موجود رہیں گی ان کا بیڑہ باسفورس سے نہ نکلے گا قبرص کا معاملہ الگ معلق تھا آسٹریا نے بوسینیہ پر قبضہ کر رکھا تھا امینوں کی قائم کردہ مشکلات ان کے سوا تھیں ان حالات نے تمام ملک کو گرم تنور بنا رکھا تھا اب خیرالدین اس آگ کو بجھانے کے لئے آگے بڑھے ان کی پالیسی تھی کہ جتنا کچھ بچایا جا سکتا ہے بچا لیا جائے۔

آخر بڑی کوششوں کے بعد انہوں نے روس سے اپنی شرائط منوالیں اور بلغاریہ اور مشرقی رومیلی میں مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کرایا اس کے بعد روسی فوجیں بلغاریہ اور رومیلی تک چلی گئیں برطانوی بیڑہ بحیرہ مرمرہ سے باہر نکل گیا ترکی اور آسٹریا میں بھی اتفاق رائے پیدا ہو گیا اور ترکی کے بہت سے حقوق محفوظ ہو گئے ادمتی مسئلہ جو نو سال سے لٹک رہا تھا بخیر و خوبی حل ہو گیا اس طرح دولت عثمانیہ کو جس طرح بچایا جا سکتا تھا انہوں نے بچا لیا۔

ان کے ایام وزارت میں مصر کا قضیہ پیدا ہوا تھا خدیو اسماعیل کے آواخر عہد میں جب مصر کی مالی اور سیاسی حالت زیادہ بگڑنے لگی تو انگلستان اور فرانس نے جدید طرز پر ملک میں مداخلت کی ٹھانی انہوں نے مصر میں اپنے سفراء کے ذریعے خدیو اسماعیل کو یہ پیغام پہنچایا کہ وہ اپنے بڑے لڑکے توفیق کے حق میں تاج و تخت سے دستبردار ہو جائے خدیو اسماعیل نے جواب دیا کہ انہیں عزل و نصب کرنے کا اختیار تو باب عالی کو حاصل ہے اس کو امید تھی کہ شاید دولت عثمانیہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کے مطالبہ کو ٹال سکے گی جرمن اور آسٹریا کی حکومتوں کی موافقت نے صورت حال نازک بنا دی۔ اب خیرالدین عجیب مصیبت میں تھے اگر وہ یورپی طاقتوں کی ہم نوائی کرتے ہیں تو گویا مصری معاملات میں ان کو دخل دینے کا حق دیتے ہیں اگر وہ ان کا مطالبہ نامنظور کر دیتے ہیں تو تمام یورپ

کی مخالفت مول لیتے ہیں اس سے مصر اور دولت عثمانیہ میں رہے سہے تعلقات بھی ختم ہو جاتے ہیں اور برطانیہ ملک مصر کو اور دوسرا تونس کو ہڑپ کر جانا چاہتا ہے۔

خیر الدین ادھر ان کے وزیر دیر تک سرگرداں رہے آخر ان کی رائے ہوئی کہ طوفان کے سامنے تھوڑا سا جھک جانا چاہیئے انہوں نے سلطان کو خدیو اسماعیل کی برطرفی کا مشورہ دیا ساتھ ہی دفع تدارک کے لئے اس کے بہت سے اختیارات چھین لئے جن میں قرضہ مانگنا اور بیرونی ملکوں سے معاہدات بھی کرنا تھا لیکن انگریز نہ مانے کیوں کہ اس سے باب عالی کی مصری معاملات پر گرفت مضبوط ہوتی تھی ان کے مفادات اس بات کے متقاضی تھے کہ مصر کو زیادہ سے زیادہ اختیارات حاصل رہیں۔

آخر کار خدیو اسماعیل کی برطرفی کا فرمان جاری ہوگیا اس فرمان کے درست اور نادرست ہونے کی بحث چل پڑی جس سے خیر الدین کو مستعفی ہونا پڑا دوسری وزارت قائم ہوئی تو اس نے بیرونی طاقتوں کے منشاء کے مطابق دوسرا ترمیم شدہ فرمان صادر کر دیا۔

وزارت عظمیٰ کے یہ آٹھ ماہ آٹھ سالوں کے برابر تھے اگر ان کو مشکلات کے عقدہ کو وا کرنے کے لئے نہ کہا جاتا تو وہ اتنی دیر وزارت میں نہ ٹھہرتے کیونکہ ان کا مزاج سلطانی مزاج سے متغایر تھا وہ حریت پسند وسیع الخیال اور اصلاح کے پُرجوش حامی تھے جب انہیں وزارت عظمیٰ سونپی گئی تو چاروناچار انہیں ذمہ داریوں کو نبھانا پڑا انہیں ناگوار تھا کہ سلطان تو حکم صادر کرتا رہے اور اس کے نتائج کے وہ جواب دہ ہوں۔ یہ انصاف پسندی سے بعید ہے سلطان کو جی حضور وزیر اعظم پسند تھا اور وہ آزاد منش تھے لہذا سلطان ان سے کبیدہ خاطر رہنے لگا۔

علمائے دین بھی ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے کیونکہ خیر الدین ان کی تنگ نظری سے نالاں تھے۔ اور سمجھتے تھے کہ انکو امور سلطنت مملکت سے وہ ناواقف ہیں دخل اندازی کا حق نہیں پہنچتا یہی طبقہ اپنے مخصوص مفاد کی خاطر انہیں سنگ گراں سمجھتا تھا۔

ان وجوہات کی بنا پر وہ آٹھ ماہ کے بعد وزارت عظمیٰ سے معزول کر دیئے گئے ان کا زوال ان کے عروج کے کس قدر مشابہ تھا۔ سلطان عبد الحمید نے ان کے بارے میں جو توقعات قائم کی تھیں وہ پوری نہ ہوئیں لیکن وہ خود دس سال عضو معطل کی طرح پڑا رہا اور اسے ہر جگہ مایوسی ہی مایوسی دکھائی دیتی رہی جس میں راحت اور امید کی کوئی جھلک نہ تھی۔ خیر الدین نے ستر سال کی عمر میں ۱۸۹۹ء میں بمقام آستانہ وفات پائی اور جامع الیوب میں دفن ہوئے وہ ساری عمر بگاڑ

اور فساد کے خلاف جہاد اور اصلاح احوال کیلئے کوشاں رہے۔ بدقسمتی سے انہیں عوام یا سلطان میں کوئی بھی مددگار نہ مل سکا۔ وہ مدحت پاشا کی طرح سیاسی اور اجتماعی مصلح تھے ان دونوں میں وہی فرق تھا جو سید جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہٗ میں تھا مدحت پاشا اگر کوششوں کو ناکام ہوتے دیکھتے اور اپنے آپ کو بے بس پاتے تو انقلاب برپا کر دیتے لیکن اگر خیر الدین اپنے آپ کو بے کس اور اصلاح سے عاجز پاتے تو آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہتے۔ "میرے رب میں نے اپنا پیغام پہنچا دیا ہے"[۱]

ان کی شخصیت کی تعمیر میں صدق قول۔ اظہار حق بے خوفی۔ صلابت رائے۔ حریت فکر صبر اور تحمل اور برداشت جیسے اوصاف نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ رحمہ اللہ

○

[۱] اللّٰھم انی قد بلغت

علی مبارک پاشا

۱۲۳۹ھ ــــــ ۱۳۱۱ھ

۱۸۲۳ء ــــ ۱۸۹۳ء

برنبال مصر کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جو دکرنس کی تحصیل اور ضلع میں دریا کے کنارے پر واقع ہے۔ سارے گاؤں کی آبادی چار محلوں سے : ۔ ہے ان میں ایک مسجد ہے۔ قرآن پاک کی تعلیم کے لئے ایک مکتب ہے۔ مرغیاں پالنے کا ایک فارم ہے پشمینہ کاتنے کے لئے چار دستی کھڈیاں ہیں۔ دو انگریزوں کی دو کانیں ہیں۔ دو مزار ہیں جہاں آ کر لوگ مرادیں مانگتے ہیں۔ ہر ایک محلہ میں ایک چوک بھی ہے جہاں اہل محلہ خوشی اور غمی میں اکٹھے ہوتے ہیں عید اور دوسرے تیوہاروں پر اسی جگہ میلہ لگتا ہے۔ ایک جگہ سبزیاں بھی بکتی ہیں بعض لوگ بڑھئی اور سفینہ سازی کا کام کرتے ہیں۔ قبلہ کی جانب قبرستان ہے جس کے ارد گرد کی زمین میں کاشت ہوتی ہے اس میں صرف دو درخت کھڑے ہیں

ایک محلہ میں ایسا گھرانا ہے جس کے نفوس کی تعداد سو کے لگ بھگ ہوگی یہ لوگ بھی کسانوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں ان کے ہاں مویشی۔ پالتو جانور اور زرعی آلات ہیں ان سب کے نگران شیخ مبارک ہیں جو تمام دینی معاملات سرانجام دیتے ہیں یہ گاؤں کی مسجد کے خطیب ہیں۔ نکاح خوانی کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں۔ طلاق نامہ بھی لکھ دیتے ہیں اور دینی فتویٰ بھی دیتے ہیں یہ فرائض انہیں میراث میں ملے ہیں ان کے خاندان کو مشائخ کے لقب سے پکارتے شیخ صاحب نے کئی شادیاں کی تھیں ان سے بکثرت بال بچے پیدا ہوئے ایک بیوی کے ہاں سات لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا جس کا نام علی تھا یہ سب تنگی ترشی سے گذارہ کرتے تھے اس گھرانے میں علی مبارک پیدا ہوئے انہوں نے اسی ماحول میں آنکھیں کھولیں ان کا باپ یہ آس لگائے بیٹھا تھا کہ وہ بھی خاندانی مشائخ کی طرح امام یا خطیب یا مفتی بنے گا ایک افتادہ گاؤں کا بچہ زیادہ سے زیادہ امام مسجد ہی بن سکتا تھا لیکن قضاء و قدر کو کچھ اور ہی منظور تھا ان کے والد نے انہیں بغرض تعلیم ایک میاں جی کے سپرد کیا جو نور بصارت سے محروم درحد درجہ درشت مزاج اور اسم بامسمیٰ تھا کیونکہ نام بھی ابو عسر تھا اس کا احسان تھا کہ اس نے علی مبارک کو پڑھائی اور حفظ قرآن میں لگائے رکھا۔

اتفاق سے ان کے خاندان پر افتاد آپڑی جس طرح بہت سے خاندانوں میں پڑ چکی تھی، بہت سے کسان جب

اپنے آپ کو اراضی کے لگان کی ادائیگی سے قاصر دیکھتے تو زمین چھوڑ چھاڑ کر بھاگ نکلتے اور یہ زمین کسی اور کسان کو مل جاتی یہ عطیہ ایک قسم کی بیگار ہوتی کیونکہ کسان کھیتی باڑی کرتا اور پیداوار حکومت سنبھال لیتی ایک مقامی محاورہ تھا کہ "زمین فلاں کے گلے پڑ گئی" اس کا اطلاق اسی قسم کی زمینوں پر ہوتا تھا۔ شیخ مبارک کے خاندان کو انہی حالات سے پالا پڑا تھا۔ جب لاوارث زمین ان کے گلے بندھ گئی اور اتنی آمدنی نہ ہوئی جس سے وہ لگان ادا کر سکیں تو انہوں نے اپنے مویشی اور اسباب وغیرہ بیچ کر راہ فرار اختیار کی اور بدوؤں کے پاس جا اترے یہ لوگ خیموں میں رہتے تھے اور سماعنہ کہلاتے تھے انہوں نے مہمانوں کے لئے ایک الگ خیمہ کا انتظام کر دیا اور دینی ضروریات جیسے امامت، خطابت اور فتوی لینے میں ان سے رجوع کرتے پاس ہی ایک گاؤں تھا جہاں علی مبارک تعلیم حاصل کرنے کے لئے جاتے یہاں کے میاں جی ابوالعسر کی طرح سخت مزاج تھے ان کو راضی رکھنے کے لئے علی مبارک گھر سے کچھ چیزیں لے جایا کرتے تھے۔ تاکہ وہ ان کی مار پیٹ سے بچے رہیں بالآخر انہوں نے قرآن پاک حفظ کر لیا۔

سخت مار پیٹ نے انہیں تعلیم سے متنفر کر دیا تھا رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ امام مسجد بن سکیں گے اب وہ مدرسہ نہ جانا چاہتے تھے لیکن ان کا باپ انہیں مدرسہ بھیجنے پر مصر تھا ان کے باپ اور بھائیوں نے انہیں سمجھایا کہ وہ پڑھ کر منشی یا پٹواری بن جائیں گے علی مبارک نے بھی کسی عرضی نویس یا پٹواری کا شاگرد بن جانا پسند کیا وہ ان کے ساتھ باہر گاؤں میں جاتے کوئی تو انہیں کچھ دے دیتا اور کوئی ان کا حق ہضم کر لیتا ایک پٹواری نے ان سے پوچھا کہ ایک کو ایک سے ضرب دی جائے تو کیا حاصل آئے گا انہوں نے جواب دیا۔ دو۔ تو اس نے جریب ان کے سر مار کر انہیں زخمی کر دیا اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے وہ والدین۔ استاد وغیرہ سب چیزیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ ایک دفعہ ہیضہ میں بھی مبتلا ہوئے اس کے بعد کسی جرم کی پاداش میں جیل خانہ بھی پہنچے۔ قدرت کی مہربانی ہوئی تو جیل کے داروغہ کی سعی و سفارش سے وہ ایک بڑے عہدہ دار کے منشی بن گئے۔ داروغہ نے ان کے اخلاق اور خوشخطی کی بڑی تعریف کی تھی یہ عہدہ دار عنبر آفندی کاؤن انسپکٹر تھا جب علی مبارک پاشا نے اس انسپکٹر کو دیکھا تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کیونکہ انسپکٹر سیاہ فام حبشی سا تھا اور وہ حاکموں کو سفید فام دیکھتے چلے آئے تھے اب ان کے دل میں رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ سب لوگ اس حبشی کی اتنی عزت کیوں کرتے ہیں اس کے آگے دست بستہ کیوں کھڑے رہتے ہیں اگر یہ حبشی اتنا اعزاز حاصل کر سکتا ہے تو وہ اس عزت کے مستحق کیوں نہیں ہو سکتے اس میں کونسا راز تھا آخر کار اپنے باپ سے اس کی وجہ پوچھی تو وہ "قدرت خدا" کہہ کر خاموش ہو گیا لیکن علی مبارک کے دل کو اطمینان حاصل نہ ہو سکا۔

بالآخر اس انسپکٹر کے ایک ملازم سے اس کی وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ یہ انسپکٹر پہلے ایک خاتون کا ملازم تھا اس نے اسے قصر العینی کے مدرسہ میں تعلیم کے لئے بھیج دیا جہاں کہ اس نے خوش نویسی ترکی زبان اور حساب وغیرہ کی تعلیم پائی وہاں ایک اور مدرسہ تھا جہاں سرکاری ملازمت کی تعلیم دلائی جاتی تھی۔ اور ترک ہونے کی کوئی تخصیص نہ تھی بلکہ ہر شخص داخل ہو سکتا تھا اس انسپکٹر نے وہاں تعلیم حاصل کی تھی۔ اب علی مبارک رات دن اسی سوچ میں پڑے رہتے تھے کہ ایک حبشی تعلیم پا کر بڑا عہدہ دار بن سکتا ہے تو وہ بڑا آدمی نہیں بن سکتا۔ وہ واقف کاروں سے قصر العینی کے مدرسہ کا پتہ پوچھتے۔ راستہ کا پتہ لگاتے اور شرائط داخلہ معلوم کرتے اور ان تمام معلومات کو ایک کاغذ پر لکھ لیتے آخر کار انہوں نے مدرسہ میں داخل ہونے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

پوچھتے پوچھتے ان کو معلوم ہوا کہ قصر العینی سے ایک انسپکٹر دیہات کے مدارس میں آتا ہے ہوشیار اور ذہین لڑکوں کا انتخاب کر کے لے جاتا ہے اور انہیں قصر العینی کے مدرسہ میں داخلہ دلا دیتا ہے۔

اس کے بعد علی مبارک نے عنبر آفندی کی ملازمت چھوڑ دی اور مدرسہ میں داخل ہو کر انسپکٹر کا انتظار کرنے لگے ان کے والد کا اصرار تھا کہ وہ مزید تعلیم کا دھیان چھوڑ دیں بھلا علی مبارک کب ماننے والے تھے ناگہاں انسپکٹر مدارس نے ان کے مدرسہ کا معائنہ کر لیا اور علی مبارک کو اعلیٰ تعلیم کے لئے منتخب کر کے قصر العینی کے مدرسہ میں داخل کرا دیا جہاں وہ امیدوں اور آرزوؤں کی دنیا میں رہنے لگے کبھی ان کو خیال آتا کہ وہ عنبر آفندی کی طرح افسر بنیں گے اس وقت ان کی عمر صرف بارہ برس کی تھی لیکن اس عمر میں وہ عجیب وغریب حادثات سے دوچار ہو چکے تھے۔۔۔۔
۔۔۔ اور فقر وفاقہ برداشت کر چکے تھے۔

وہ مدرسہ میں داخل ہوئے تو اس کو توقع کے خلاف پایا یہ خوابوں کی دنیا کی بجائے مجرموں کا جہنم معلوم ہوتا تھا اس وقت مدارس نئے نئے قائم ہوئے تھے اور نظم وضبط سے عاری تھے اس مدرسہ کے نصاب میں نہ حساب شامل تھا نہ جامیٹری بلکہ زیادہ وقت پریڈ میں صرف ہوتا تھا کھانا وغیرہ بھی ناپسندیدہ تھا وہ اپنی جیب سے روغن زیتون وغیرہ خرید لیتے تھے مدرسہ کی صفائی اور نفاست بھی قابل اطمینان نہ تھی وہ ایک میلی کچیلی سی چٹائی پر سوتے تھے۔ ایک کمبل بھی ملا تھا جس سے وہ خارش اور دیگر امراض میں مبتلا ہو گئے ان حالات میں انہیں امیدوں پر پانی پھرتا نظر آیا ان کا باپ عیادت کے لئے آیا اور ساتھ لے جانا چاہا علی مبارک بھی بھاگ جانا چاہتے تھے لیکن انہوں نے سن رکھا تھا کہ بھاگ جانے والوں کو پکڑ کر سخت سزا دی جاتی ہے۔ انہوں نے معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر کے تعلیم جاری رکھی اب اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل فرمایا اور وہ انجینئرنگ سکول میں تبدیل کر دیئے گئے کیونکہ قصر العینی کا مدرسہ

ڈاکٹری تعلیم کے لئے مختص کر دیا گیا تھا۔

یہ نیا مدرسہ پرانے مدرسہ سے بہر حال اچھا تھا یہاں انہیں اپنے مذاق کی چیزیں ملیں لیکن ایک مشکل آن پڑی کہ انہیں جامیٹری اور نحو نہ آئی مثلث کے قاعدے انکے فہم سے باہر تھے ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ ایک مثلث کو صرف ایک نام سے کیوں موسوم کرتے ہیں اس کا دوسرا نام کیوں نہیں رکھ لیتے جب استاد نے انہیں سمجھایا کہ ا ب ج یا ج د ھ شکل کے فقط اصطلاحی نام ہیں تو تب جا کر یہ عقدہ حل ہوا اور وہ سب طالب علموں سے گوئے سبقت لے گئے لیکن علم نحو ان کی سمجھ میں بالکل نہ آیا اور معمہ ہی بنا رہا اس کے بعد وہ دوسرے مدرسہ میں چلے گئے اور ریاضی کے تمام علوم کی تکمیل کی۔

جب محمد علی پاشا نے چند طلبہ کو اعلیٰ تعلیم کے لئے فرانس بھیجنا چاہا تو ان پر بھی نظر انتخاب پڑی اور وہ پیرس روانہ ہو گئے۔ مشکل یہ پیش آئی کہ علی مبارک فرانسیسی زبان سے نابلد تھے اور ان کے فرانسیسی اساتذہ عربی نہ جانتے تھے ناچار انہوں نے فرانسیسی زبان میں بچوں کے لئے جو کتابیں لکھی ہوئی تھیں وہ سب اکٹھی کر لیں اور ایک ہم سبق کی مدد سے پڑھنے لگے رات بھر ان کے حفظ و مطالعہ میں لگے رہتے یہ رات کا جاگنا ان کی زندگی کا معمول بن گیا تھا تین ماہ کے بعد انہوں نے اتنی لیاقت بہم پہنچائی کہ فرانسیسی زبان میں لیکچروں کو بخوبی سمجھنے لگے ان کی محنت اور لیاقت کی شہرت مصر کے ارباب حل و عقد تک پہنچی پیرس میں دو سال علم ہندسہ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ نمرطہ کے حربی کالج میں چلے گئے اور ایک سال پڑھتے رہے اس طرح انہوں نے پانچ سال پیرس میں گذارے۔

اس اثنا میں وہ مدارس جامعات۔ تعلیم کے نظم و نسق اور ملک کی اجتماعی حالت کا مطالعہ ..... اور حسب استعداد استفادہ کرتے رہے لیکن اپنے والدین سے غافل نہ رہے اور آدھا وظیفہ گھر بھیج دیتے وہ محمد علی پاشا کے عہد حکومت میں فرانس گئے تھے اور عباس اول کے زمانہ میں مصر واپس آئے عباس کا زمانہ تعلیمی تنزل کا تھا اسکو تعلیم سے مطلقاً دلچسپی نہ تھی بلکہ محلات تعمیر کرانے کا شوق تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیمی بجٹ صرف پانچ لاکھ پونڈ رہ گیا ہاں ترکوں کی تعلیم کا ضرور دھیان تھا بچے کھچے جو مدارس رہ گئے تھے ان میں سے علی مبارک کو بھی ایک مدرسہ کا مہتمم بنا دیا گیا۔

ان کو والدین سے بچھڑے ہوئے چودہ برس ہو گئے تھے اس مدت میں انہوں نے نہ اپنے والدین کو دیکھا تھا نہ گاؤں گئے تھے جس مدرسہ میں انہوں نے تعلیم پائی تھی وہ فوجی قسم کا تھا کسی کو وہاں آنے جانے کی اجازت نہ تھی وطن لوٹے تو گاؤں جانے کا خیال آیا اب وہ فوجی وردی میں ملبوس گاؤں چلے تو اگلے زمانے کے واقعات ان کی نگاہوں کے سامنے پھرنے لگے۔ مدرسہ۔ استاد کی مار پیٹ۔ مدرسہ سے فرار۔ منشیوں کی سختی۔ قصر العینی

کے مدرسہ میں داخلہ۔پیرس کی زندگی وغیرہ جب انہوں نے گاؤں پہنچ کر اپنے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا اور والدہ کے پوچھنے پر اپنا نام بتایا تو والدہ نے دروازہ کھولا اور دیکھتے ہی غش کھا کر گر پڑیں ہوش میں آئی تو خوشی سے رونے لگی علی مبارک نے اپنی جیب سے ایک بڑی رقم نکالی اور والدہ کے ہاتھ میں تھما دی تاکہ گاؤں والوں کی ضیافت کا انتظام کر دیا جائے۔

علی مبارک نے اچھے اور بُرے دن دیکھے اسوقت مصر کی سرکاری ملازمت غیر یقینی ہوا کرتی تھی تمام عہدیدار حاکم کی نظر وکرم کے محتاج ہوتے منظور نظر بنے۔تو اوج رفعت پر پہنچ گئے عتاب میں آئے تو پستی کی انتہا کو پہنچ گئے۔بعض دفعہ ایک حاکم خوش ہوتا تھا تو دوسرا ناراض مثلاً محمد علی پاشا اور ابراہیم پاشا شیخ رفاعۃ الطہطاوی کو مانتے تھے خدیو عباس کا زمانہ آیا تو انہیں مدرسۃ الالسنہ سے نکال کر خرطوم کے پرائمری مدرسہ کا ناظر بنا کر بھیج دیا گیا علی مبارک بھی عباس الاول کے مقرب بارگاہ تھے اور مہمات امور سرانجام دیتے تھے، جب سعید پاشا خدیو ہوئے تو علی مبارک معتوب سرکار بن گئے اور شیخ رفاعۃ الطہطاوی منظور نظر۔سعید پاشا کے عہد حکومت میں وہ معتوب ہوئے تو ایک جنگی وفد کے ہمراہ ترکی بھیجے گئے اس وقت ترکوں اور روسیوں میں جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ آپ نے دو سال ترکی میں قیام کیا اور اس زمانہ کے شدائد کو نہایت صبر وضبط سے برداشت کیا اس عرصہ میں انہوں نے ترکی زبان بھی سیکھ لی تھی مصر واپس آئے تو کبھی ملازم ہو جاتے اور کبھی بے کار ہو جاتے بیکاری کے زمانہ میں مدرسہ کی نیلام ہوئی چیزیں خرید لیتے اور ان کے نفع سے گذران کرتے کبھی کبھی مکانوں کے نقشے بھی بنا دیتے ایک دفعہ انہیں زمینداری کا بھی خیال آیا لیکن حکومت نے جلد ہی طلب کر لیا ملازمت میں زیادہ دیر تک نہ ٹھہرے کہ پھر نکالے گئے اسماعیل پاشا کا زمانہ آیا تو ملک میں علمی سرگرمیوں نے دوبارہ عروج پایا اور علی مبارک اپنے عہدہ پر قائم رہے یہ زمانہ نتائج کے لحاظ سے نہایت سرسبز ثابت ہوا علی مبارک نے سڑکیں۔پل قلعے اور مساجد تعمیر کرائیں لیکن ان کی عظمت کا راز ان تعمیری کارناموں میں پوشیدہ نہیں بلکہ تعلیمی مسائل کی اصلاح میں ہے جن سے مصر کی علمی ترقی مضبوط بنیادوں پر قائم ہوئی انہوں نے تو سڑکوں اور عمارتوں کا انجینئر بننا چاہا تھا لیکن قدرت نے انہیں تعلیم وتربیت کا معمار بنا دیا انہوں نے نہ صرف اس کا لائحہ عمل تیار کیا بلکہ لنہایت وقت نظر تمام احکام نافذ کئے اس لحاظ سے ان کا عظیم مصلحین میں شمار ہوتا ہے۔

انہوں نے تعلیم اور نفسیات کی باقاعدہ تعلیم نہ حاصل کی تھی بلکہ حسن استعداد اور صادق نظر سے اس کمی کو پورا کر لیا تھا مکتب اور مدرسہ کی تعلیم میں انہوں نے بہت سی تکالیف برداشت کی تھیں جسکی وجہ سے ان میں

محبت اور رحمدلی کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا وہ عوام کی جہالت سے کڑھا کرتے تھے جب ایک مدرسہ کی نگرانی ان کے سپرد ہوئی تو وہ اپنا حال اس طرح بیان کرتے ہیں:

میں اپنے شاگردوں کی تعلیم و تربیت بلکہ کھانے پینے اور پہننے تک کا خیال رکھتا تھا میں ان کو سکھاتا کہ کپڑے کس طرح پہنے جاتے ہیں مطالعہ کس طرح کیا جاتا ہے اور کس طرح لکھا جاتا ہے۔ استادوں کی نگرانی کرتا کہ وہ کس طرح پڑھاتے اور کس طرح بچوں کو تربیت دیتے ہیں۔ چوکیداروں، خدمت گاروں اور خاکروبوں کے احوال سے بھی غافل نہ رہتا صرف اس پر بس نہ تھی بلکہ چند اسباق ...... اپنے ذمہ لیتا اور طالب علموں کو خود پڑھاتا اس سے استادوں اور شاگردوں میں ترغیب اور تشویق پیدا ہوتی.... مکافات اور تعریف و توصیف کا مادہ پیدا ہونا استادوں میں محبت اور الفت بڑھتی بچے ایک دوسرے کے بھائی بن کر رہتے ان میں خودنگری، شرافت نفس اور آگے بڑھنے کا داعیہ پیدا ہوتا سب و شتم کو چھوڑ کر ملامت اور نصیحت سے کام نکالا جاتا استاد بھی شاگردوں کو اولاد کے برابر سمجھتے میرا تو نظریہ ہے کہ ہر راعی کو اپنی رعایا سے اسی طرح پیش آنا چاہئے اس تعلیم و تربیت اور شفقت و رحمت کا نتیجہ میں نے آنکھوں سے دیکھ لیا جب سعید پاشا کے زمانہ میں مجھے فوجی وفد کے ساتھ ترکوں کی مدد و معاونت کے لئے ترکیہ بھیجا گیا تو میری روانگی پر پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے جنکو روتا دیکھ کر میں بھی اپنے آنسو بھی ضبط نہ کر سکا لیکن اپنی محنت کو بار آور دیکھ کر مجھے انشراح صدر حاصل ہوا جس پر میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا"۔

محمد علی پاشا کے زمانہ میں تعلیم کی اساس فوجی ضروریات تھیں حربی مدارس فوجی افسر پیدا کرتے تھے مدرسۃ الطب ان کی دوا دارو کے لئے وقف تھا صنعتی مدارس فوجی امداد کے لئے قائم تھے بیرونی ممالک میں جو تعلیمی مشن بھیجے جاتے ان سے بھی فوج کی ضروریات پیش نظر ہوتی تھیں ان سرگرمیوں سے عوام کو بھی کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچ جایا کرتا تھا۔ مدارس کا نظام تمام تر فوجی تھا معلموں، انسپکٹروں اور ہیڈ ماسٹروں کو فوجی عہدے حاصل تھے حتیٰ کہ پیرس میں جو طالب علم پڑھنے جاتے ان کو بھی ایک جگہ فوجی پریڈ کرنی پڑتی تھی یہ تعلیم صرف قاہرہ اور اسکندریہ تک محدود تھی قصبوں اور گاؤں میں تعلیم کا گذر نہ تھا اس کے مقابل قاہرہ اور دوسرے شہروں میں دینی تعلیم کے مکاتب اور مدارس تھے جنکا آخری مرحلہ ازہر تھا اس تعلیم میں حکومت کا عمل دخل نہ تھا عباس اول اور سعید پاشا کے دور حکومت میں جدید تعلیم کا دائرہ عمل محدود ہو کر رہ گیا تھا اسماعیل پاشا فرمان روا ہوا

تو اس نظام کو بدلا گیا اور تعلیم کو غیر فوجی نظروں سے دیکھا جانے لگا اس نمایاں تبدیلی میں سب سے بڑا ہاتھ علی مبارک کا تھا جنہوں نے فوجی تعلیم کا ڈھانچہ قومی تعلیم سے بدل دیا۔

انہوں نے دیکھا تھا کہ قومی تعلیم کے مکاتب اور مدارس قابلِ رحم حالت میں ہیں ان میں بعض تو دوکانوں اور بعض مساجد کے تنگ و تاریک حجروں میں قائم ہیں۔ تندرست اور مریض بچے ایک ہی جگہ پھٹی پرانی چٹائی پر بیٹھتے ہیں ایک ہی آبخورے سے پانی پیتے ہیں اور ساتھ ہی بیٹھ کر کھاتے پیتے ہیں۔ میاں جی نور بصارت سے محروم ہوتے اور شاگردوں کی اچھی طرح نگہداشت نہ کر سکتے زیادہ سے زیادہ بچوں کو قرآن پاک حفظ کرا دیتے اس کے علاوہ نہ دنیا کا پتہ تھا نہ دین کا تادیب گالی گلوچ اور مار پیٹ تھی اسماعیل پاشا کے عہد میں تعلیم کا محکمہ علی مبارک کے سپرد ہوا۔ انہوں نے تمام مکاتب کی صلاحیت۔ عدم صلاحیت شاگردوں کی تعداد۔ مدرسین کی قابلیت اور ملحقہ اوقاف کی کیفیت معلوم کرنے کیلئے ایک انسپکٹر مقرر کیا مدارس کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ جید۔ متوسط اور ردی ان کے لئے لائحہ عمل بنایا جس کو رجب کا لائحہ عمل کہتے ہیں۔ یہ صادر ہونے کی تاریخ ہے۔ اس سے مصر نے تعلیمی میدان میں ترقی کی طرف قدم بڑھایا۔ انہوں نے مالی وسائل پیدا کئے اور اساتذہ کا درجہ معیشت بلند کیا اور ان کو مؤذنین کا لقب دیا۔ عوام اور میونسپل اداروں کو مدرسوں کے انتظام اور مالی ذمہ داریوں میں شریک کیا۔ بہت سے مکاتب پرائمری مدارس میں تبدیل کر دیئے گئے جدید اصلاحات کے نفاذ میں انہوں نے امکان بھر کوشش کی تعلیم کے علاوہ محکمہ اوقاف بھی ان کے سپرد ہوا جس ...... کی آمدنی مدارس اور مکاتب کی تعمیر پر صرف ہوتی اور تعلیم نے نیا قالب اختیار کیا۔ تعلیم کی اس تنظیم نو میں صرف ان کی کوششوں کو دخل نہیں ہے بلکہ خود اہل ملک بھی تعلیمی اصلاح کے شائق تھے مجلس شوریٰ اس کا مطالبہ کر چکی تھی خدیو اسماعیل کو بھی اس کی تائید حاصل تھی لیکن علی مبارک کا کارنامہ ہے کہ انہوں نے خیال کو عمل کا جامہ پہنا دیا اور اس کو عدم سے وجود میں لانے میں کامیاب ہوئے مکاتب اور مدارس کی جدید تنظیم کے ساتھ ساتھ استادوں کی ٹریننگ کا بھی انہیں خیال تھا۔ سرکاری مدارس میں عربی زبان کی تعلیم ازہری عالم دیتے تھے۔ خود ازہر میں تعلیم قرون وسطیٰ کے نمونہ پر دی جاتی تھی جس کے نتیجہ میں وہاں کے تعلیم یافتگان میں کتاب سمجھنے کی لیاقت تو پیدا ہو جاتی تھی لیکن وہ علم سے کورے رہتے تھے اور پڑھے ہوئے کو تطبیق نہ دے سکتے تھے۔ اکثریت صحت اعراب سے ایک صفحہ بھی پڑھ سکتی تھی نہ کسی عنوان پر لکھ سکتی تھی اور نہ شعر کے معنی ہی کو درست کر سکتی تھی۔ ان احوال کی تفصیل کے لئے عبداللہ پاشا فکری کا مقالہ۔ بعنوان "بچوں کی تعلیم کی اصلاح کیسے ممکن ہے" ملاحظہ ہو۔

علی مبارک نے ایک نیا مدرسہ قائم کرنے کی ٹھانی اس کے لئے ازہر کے بہترین طلبہ کا انتخاب کیا بہترین علماء پڑھائی کے لئے مقرر کئے طلبہ کو دینی اور ادبی تعلیم کے علاوہ حساب جغرافیہ۔ تاریخ۔ فزکس اور کیمسٹری وغیرہ پڑھائے جاتے تھے اس مدرسہ کا نام دار العلوم تھا۔ ہندسہ۔ حساب اور لغات کے لئے وہ استاد مقرر کئے جاتے جو ہندسہ۔ محاسبی وغیرہ کے مدارس سے فارغ ہو کر۔۔۔۔۔ دو سال بطور مددگار استاد کے کام کر چکے ہوں۔

عوامی ثقافت کو ترقی دینے کے لئے انہوں نے مندرجہ ذیل کام کئے۔

۱۔ لیکچر ہال کی تعمیر جس میں مصری اور مغربی اساتذہ خطبے دیتے۔ مثلاً شیخ حسین المرصفی ادب پر اسماعیل بک فلکیات۔ شیخ عبدالرحمن البحراوی فقہ اور موسیو پروکش تاریخ عام اور احمد ندا علم النبات پر لیکچر دیتے اگر کوئی لیکچر غیر ملکی زبان میں ہوتا تو بعد میں عربی زبان میں اسکا ترجمہ کر دیا جاتا جمعہ کے سوا روزانہ لیکچر ہوتے ہر لیکچر ڈیڑھ گھنٹہ کا ہوتا بعض موضوعات پر ہفتہ میں دو دفعہ لیکچر ہوتے اور بعض پر ایک دفعہ۔

۲۔ "روضۃ المدارس المصریہ" نامی رسالہ کی اشاعت جس کے مدیر شہیر شیخ رفاعۃ الطہطاوی تھے رسالہ کے پہلے نمبر میں لکھا تھا کہ علی مبارک پاشا کے مشورہ کے بغیر کوئی چیز رسالہ میں نہ چھپ سکے گی استادوں کو حکم ہوا کہ رسالہ میں مقالات لکھا کریں رسالہ میں سابق الذکر خطبات بھی چھپتے تھے مثلاً پہلے نمبر میں دار الکتب الخدیویہ کے قیام پر علی مبارک کا مضمون تھا

۳۔ دار الکتب کا قیام اس سے قبل قلمی کتابیں مختلف مساجد اور دور افتادہ مقامات پر منتشر تھیں جہاں چوری یا تلف ہو جانے کا اندیشہ لگا رہتا تھا آپ نے ان کو ایک جگہ اکٹھا کر کے ان کی ترتیب اور تنسیق کی اس سے استفادہ میں آسانی ہوئی اور ایک کمرہ مطالعہ کے لئے بھی بنایا تھا

ان اقدام سے علمی ترقی کی رفتار تیز تر ہو گئی۔ اسماعیل پاشا برابر ان کی حوصلہ افزائی کرتے۔۔۔۔ اور ان۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔ کے منصوبوں کو بروئے کار لانے کے لئے مالی امداد دیتے رہے۔

علی مبارک کی زندگی کا ایک اور کارنامہ قابل ذکر ہے انہوں نے تصنیف و تالیف کی بھی حوصلہ افزائی کی تھی۔ اب ملک علمی ترقی کے میدان میں گامزن تھا جس کے لئے ترجمہ و تالیف کی تحریک بھی ضروری تھی اس بارے میں تمام کوششوں کا سہرا شیخ رفاعۃ الطہطاوی کے سر ہے گو علی مبارک کو بھی ان کوششوں میں دخل حاصل ہے۔ انہوں نے طلبہ کے لئے علم ہندسہ پر ایک کتاب لکھی لیکن ان کا قابل ذکر کارنامہ خطط توفیقیہ کی تصنیف ہے۔

اس میں قاہرہ۔ اس کے بازار۔ شوارع۔ مساجد اور مقابر کا بیان ہے۔ مصر کے گاؤں اور قصبات کا حروف تہجی کے لحاظ سے حال لکھا ہے اس ضمن میں مختلف اکابر۔ شیوخ وغیرہ کے حالات آگئے ہیں اس طرح یہ جلیل القدر اور نافع کتاب مقریزی کی خطط کا تتمہ بن گئی ہے اس میں ابتداء سے لے کر تالیف کتاب تک قاہرہ۔ مصری شہروں اور دیگر قصبات اور دیہات کے حوادث کا ذکر آگیا ہے کتاب پانچ جلدوں میں ہے۔ انہوں نے ایک اور کتاب بھی لکھی ہے جسکا نام علم الدین ہے یہ ایک ازہری شیخ کا ایک قصہ ہے جس سے ایک انگریز مستشرق نے عربی سیکھی تھی اور بعد میں اپنے استاد کو انگلستان چلنے کی دعوت دی تھی دونوں جب قاہرہ سے اسکندریہ چلے تو شاگرد پوچھتا رہا اور استاد سوالوں کا جواب دیا دیتا رہا لیکن اسکندریہ سے گذرنے کے بعد ازہری عالم شاگرد کو بہت سی چیزوں کے متعلق سوالات کرتا اور انگریز مستشرق ان کے جوابات دیتا اس طرح ساری کتاب مشرق و مغرب کے احوال اور یورپی مظاہر حیات سے متعلق قیمتی معلومات سے لبریز ہے کتاب لکھنے سے ان کی غرض یہ تھی کہ مشرقی اذہان مغربی علوم و فنون اور تہذیب و تمدن سے شناسا ہو سکیں قصہ کی ابتداء میں شیخ علم الدین ایک ایسے جامد ازہری عالم کا ذکر ہے جن کو دنیا اور اس کے کاروبار کا کچھ پتہ ہی نہیں لیکن جب وہ یورپ کی سیر کرتے ہیں تو ان کا ذہنی افق وسیع اور عقل پختہ ہو جاتی ہے اور وہ اشیاء پر حکم لگانے لگتے ہیں وہ تفسیر بن جاتے ہیں اور دوربین لگا کر تماشہ دیکھتے ہیں۔

ایک عجیب بات ہے کہ وہ وزیر تعلیم ہو کر بھی بچوں کی تعلیم سے غافل نہ رہے ان کے لکھنے پڑھنے کا طریقہ انہیں پسند نہ تھا اس کیلئے آپنے دو جزؤں میں ایک کتاب لکھی۔ پہلے جزء میں حروف ہجائیہ اور ان کی ترکیب تھی۔ دوسرے میں مفید موضوعات پر مطالعہ کے لئے چند اسباق تھے وہ علماء کو ابھارتے کہ وہ نئے نئے موضوعات پر جدید اسلوب میں کتابیں لکھیں اس بارے میں عبداللہ پاشا فکری نے ان کی بڑی مدد کی۔

حلمیہ قدیم میں ان کا گھر علمی مجلس کی حیثیت رکھتا تعطیلات کے وقت مختلف مدارس کے طلبہ اور مدرسین اتنی کثرت سے انکے ہاں آ بیٹھتے کہ تل دھرنے کو جگہ نہ رہتی وہ طلبہ سے ان کے اسباق اور مدارس کے متعلق پوچھتے رہتے انتظامی امور میں ان کی شکایتیں سنتے اور ان پر تنقید کرتے طالب علموں کی ضروریات کے لئے ان کو تالیف و تصنیف پر آمادہ کرتے اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر وہ طلبہ اور اساتذہ کی خطاؤں کی نشاندہی کرتے مشرق کے زوال اور مغرب کی ترقی کے اسباب بتلاتے عبدالعزیز پاشا فہمی نے مجھے ایک دفعہ بتلایا تھا میں ایک دفعہ علی مبارک کے ہاں گیا تو دیکھا کہ لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے [illegible] باشا ایک کمرہ کے درمیان بیٹھے ہوئے ہیں کہ اتنے

میں مصطفیٰ پاشا ریاض سیکرٹری محکمہ پولیس آنکلے اور کود پھاند کر علی مبارک تک جا پہنچے۔ علی مبارک نے اسکی وجہ پوچھی تو کہا کہ عوام حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں سے ہم کلام ہوتے ہوئے ڈرتے ہیں اور جب ہم ان کو باہمی تخاطب کی عادت ڈال دیں گے تو حکومت کا رعب اور دبدبہ جاتا رہے گا اور وہ نڈر ہو کر حقوق طلبی پر اتر آئیں گے۔ وہ کہیں گے جب ہم وزیر سے بالمشافہ گفتگو کر لیتے ہیں تو ایک ادنیٰ ملازم کو کیوں نہ مخاطب کر سکیں۔

علی پاشا مبارک کی تعلیمی اصلاحات حرف آخر کا درجہ نہ رکھتی تھیں اور خالی از نقائص بھی نہ تھیں لیکن انہوں نے زمانہ کی ترقی کا ساتھ دینے کی ضرور کوشش کی۔ ریاض پاشا کی وزارت کے زمانہ میں بھی بعض کوتاہیوں کی اصلاح کی گئی۔ بعد میں انگریزوں نے جب قرضہ کی حفاظت کے بہانے ملک پر تسلط جما لیا تو حالت خراب ہو گئی اس کا ذکر شیخ جمال الدین افغانی کے حال میں لکھا جا چکا ہے۔ جب عرابی پاشا نے بغاوت کی تو انگریزوں نے تعلیم کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور نظام تعلیم کو اپنے قالب میں ڈھال لیا۔

علی پاشا مبارک اس بغاوت سے علیحدہ رہے تھے ان کا مزاج انقلابی نہ تھا برخلاف شیخ جمال الدین افغانی کے کہ وہ سرتاسر انقلاب پسند تھے۔ وہ شروع ہی سے حکومت کے وفادار چلے آ رہے تھے عباس الاول اور سعید پاشا کا عہد ہو یا اسماعیل اور توفیق کا دور حکومت، انہوں نے سب کی خلوص نیت سے خدمت کی تھی بعض مصلحوں کی طرح ان کا اعتقاد تھا کہ اصلاح کی سب قسموں سے زیادہ تعلیمی اصلاح سود مند ہو سکتی ہے بلکہ وہ سیاسی اصلاح سے بھی زیادہ مفید ہے بہت سے اعیان قوم مثلاً عبد اللہ پاشا فکری اور شیخ محمد عبدہ پر عرابی پاشا کی مشائعت کا الزام لگایا گیا تھا لیکن علی مبارک پر کبھی کو الزام دھرنے کی توفیق نہ ہوئی۔ وہ توفیق پاشا کے الطاف وعنایات سے سرفراز ہوئے اگرچہ عرابی پاشا اور ان کی پارٹی کے مورد غضب بن گئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے عرابی پاشا کی بغاوت میں کچھ مالی مدد دی تھی ہو سکتا ہے کہ بعض پرجوش نوجوانوں کے دباؤ کے تحت انہوں نے کچھ چندہ وغیرہ دیا ہو۔ مشرق و مغرب خاص کر مصر کے مخصوص احوال وظروف کے مطالعہ کے بعد ان کو اس بغاوت کی کامیابی مشکوک نظر آتی تھی شیخ محمد عبدہ راوی ہیں کہ وہ ایک دن علی مبارک پاشا کے گھر میں تھے وہاں سلطان پاشا بھی موجود تھا وہ مصری فوج کی طاقت کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے لگا اور تعداد میں اضافہ پر زور دینے لگا علی مبارک پاشا جواب میں کہنے لگے کہ ہمارا ملک اس لڑائی کے اخراجات کا متحمل نہیں ہو سکتا جب کہ کامیابی بھی کچھ مشکوک سی نظر آتی ہے۔

ملک میں بغاوت کی آگ بھڑکی تو وہ اپنے گاؤں چلے گئے اور زمین کی درستی میں لگ گئے بہرحال ہر انسان اپنی عقل اور مزاج کے موافق کام کرتا ہے۔ علی مبارک کا مزاج دھیما تقاضیں کیوجہ سے انہوں نے تعلیمی اصلاح میں اپنی کوششیں صرف کر دی تھیں۔ اکثر اوقات ان کی کامیابی کی بنیاد شدید غیرت۔ قوت اخلاص اور تن من دھن سے وطن کی خدمت تھی۔ انگریزی تسلط کے بعد مصطفیٰ ریاض پاشا کی وزارت برطرف کر دی گئی اور علی مبارک دوبارہ وزیر تعلیم بنائے گئے لیکن دونوں حالتوں میں بڑا فرق تھا۔ پہلے تو وہ آزاد تھے جس منصوبہ پر خرچ کرنا چاہتے بلا دریغ خرچ کر سکتے تھے زیادہ سے زیادہ وہ ارباب بست و کشاد کے سامنے معاملہ پیش کرتے اور وعظ و نصیحت سے کام لیتے اب وہ انگریز مشیر کے زیر اقتدار تھے ان کا دائرہ کار بھی محدود سا رہ گیا تھا۔ ایک جگہ وہ اپنی تنگدلی کا اظہار ان سلائم الفاظ میں کرتے ہیں۔ میں تو ملکی بہتری کی خاطر وزارت میں ٹھہرا ہوا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے مدد کا طالب ہوں۔

اس کے بعد ان کی آویزش اُن قیود سے رہنے لگی جو الفرڈ ملنر (جو بعد میں لارڈ ملنر بنا) مشیر مالیات نے اپنی حکومت کی مصلحتوں سے لگا رکھی تھیں وہ وزارت چھوڑ کر خانہ نشین ہو گئے اور ستر برس کی عمر میں وفات پائی۔

علی مبارک پاشا۔ شیخ رفاعۃ الطہطاوی اور عبد اللہ پاشا فکری تینوں نے مصر کی علمی ترقی کے لئے بیحد کوشش کی تھی۔ ملک کی علمی بیداری میں ان تینوں کی کوششوں کو بڑا دخل ہے لیکن ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ خصوصیات تھیں علی مبارک پاشا تعلیم کے کلّی مسائل کا اہتمام ان کی تنظیم اور نفاذ کا کام کرتے۔ وہ جزئیات کو دیکھ کر کلیات کی تطبیق کیا کرتے تھے۔ شیخ رفاعۃ پہلے جزئیات دیکھتے اور ان کی اصلاح و تنفیذ کرتے جب کسی مدرسہ کی زمام کار انہیں سپرد کی جاتی تو اس میں زندگی کی روح پھونک دیتے وہ مؤلف اور مترجم بھی تھے اپنے شاگردوں کو تصنیف و تالیف اور ترجمہ کی تشویق اور ترغیب دلاتے انہوں نے اور ان کے شاگردوں نے تصنیف و تالیف سے قوم میں بیداری پیدا کی عبد اللہ پاشا فکری منشی۔ شاعر اور ادیب تھے انہوں نے اپنے زمانہ کے مزاج کے مناسب کتابیں لکھیں اس وقت ادب کے طالب علموں کے نصاب میں مقامات حریری اور شیخ خالد کی اجرومیہ پر شرح شامل تھی انہوں نے جدید طرز پر کتابیں لکھیں پرائمری مدارس کے طلباء کے مطالعہ کے لئے .... الفوائد الفکریہ لکھی اس طرح وہ علی مبارک کے دست و بازو ثابت ہوئے ان تینوں حضرات کی علیحدہ علیحدہ خوبیاں اور احسانات ہیں۔ رحمہم اللہ جمیعاً۔

عبداللہ ندیم

۱۲۶۱ھ ۱۳۱۳ھ

۱۸۴۵ء ۱۸۹۶ء

اگر کوئی شخص بڑے معزز اور امیر خاندان میں پیدا ہو کر ہوش و تمیز کی آنکھیں کھولتا ہے اور تعلیم اور ماحول کی سازگاری سے اعلیٰ رتبہ پر پہنچ جاتا ہے تو اسے حیرت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے لیکن ہمارے خیال میں اعجاب کا مستحق وہ شخص ہے جس کے حالات ناسازگار ہوں حسب و نسب کے لحاظ سے غیر معروف اور مال و جاہ سے محروم ہو حتیٰ کہ اسے پیٹ بھر کھانا بھی نصیب نہ ہو اور وہ تعلیم و تربیت کے لئے بھی وقت نہ نکال سکے۔

ہم اس سرسبز اور بارآور درخت کو دیکھ کر حیرت کا اظہار کرتے ہیں مالی جس کی دیکھ بھال کرتا ہے اور غذا جس کو کافی ملتی ہے اور مناسب اوقات میں پانی سے بھی سیراب ہوتا ہے لیکن مستحق حیرت وہ بیج ہے۔ جسکو بے پروائی سے ایک جگہ پھینک دیا جاتا ہے وہ طبعی حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے اس کی جڑیں نکل آتی ہیں۔ اور وہ ادھر ادھر پھیل کر خود غذا حاصل کر لیتا ہے بالآخر وہ تن آور اور ثمر دار درخت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اسی دوسری قسم سے عبداللہ ندیم تعلق رکھتے ہیں بچپن میں آثار سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بڑے ہو کر بڑھئی یا نان بائی بنیں گے۔ اور زیادہ سے زیادہ یہ پیش گوئی کی جا سکتی تھی کہ وہ کامیاب ماہر ترکھان یا نانبائی نکلیں گے لیکن یہ تو کبھی کے گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ ایسے ادیب ہوں گے جن کا دنیا میں شہرہ ہو گا۔ رائے عامہ کی راہنمائی کریں گے اور ادبی محافل میں ان کا تذکرہ ہو گا۔

ان کے والد شرقیہ کے رہنے والے تھے اور اسکندریہ آ کر بس گئے تھے۔ جہازوں کے کارخانے میں بڑھئی کا کام کرتے تھے یہ کام پسند نہ آیا تو نان بائی کا مشغلہ اختیار کر کے اس سے گذر بسر کرنے لگے۔

اس خاندان کی معشیت کا کیا پوچھنا تھا۔ معمولی سا گھر تھا دال روٹی مشکل سے چلتی تھی کپڑے مشکل سے ستر ڈھانک سکتے تھے اس حالت میں صحت کا کس کو خیال آتا۔

عبداللہ کے والد صبر و استقامت سے اپنے کام میں مصروف رہتے وہ اپنے کسب پر قانع تھے ان کا

دائرہ عمل گھر سے مسجد تک محدود رہتا اپنے ہم پیشہ لوگوں کی طرح انہوں نے بھی عبداللہ کو مکتب میں بٹھا دیا تھا ان لوگوں کی عادت تھی کہ جب بچے کے ہاتھ پاؤں مضبوط ہو جاتے تو اس کو مکتب سے نکال کر اپنے پیشہ میں لگا دیتے۔

لیکن عبداللہ پڑھنے لکھنے میں ہوشیار تھے۔ ان پر ذہانت کے آثار ہویدا تھے ان کے والد نے بھی کوئی روک ٹوک نہ کی اور وہ پڑھائی میں لگے رہے دستور تھا کہ والدین ہوشیار بچوں کو ازہر بھیج دیا کرتے تھے لیکن عبداللہ کے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ والدین کے پاس روپیہ کہاں تھا۔

ان کے گھر کے قریب مسجد تھی جو ازہر کا چھوٹا سا نمونہ تھا اس میں ازہر کے نصاب تعلیم کے مطابق پڑھائی ہوتی تھی۔ یہ مسجد شیخ ابراہیم پاشا کے نام سے موسوم تھی۔

اس مدرسہ میں عبداللہ ندیم تعلیم حاصل کرتے رہے لیکن انہیں محنت کی عادت نہ تھی نہ مطالعہ کا شوق تھا نہ سبق کا اہتمام تھا اپنی فطری استعداد اور مزاج کے موافق وہ غیر منظم طور پر تعلیم حاصل کرتے رہے ساتھ ہی ادبی مجالس میں آتے جاتے رہتے اور اساتذہ کا فیض صحبت اٹھاتے رہتے اس وقت ادب کی تعلیم کسی قاعدہ اور قانون کی پابند نہ تھی اور نہ وہ باقاعدہ فن اور علم تسلیم کیا جاتا تھا۔ ادب کا عشق رکھنے والے کو الیسی خوبصورت آواز والے سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو کوئی سن کر گانے کا رسیا نقل اتارنے کی کوشش کرے ادب کے شائق کو علم نحو اور فقہ کے عالم حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اس بات کا ہمیں ازہر کی تعلیم کے دوران کافی مشاہدہ ہو چکا ہے۔ جب شیخ مرصفی حلقہ باندھ کر ادب کا درس دینے لگتے تو اس منظر کو فقہ اور نحو کے طالب علم اور ان کے استاد کنکھیوں سے دیکھتے۔

عبداللہ ندیم ان ادبی مجالس میں آتے جاتے شاعروں کے شعر۔ زجالوں کے زجل۔ مسخروں کے لطائف و ظرائف اور راویوں کے قصائد کان لگا کر سنتے اور غیر شعوری طور پر سمجھتے کہ وہ اس کام کے لئے پیدا کئے گئے ہیں نہ کہ صرف و نحو سیکھنے کے لئے فیاض قدرت نے انہیں بلا کا حافظہ اور نقل اتارنے کا عجیب ملکہ عطا کیا تھا جو بھی سنتے یاد ہو جاتا اور اس کی نقل اتارنے کی کوشش میں وہ گانے لگتے اس فن میں پورے اترتے تو لوگ حیرت کا اظہار کرتے ناکام ہوتے تو مضحکہ اڑایا جاتا۔ بہرحال ان کا استفادہ برابر جاری رہتا۔

اس کے علاوہ انہوں نے زندگی کی قدروں کا خوب مطالعہ کیا تھا جس کے سمجھنے سے بڑے بڑے اعاظم باوجود نمایاں اثر کے قاصر رہے تھے کیونکہ انہوں (عبداللہ ندیم) نے حس کی تیزی۔ نفس کی بیداری

تنگدستی کے باوجود عام لوگوں جیسی پرورش پائی تھی وہ عوامی زبان اور ادب سے گہری واقفیت رکھتے تھے اسکے امثال وحکایات۔ وجوہ معاملات اور صوفیانہ تصرفات سے خوب آگاہ تھے اس سے ان کی مستقبل کی ادبی زندگی پر بڑا اثر پڑا ایک فن کار کا احساس نفس درختوں کے پتوں اور ٹہنیوں کی حرکت چیونٹیوں کی چال۔ دل آویز مسکراہٹ۔ خوبصورتی اور بدصورتی کی باریکیوں کو محفوظ کر لیتا ہے اور جس وقت چاہے ان سے کام لے سکتا ہے۔

بھلا ان ادبی اشغال سے مادی زندگی کو کیا نفع پہنچ سکتا تھا عبداللہ ندیم شاید ایک قرش بھی کما نہ سکے ان کے باپ کب تک ان فضولیات کو برداشت کر سکتے تھے جب تک عبداللہ ندیم مکتب اور مدرسیں پڑھتے سب وہ صبر سے ان پر خرچ کرتے رہے انہیں آس لگی ہوئی تھی کہ عبداللہ فارغ ہو کر بڑے عالم بنیں گے۔ ان کے ہاتھوں کو لوگ بوسہ دیں گے اور کپڑوں سے برکت حاصل کریں گے لیکن یہ بیت بازی اور خالی نثر نویسی تو شیطانی کام تھا جس کا اللہ تعالیٰ کی عبادت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ شیطان کے پرستاروں پر خرچ کر کے کس طرح اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کر سکتے تھے۔

جب ان کے والد نے ان کی کفالت سے ہاتھ اٹھائے تو عبداللہ ندیم کو ملازمت کی تلاش ہوئی بعد از خرابی بسیار انہوں نے ٹیلیگرافی کا کام سیکھ لیا۔

پھر وہ قصر عالی کے مکتب میں جہاں تبدیل کر دیئے گئے۔ خدیو اسماعیل کی والدہ رہتی تھی یہ بہت بڑا محل دریائے نیل کے کنارے پر واقع تھا یہاں نوکروں چاکروں کی بھیڑ تھی۔ گانا بجانا اور کھیل تماشہ ہوا کرتا تھا شاہی ٹھاٹھ باٹھ تھا۔ یہاں آکر عبداللہ ندیم اونچے طبقوں کی زندگی سے متعارف ہوئے۔ اسکندریہ میں تو انہوں نے غریبوں اور مفلوک الحالوں کی زندگی سے آگاہی حاصل کی تھی۔

ادب اور ادبی مجالس کا چسکا انہیں دوبارہ قاہرہ لے آیا یہاں محمود سامی البارودی کی مجلس تھی جہاں پر لطف قصے سنائے جاتے۔ ادب قدیم کا ذکر چلتا۔ ادب جدید گا کر پڑھا جاتا ایک معنی کو مختلف عبارتوں میں پیش کیا جاتا۔ نقد و تبصرہ ہوتا۔ درمیان میں ہنسنے اور ہنسانے والے واقعات سنائے جاتے۔ میٹھی میٹھی ادبی گفتگو ہوتی عبداللہ ندیم کی رسائی بھی اس مجلس میں ہوئی اور یہاں آکر مختلف ادیبوں سے ان کے روابط قائم ہوئے یہاں کے سات ادیب قابل ذکر ہیں جن کے معارف اور ادب کے وہ خوشہ چین رہے تھے محمود سامی البارودی مصر کے مشہور شاعر تھے۔ عبداللہ پاشا فکری شیخ الادباء تھے۔ سید ابوالنصر بلیغ کاتب تھے۔ محمود صفوت الساعاتی فنون ادب پر حیرت انگیز اطلاع رکھتے تھے۔ بہت سا کلام حفظ تھا۔ شیخ احمد الزرقانی منشی اور ادیب تھے۔ محمد بک سعید بن جعفر پاشا

منظوم شاعر اور ناشر تھے اور عبدالعزیز بک حافظِ ادب اور ادبا کے عاشق اور یار غار تھے۔ ان ادبا تک ان کی رسائی شیخ احمد وہبی کی معرفت ہوئی تھی جو خود شاعر اور شعر پرست تھے اور وقائع مصریہ کے مضمون نگار بھی رہ چکے تھے۔

متذکرہ بالا ادبا کے سرچشمہ علم سے انہوں نے سیرابی حاصل کی۔ دن کو وہ محکمہ ٹیلیگراف میں کام کرتے اور رات کو ادبی مشاغل میں مصروف نظر آتے۔

قسمت نے ان کی یاوری نہ کی انہوں نے قصر عالی میں ایک غلطی کا ارتکاب کیا تھا۔ جو خلیل آغا کے غیظ و غضب کا سبب بنی خلیل آغا (الخدیو) اسماعیل پاشا کے محل کا داروغہ تھا محل میں آغوں (خواجہ سراؤں) کی کثرت تھی جن کے ذمے مختلف کام ہوا کرتے تھے۔ یہ لوگ آنے والی عورتوں کو باب الحریم تک پہنچایا کرتے تھے۔ آغا خلیل نے خدیو اسماعیل اور اس کی والدہ کے سبب وہ اثر و رسوخ حاصل کیا جو کسی سیکرٹری اور وزیر کو بھی حاصل نہ تھا اس کا اشارہ حکم اور طاعت غنیمت شمار کی جاتی تھی بڑے بڑے امرا اس کے سامنے جھکتے اور اس کی خدمت کو باعث فخر سمجھتے تھے۔ حکومت کے محکموں اور چھاؤنیوں میں اسی کا حکم چلتا تھا مصر اور سوڈان میں اس کی فرمانروائی تھی۔ اس نے بہت بڑی دولت اکٹھی کر رکھی تھی گویا وہ اپنے زمانہ کا کافور الاخشیدی تھا۔ شادی بیاہ کے معاملات اس کی سرکردگی میں سرانجام پاتے وہ عجیب خصلت کا انسان تھا عبادت گذار تھا اور ظالم بھی مغلوب الغضب تھا لیکن خیرات صدقات سے مدرسہ بھی بنا دیتا۔

اب آغا خلیل عبداللہ ندیم سے ناراض ہو گئے تو ان کا کہاں ٹھکانا ہو سکتا تھا زمین باوجود وسعتوں کے ان پر تنگ ہو گئی۔ قاہرہ اور اسکندریہ میں ملازمت نہ مل سکی تو ایک گاؤں میں فروکش ہو کر وہاں کے رئیس کے بچوں کو پڑھانے لگے۔ لیکن یہاں بھی ان کی نبھ نہ سکی وہ رئیس سے لڑ پڑے اس کی ہجو میں قصیدہ کہہ دیا منصورہ کے چند با مروت رؤسا کو ان کی بدحالی کا پتہ چلا تو انہوں نے بلا کر ان کا اعزاز و اکرام کیا اور ان کے لئے رومالوں کی دوکان کھول دی۔ یہاں وہ رومال بیچتے اور ادبی مشاغل میں بھی مصروف رہا کرتے۔ ادب پسند اصحاب یہاں اکٹھے ہوتے ادب کا تذکرہ ہوتا۔ بیت بازی ہوتی اور لطائف و ظرائف کا تبادلہ ہوتا۔ اس اثنا میں کبھی کبھار کوئی رومال یا عمامہ خریدنے والا آ نکلتا۔ موجودہ تمدن کی ریل پیل سے قبل کا ذکر ہے کہ شہروں اور قصبات میں اگر کوئی بنیا جو لکھا پڑھا ہوتا تو اس کی دوکان میں فقہ۔ حدیث اور ادب پر بحث ہوتی اب تو ہر چیز کا موقعہ اور محل الگ ہے۔ تجارت کے لئے علیحدہ جگہ ہے۔ اور فقہ۔ حدیث اور ادب کے مشاغل کے لئے دوسری جگہ ہے۔ ہمارے زمانہ میں بعض دوکانیں مدا۔ ژنان خانہ

مدارس کا کام دیتی تھیں۔ ان میں ادبی نشستیں ہوا کرتی تھیں ادب تو ایک قسم کا اثاثہ تھا جس سے کسی کو آمدنی کی توقع نہ ہوسکتی تھی اس وقت بعض ادیب اسی طراز کے تھے۔ مثلاً حسن آفندی عبدالباسط جو مشہور ادیب اور ہجو گو شاعر تھے عطاری کی دوکان کیا کرتے تھے۔ شیخ احمد وہبی مشہور شاعر اور ادیب نے ٹوپیوں کی دوکان کھول رکھی تھی ان کے ہاں ادیب اور شاعر آنکلتے تھے ان کی دوکانیں چل نہ سکیں کیوں کہ ادیب ایک قسم کا فن کار ہوتا ہے اور فن کار کو درہم و دینار کی بجائے ذوق فنی عطا ہوتا ہے۔ کاروبار کے لئے ضبط اور تنظیم کی ضرورت ہے۔ آمدنی اور خرچ پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔ برخلاف اس کے فن کار آزاد منش ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو قیود اور حدود میں جکڑ نہیں سکتا۔ بہرحال عبداللہ ندیم کی دوکان میں شعر و شاعری کا چرچا رہتا اور رومال وجراب غائب ہونے لگے بالآخر دوکان بند ہوگئی اور عبداللہ ندیم رزق کی تلاش میں مارے مارے پھرنے لگے کبھی کبھی ادبی ذوق رکھنے والوں کے ہاں مہمان بن کر رہتے۔ پھرتے پھراتے وہ طنطا جا نکلے اتفاق سے اس روز وہاں ایک رئیس کی سالگرہ تھی وہاں ایک ایسا حادثہ رونما ہوا جس سے عبداللہ ندیم کی شہرت تمام ملک میں پھیل گئی۔

بعض گھروں میں دوستوں۔ یار باشوں اور ادب کے شائقوں کی محفلیں جمتی تھیں۔ ان میں رات کو گپ بازی اور لطائف و ظرائف کا تبادلہ ہوتا۔ کسی میں ادبی اجتماع ہوتا تو کسی میں علم فقہ کے مسائل کا چرچا رہتا۔ ان میں ہر انسان اپنے ذوق کی تسکین حاصل کر سکتا تھا۔ ان کے سرپرست علمی اور فنی ذوق رکھنے والے اعلیٰ درجے کے گھرانے ہوتے۔ خود ہمارے محلہ میں تین گھر اس قسم کے تھے۔ ایک شرعی قاضی کا تھا جس میں رات کو فقیہ اور ادیب جمع ہو کر دینی علوم کی باتیں کرتے۔ دوسرا سرکاری عہدہ دار کا مکان تھا۔ وہاں شب کو ظرافت آمیز قصہ کہانی سنائی جاتی تھی تیسرا دف والے کا گھر تھا اس کے ہاں بہت سے آلات موسیقی رکھے ہوئے تھے وہ ساری رات عیش و طرب میں گذارتا۔ خوشحال گھرانے جو علم و فن اور ادب کے قدرداں ہوتے اپنے ہم ذوقوں کے لئے گھروں کا دروازہ کھلا رکھتے اور کام و دہن سے ان کی خاطر داری کرتے۔

طنطا میں شاہین پاشا کا مکان بھی اسی قبیل کا تھا۔ وہ بحری انسپکٹر تھے اس کے ساتھ ادب نواز۔ حاتم صفت اور فراخ حوصلہ تھے۔ عبداللہ ندیم کی ان سے شناسائی ہوئی۔ عبداللہ ندیم بدصورت تھے۔ لیکن ساتھ ہی تیز طرار۔ خوش مذاق اور حاضر جواب تھے اس بنا پر شاہین پاشا نے انہیں اپنا مصاحب بنا لیا۔

(۴)

ایک دفعہ ۱۲۹۱ھ میں وہ قہوہ خانہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یار لوگوں کا جمگھٹا لگا تھا۔ سید علی ابوالنصر شاعر

اور شیخ احمد ابوالفرج الدمنہوری مشہور ادیب بھی موجود تھےلہ کہ وہ داد باقی آ نکلے۔

ادباتیہ بھانڈوں کی جماعت تھی۔ جو چرب زبانی۔ حاضر جوابی اور بیت بازی سے بھیک مانگا کرتے تھے۔ یہ لوگ پھکڑپن کے لئے مشہور تھے۔ اگر کوئی ان کو جھڑک دیتا تو فوراً اس کی تعریف میں شعر کہنا شروع کر دیتے اور خیرات لے کر ٹلتے۔ قوت لسانی اور بدیہہ گوئی کے علاوہ ان کا لباس اور سامان کی حرکات مضحکہ خیز ہوتیں وہ طبلہ بغل میں تھام کر بندروں کی طرح تھرکتے اور ناچتے۔ ان دونوں نے عبداللہ ندیم کو ایک شعر سنایا انہوں نے بھی ایک شعر کہہ دیا۔ اس طرح سوال وجواب اور جواب در جواب کا چکر ایک گھنٹہ تک چلتا رہا بالآخر بھانڈ شکست کھا کر بھاگ نکلے۔

سید علی ابوالنصر نے یہ واقعہ شاہین پاشہ کے گوش گذار کیا وہ سن کر بے حد محظوظ ہوئے ان کو ایک عجیب بات سوجھی کہ ایک محفل میں بڑے بڑے بھانڈوں کو بلایا جائے اور عبداللہ ندیم کو ان کی بدیہہ گوئی اور بیت بازی کا جواب دینے پر آمادہ کیا جائے تو خوب مزا آئیگا چنانچہ ایسا ہی ہوا ان کے گھر کے سامنے قناتیں لگا دی گئیں اس فن کے ماہر استاد بلائے گئے اور شرط یہ رکھی گئی کہ اگر وہ عبداللہ ندیم سے بازی لے جائیں تو انہیں انعام واکرام سے سرفراز کیا جائے گا اور اگر مغلوب ہو جائیں تو پٹائی ہوگی یہ مناظرہ اور مساجلہ کوئی تین گھنٹے تک ہوتا رہا جس میں عبداللہ ندیم کو کامیابی ہوئی جو ادبا اور ظرفا میں ان کی شہرت کا سبب بنی۔

اس واقعہ کے بعد یار لوگوں نے عبداللہ ندیم کو آڑے ہاتھوں لیا۔ انہیں غیرت دلائی کہ وہ بھانڈوں کے مقابلہ میں کیوں اترے ایک ادیب تو ایسی حرکات کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔

انصاف کی بات یہ ہے کہ عبداللہ ندیم سے لوگوں نے زیادتی کی ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی ہنسنے اور ہنسانے والی بات پر لغوی اور نحوی تنقید شروع کر دے یا کسی باوقار بزرگ کو اس کے ایام جوانی کا طعنہ دیا جائے یا کسی امیر کو اس کی بدحالی اور غربت کا حوالہ دیا جائے۔ واقعہ ظرافت آمیز نوعیت کا تھا اس میں ایسی باتیں پیدا ہو گئی تھیں جو سنجیدہ اور باوقار مجالس کے منافی تھیں

آخر کار ۱۸۷۹ء میں وہ اپنے شہر اسکندریہ واپس چلے آئے اس وقت ان کی عمر ۳۴ سال تھی اس اثنا میں سیر و سیاحت۔ تجربہ و مشاہدہ اور مختلف لوگوں کے میل جول سے وہ بہت کچھ سیکھ چکے تھے انہوں نے تجارت بھی کی تھی لیکن نقصان اٹھایا تھا کسانوں کے طور طریق سے بھی واقفیت پیدا کی تھی لیکن مادی لحاظ سے وہ خالی ہاتھ لوٹے۔

لہ راس وہاری

اسکندریہ واپس آئے تو ملک کا رنگ دوسرا تھا ادبی مجالس میں پہلے تو ابو نواس کے تغزل کی بحتری کی وقائع نگاری اور ابن الرومی کی ہجویہ شاعری کا تذکرہ رہتا تھا یا اسماعیل پاشا کی تعریف و توصیف میں قصائد یا شیخ علی اللیثی کے فکاہات کا بات آگے بڑھتی تو شعرائے محدثین جنہوں نے متقدمین کا معارضہ کیا ہے ان کا ذکر چھڑ جاتا یا لطیفہ گوئی ہوتی۔ لیکن اب ادبی مجالس میں قومی مسائل، ملکی قرضہ اور اجنبی مداخلت کا چرچا تھا ایک خفیہ انجمن تھی جس میں ان مسائل پر جوش و خروش سے اظہار خیال کیا جاتا تھا۔ اب لٹریچر اور ادب نے دوسرا قالب اختیار کر لیا تھا۔ جس میں ملکی مصالح اور قوم کے دکھ اور درد کا ذکر ہوتا ابو نواس اور صریع الغوانی کی غزلیات قصۂ پارینہ بن چکی تھیں، سید جمال الدین افغانی اور ان کے رفقائے نامدار کی بدولت ادب نے دوسرا رنگ اختیار کر لیا تھا وہ سیاسی اخبارات اور تنقیدی مقالات کے ذریعہ ادب کو پروان چڑھا رہے تھے۔ اس قسم کی صحافت میں ادیب اسحاق اور سلیم نقاش آگے آگے تھے اور سید جمال الدین افغانی اور انکے تلامذہ مقالات اور ارشادات سے ان کی مدد کیا کرتے تھے۔

عبداللہ ندیم بھی اس معرکہ میں کود پڑے اور جدید ادبی تقاضوں سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے لگے۔ جدید موضوعات پر اخبارات میں مضامین لکھنے پر ان کو بہت بڑی کامیابی نصیب ہوئی اور لوگوں کی انگلیاں ان کی طرف اٹھنے لگیں انہوں نے یہ گر سمجھ لیا تھا کہ سیاسی موضوع پر قلم اٹھانے کے لئے سادہ مگر پر زور اسلوب بیان چاہیے۔ مسجع طرز بیان چنداں فائدہ مند ثابت نہیں ہو سکتا۔

خفیہ پارٹی کے بعض اراکین کے ساتھ انہوں نے سوچا کہ پارٹی کا کام علی الاعلان ہونا چاہئے۔ انہوں نے ایک انجمن بنائی جس کا نام الجمعیۃ الخیریۃ الاسلامیۃ رکھا اس کے لئے وہ اور ان کے دوست سکندریہ کے اصحاب ثروت سے چندہ جمع کرنے لگے اس سے ان کی بڑی غرض ایک نئے مدرسہ کا قیام تھا اس کا نظام تعلیم سرکاری مدارس سے بالکل علیحدہ تھا وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ طلبہ میں حب الوطنی کا جذبہ اور قومی شعور پیدا کرنا چاہتے تھے اور یہ ایک قسم کی نئی بات تھی۔

یہ تجویز عملی صورت اختیار کر گئی چندہ جمع ہوا اور مدرسہ قائم ہو گیا اب عبداللہ ندیم مدرسہ کے مہتمم مقرر ہوئے انہوں نے مدرسہ کا افتتاح ایک ولولہ انگیز تقریر سے کیا جس کی صدا تمام ملک میں گونج اٹھی۔ بہت سے مفلوک الحال اور یتیم بچوں نے مدرسہ میں داخلہ لیا۔ اس کے لئے خاص نصاب تعلیم وضع کیا گیا۔ ادب اور انشاء کی تعلیم عبداللہ ندیم نے خود اپنے ذمہ لی طلبہ کو خطابت اور تمثیل کی تعلیم دینے لگے۔ مختصر طور پر انہوں نے مدرسہ میں زندگی کی روح پھونک دی مصر میں اپنی قسم کی یہ پہلی اسلامی انجمن تھی۔

اس کے بعد قصر شاہی اور مدرسہ کے روابط بڑھنے لگے۔ ان ایام میں خدیو اسمٰعیل معزول ہوئے تھے ان کی جگہ توفیق پاشا نے لی تھی۔ عبداللہ ندیم توفیق پاشا کے مقرب بارگاہ تھے انہوں نے خدیو سے مدرسہ کے معائنہ کی درخواست کی خدیو نے مدرسہ آکر دیکھا۔ عبداللہ ندیم نے التجا کی کہ ولی عہد عباس مدرسہ کی سرپرستی قبول کریں جو منظور کرلی گئی۔ انہوں نے طالبعلموں میں تقریر کرنیکا شوق پیدا کیا۔ وہ ہر تقریب سے فائدہ اٹھا کر تقریر کرنیکا موقعہ نکال لیتے۔ طالبعلموں کو خود تقریر لکھ دیتے اور اسکی مشق کرتے ان کی غلطیوں کی اصلاح کرتے اس طرح ایک جماعت تیار ہو گئی جو لکھ ...... اور بول سکتی تھی۔ بعض اجتماعی عیوب کی تنقید میں ڈرامے بھی لکھتے تھے۔ پارٹ ادا کرنے میں وہ اور ان کے شاگرد حصہ لیتے تھے۔ اس قسم کے دو ڈراموں کے نام "الوطن وطالع التوفیق" اور العرب تھے جن کو انہوں نے زیزینیا کے تھیٹر میں کھیل کر دکھلایا تھا۔ کھیل دیکھنے کے لئے توفیق پاشا خود آئے تھے۔ اس کامیابی سے ان کے نام کا چرچا ہونے لگا اس کے بعد جمعیۃ میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی۔ جس کی ذمہ داری ان پر ڈال دی گئی۔ اس پر جمعیۃ اور مدرسہ سے علیحدہ ہو گئے۔

اس اثنا میں ایک اخبار جاری کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس سے پیشتر وہ ادیب اسحٰق اور سلیم نقاش کے اخباروں میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ وہ مشاق اہل قلم تھے۔ اور سمجھتے کہ لوگ ان کی تحریر کو پسند کرتے ہیں۔ اخبار والے ان کے مقالات شائع کرتے تھے۔ تو ان کو کچھ اجرت نہ دیتے تھے۔ ان کا نام بھی مضمون کے نیچے نہ دیتے اور قارئین یہ سمجھ لیتے کہ یہ مقالات مدیر کے قلم سے ہیں۔ آخر کار انہوں نے ایک اخبار نکالا جس کا نام التنکیت تھا۔ اس کے اغراض و مقاصد اور اسلوب بیان نام سے ظاہر ہے وہ ایسے اسلوب بیان سے مصریوں کو سرزنش کرتے جو کبھی مضحکہ خیز اور کبھی طنزیہ ہوتا۔

اخبار کا پہلا شمارہ بتاریخ ۶ جون ۱۸۸۱ء کو شائع ہوا۔ انہوں نے اہل قلم اصحاب کو دعوت دی کہ اپنے مقالات اور نتائج فکر سے ان کے مخصوص طرز بیان کی تائید کریں۔ تنکیت نے جہالت۔ خرافات کے خلاف اعلان جنگ کر رکھا ہے ہم نے خواہشات نفسانی کی پیروی میں صحیح راستہ بھلا رکھا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے یہ اخبار تعجب انگیز تھا۔

پہلے شمارہ میں ایک مقالہ کا عنوان بادِ فرنگ کے مریض کے لئے طبی مجلس ہے یہ ایک خوبصورت اور تندرست نوجوان کا قصہ ہے۔ جو ایک مکارہ کے پیچھے لگ کر بداعمالیوں کے ہاتھوں تباہ ہو جاتا ہے۔ دوسرے مقالہ کا عنوان عربی تفرنج ہے۔ اسمیں ایک مصری نوجوان کا ذکر ہے جو نیا نیا ولایت سے پڑھ کر واپس آتا ہے۔ اور اپنے والد سے استدعا کرتا ہے۔ کہ وہ اس کا ہاتھ چومنے کے بجائے صرف سلام کرے۔ وہ اپنی زبان بھول

جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے پیاز کا نام نہیں آتا۔ وہ اسے ONION اونین لکھ کر پکارتا ہے۔ وہ اس قصہ کو ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں کہ جو لوگ اپنی زبان اور قومی عادات بھول جاتے ہیں ان سے کسی قسم کی بہتری کی توقع نہیں رکھنی چاہیئے

اس کے بعد ان خوشحال لوگوں کا قصہ ہے جو دنیا و مافیہا سے بے خبر اور بے غم ہو کر زندگی گذارتے ہیں۔ پھر ایک کہانی میں ان لوگوں پر نقد کیا ہے جو قہوہ خانوں میں بیٹھ کر عنترہ اور زغبہ کا قصہ سنتے ہیں اور آپس میں دست و گریباں ہوتے ہیں۔ اس قصہ کے اواخر میں ایک جاہل کسان اور فریبی انسپکٹر کی تمثیل ہے جس میں انسپکٹر مکر و فریب سے غریب کسان سے رقم ہتھیا لیتا ہے۔

ایک امیر کبیر کی کہانی بھی لکھی جس نے بہت بڑا مکان بنایا تھا۔ اسمیں ایک کتب خانہ تھا جو وارد و صادر کو دکھلایا جاتا تھا ایک دن کسی نے رئیس صاحب سے پوچھا کہ آپ کے ہاں کون سے علوم و فنون کی کتابیں موجود ہیں۔ جواب ملا کہ میں فلاں صاحب کے ہاں گیا تھا۔ ان کے پاس بہت بڑا کتب خانہ تھا۔ ان کا خادم کتابوں کو جھاڑ پونچھ رہا تھا۔ میں نے سمجھا کہ مکان کی زینت کے لئے کتب خانہ کا ہونا ضروری ہے۔ میں نے بھی ان کی ریس میں کتب خانہ قائم کیا ہے۔ حالانکہ مجھے علم و فن کی کوئی خبر نہیں ۔ اس طرح سب لوگ تقلید و غفلت کی نیند سو رہے ہیں۔

اس طرح وہ سیاست عامہ اور عیوب اجتماعیہ پر نقد و تبصرہ کیا کرتے تھے۔ اس کے لئے وہ سہل اور آسان زبان استعمال کرتے۔ اخبار کے افتتاحیہ میں لکھا تھا کہ وہ مضمون کو مجازات اور استعارات سے مزین نہیں کرنا چاہتے۔ نہ تو دیر اور فخامت الفاظ سے اس کو بھاری بھرکم بنانا چاہتے ہیں۔ نہ علم اور ذہانت کی نمائش کرنا چاہتے ہیں نہ اظہار بیان کے لئے فیروز آبادی کی قاموس کا سہارا لینا چاہتے ہیں اس کے لئے تاریخ اور جغرافیہ کی طرف ۔۔۔۔ مراجعت کی ضرورت نہیں۔ نہ کسی ترجمان اور مفسر کی امداد چاہیئے۔ یہ تو نشست و برخاست کی بے ساختہ زبان ہے ان کو تجربہ ہو چکا تھا کہ ملک کے عوام و خواص نقد و تبصرہ کے لئے ادب اور اشعار کی غذا مانگتے ہیں لہذا وہ دقیق موضوع کے لئے فصیح زبان اختیار کرتے۔ قصص کے لئے عامی زبان استعمال کرتے۔ قصہ کے افراد۔ ملازم اور مالک۔ مرد اور عورت۔ امیر اور فقیر۔ بے وقوف اور دھوکہ باز سب عامی زبان بولتے نظر آتے ہیں۔

انہیں ایک بڑی بات سوجھی کہ قصص اور کہانیوں کے ذریعہ سے بھی دلپذیر تعلیم دی جا سکتی ہے اس سے قوم کے عیوب و نقائص پر زیادہ کارگر نقد اور تبصرہ کیا جا سکتا ہے۔

دوسرے شمارہ میں انہوں نے سیاسی اور اجتماعی اصلاح کی راہ میں خطرے کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔ ان کے نزدیک مشرق کی غفلت کا سب سے بڑا سبب ضعف خطابت ہے۔ لوگوں نے صرف مساجد میں تقریروں پر اکتفا کر لیا ہے۔ اور یہ تقریریں حقیقی زندگی کے واقعات سے خالی ہوتی ہیں۔ چند رٹی ہوئی دینی عبارتیں ہوتی ہیں جو نہ دل کو گرما سکتی ہیں اور نہ زندگی میں روشنی کی کرن پیدا کر سکتی ہیں۔

انہوں نے ایک زوردار مقالہ خطابت کی قدر و قیمت اور اسلام میں اس کے اثرات پر لکھا اور دعوت دی کہ مساجد کے لئے وہ لوگ تقریریں تیار کریں جو بنیادی معاملات سے اچھی طرح خبردار ہو کر قوم کو خطرات سے آگاہ کر سکیں۔ خوشحال افراد اس کے لئے مالی امداد دیں۔ محکمہ اوقاف کے تعاون سے اس قسم کے خطبات مساجد میں دیئے جائیں۔ پھر ان کو چھاپ کر تمام ملک میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ ان کی آواز ہر گاؤں اور ہر شہر میں پہنچ جائے۔ انہوں نے ان اغراض و مقاصد کے پیش نظر نمونہ کے طور ایک خطبہ لکھا جس میں قوم کی حق تلفی، گمراہی، ظلم اور فساد سے منع کیا۔ گرد و پیش کے خطرات کے پیش نظر اتحاد اور الفت کی دعوت، ابنائے وطن سے مذہبی اختلاف کے باوجود اتحاد، مصر کی عظمت رفتہ کی یاد، خلیفۃ المسلمین اور خدیو مصر سے وفاداری، بیرونی تسلط سے ہوشیار رہنے اور غیر ملکی تاجروں سے مہمانوں سا سلوک کرنے کی دعوت دی تھی۔

انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ ان مضامین کے خطبوں کی اس وقت اشد ضرورت ہے لہٰذا ان کو دینی رنگ دے کر خطبہ جمعہ کے مناسب بنا دیا۔ خطبہ کی ابتداء اللہ اور اس کے رسول کی حمد و ثنا سے کرتے اور حدیث شریف کے ان الفاظ پر ختم کرتے " ایک مومن دوسرے مومن کے لئے دیوار کا حکم رکھتا ہے جس کے ایک حصہ کو دوسرا حصہ سہارا دیتا ہے " آخر میں یڈیو نے نشر و اشاعت سے ان کے عزائم کی تکمیل کی۔ لیکن معنوی طور پر ابھی تک کچھ نہیں ہو سکا۔ آخرکار یہ اخبار بند ہو گیا۔

خدیو اسماعیل کے اواخر عہد تک رائے عامہ کو ظلم کا احساس نہ تھا۔ بالفرض اگر احساس بھی ہوتا تو کسی کو لب کشائی کی تاب نہ تھی۔ کیونکہ مسلسل استبداد نے ان کے شعور کو مردہ اور زبانوں کو گنگ کر دیا تھا۔ ادھر یورپ نے ملک کے اندرونی معاملات میں دخل دینا شروع کر دیا تھا۔ اس پر اسماعیل نے لوگوں کو ابھارنا شروع کیا۔ پولیس والوں کو تاخیر سے تنخواہیں ملتی تھیں۔ انہوں نے تنگ آ کر وزارت مالیات کے سامنے مظاہرہ کیا۔ اس میں خدیو اسماعیل کا ہاتھ تھا۔ کیونکہ وہ تو بار سے گلوخلاصی کرانا چاہتا تھا۔ جو کہ بیرونی طاقتوں کا آلہ کار تھا۔ پھر شہر کے سرکردہ اصحاب السید البکری کے گھر جمع ہوئے اور یورپ کا قرضہ اتارنے اور اجنبی مداخلت کو رد کرنے کی تدابیر

لگے۔ اس تحریک کے پس پشت خدیو کا ہاتھ کام کر رہا تھا اس نے عوام کو ان کی طاقت کا احساس دلایا اور سمجھایا کہ حاکم ان سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ رائے عامہ کو بیدار کیا کہ وہ ظلم و ستم کا مقابلہ کر کے اپنے حقوق کا نعرہ لگائیں۔ اس کے لئے راہنماؤں کی ضرورت تھی جو لوگوں میں بیداری کی روح پیدا کریں۔ سید جمال الدین افغانی اور ان کے مکتب فکر نے یہ کمی پوری کر دی۔ توفیق پاشا کا دور حکومت آیا تو رائے عامہ بیدار ہو رہی تھی۔ اس کے بعد ایسے اہم واقعات پیش آئے جنہوں نے اس شعور کو پروان چڑھایا۔ یہ لوگ توفیق پاشا سے خوش تھے۔ کیونکہ وہ رحم دل اور فراخ حوصلہ تھا۔ اسماعیل کی معزولی سے پیشتر وہ سید جمال الدین سے ملا جلا کرتا تھا۔ اور ان کی اصلاحی آراء کا مداح تھا۔ جب خدیو بنا تو سید صاحب کو بلا کر کہا کہ آپ کی ذات سے میری امیدیں وابستہ ہیں۔ تشکیل وزارت کا کام شریف پاشا کے سپرد کیا اور صاف کہہ دیا کہ میں قوم کی آرزوئیں بر لانا چاہتا ہوں۔ سرکاری محکموں کے اخراجات میں بچت۔ عدلیہ اور انتظامیہ کی اصلاح۔ نظام شوریٰ کے قوانین کی توسیع سرکاری محکموں کی تنظیم۔ تعلیم کی اشاعت۔ زراعت اور تجارت کا فروغ اور کارکنوں کو ان کے اعمال میں آزادی دینا چاہتا ہوں۔

عوام نے جب یہ وعدے سنے تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ بہت سے گروہ شوریٰ کے نام سے ہاتھ کان پر دھرتے تھے۔ خاص کر خدیو کے حاشیہ نشین۔ سید جمال الدین نے توفیق پاشا کو مشورہ دیا کہ وہ اسماعیل کے حواریوں کو علیحدہ کر دے جس سے وہ ناراض ہو گئے۔ شیخ محمد عبدہ کا بیان ہے۔ کہ فرانسیسی سفیر میزانیہ کی تصحیح میں رکاوٹیں ڈالتا تھا۔ اور انگریزی سفیر نے جدید نظام حکومت کی برائیوں سے خدیو کو آگاہ کر کے فرانسیسی سفیر کی ہم نوائی کی تھی۔ اس سے خدیو نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ شریف پاشا مستعفی ہو گئے۔ سید جمال الدین ملک بدر کر دیئے گئے اور واقعات پرانی ڈگر پر چلنے لگے جس سے عرابی پاشا کی بغاوت کا راستہ صاف ہونے لگا۔

شریف پاشا کے بعد ریاض پاشا نے وزارت بنائی۔ مصر جدید کی تاریخ میں شریف پاشا پارلیمنٹری نظام حکومت اور ریاض پاشا استبدادی حکومت کے علمبردار سمجھے جاتے ہیں۔ دونوں کے اپنے اپنے حامی گروہ تھے۔ شریف پاشا کی حامی پارٹی کا خیال تھا کہ نمائندہ حکومت سے ملک بدنظمی اور انتشار سے نجات حاصل کر سکتا ہے اس سے لوگوں میں آزادی اور اطمینان پیدا ہوگا۔ ریاض پاشا کی پارٹی کا اعتقاد تھا کہ جب تک قوم کی سیاسی استعداد پختہ نہ ہو جائے۔ سیاسی امور سے واقفیت نہ حاصل کر لے۔ قول اور عمل میں پختگی اور شجاعت کا ملکہ اس میں نہ پیدا کر لے۔ نمائندہ حکومت ایک بڑی مصیبت کا پیش خیمہ ہوگی۔ اخبارات اور مجالس میں بھی

فکری نزاع برپا تھی۔ بہرحال اس سے رائے عامہ میں سیاسی بیداری اور ان کے فکر و نظر میں وسعت پیدا ہوئی۔

ریاض پاشا کی شخصیت بھی معجون مرکب تھی۔ وہ عقل مند۔ نظام حکومت سے باخبر۔ عزم کا دھنی۔ بید محنتی اور خود رائے تھا۔ حمایت اور مخالفت دونوں میں حد سے گزر جاتا ۔ مصریوں کے متعلق اچھی رائے نہ رکھتا تھا۔ سمجھتا تھا کہ مصریوں میں تمام زمانے کے عیب بھرے ہوئے ہیں اور اغیار کی تعظیم کرنا اس کا عقیدہ تھا کہ دول یورپ کو اعتماد میں لے کر اچھی طرح سے حکومت کی جا سکتی ہے۔ ان کو خوش کرنے کے لئے خدیو اور قوم کی ناراضگی مول لینے میں اسے باک نہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی ملک کی بھلائی میں کوشاں تھا۔ اقتدار سے جدا ہونا اسے پسند نہ تھا۔ اس قسم کی عادات نے عرابی پاشا کی بغاوت کے لئے راستہ صاف کیا۔ اس کے بعض احکام ناعاقبت اندیشی پر مبنی تھے جس سے اعیانِ قوم ناراض ہو گئے۔

○

دو سیکرٹریوں کے ذمے تمام اختیارات تھے۔ انہوں نے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے بہت سے اخبارات بند کرا دیئے جس سے لوگ چھپ کر خفیہ کارروائیوں میں مصروف ہوئے۔ بہتوں نے یورپ کی راہ لی اور وہاں سے اخبارات نکلنے لگے جن میں مصری حکومت پر طعن و تشنیع ہوتا۔ ریاض پاشا نے خدیو کو اس کے بہت سے پسندیدہ اعمال سے بھی روکا۔ جس سے وہ ناراض رہنے لگا۔ ملٹری سیکرٹری کے تصرفات سے فوج خوش نہ تھی۔ عرابی پاشا نے فوج کی شکایات پیش کرنے کے لئے ایک فوجی مجلس قائم کی تو ریاض پاشا ان کے مطالبات منظور کرنے پر مائل ہو گیا۔ پھر افواہ پھیل گئی کہ اس نے یہ مطالبات نامنظور کر دیئے ہیں اس سے فوج میں ناراضگی پیدا ہوئی۔ لیکن وہ اقتدار سے چمٹا رہا۔

قوم کی بے چینی روز بروز بڑھ رہی تھی۔ سب تبدیلیٔ حال پر متفق تھے۔ اگرچہ ان کی ناراضگی کے اسباب جدا جدا تھے۔ اعیانِ قوم عوام پر دوبارہ تسلط حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مصری سپاہی چرکسیوں جیسا برتاؤ چاہتے تھے بعض ارباب رائے اسی عدم اطمینان کو اپنے اس نظریہ کی تائید میں پیش کرتے تھے کہ تمام خرابیوں کی اصلاح کا علاج نظام شوریٰ سے ہو سکتا ہے۔ خدیو ریاض پاشا سے اس کی خشونت کے سبب ناراض رہتا تھا۔ بعض لوگوں کو ریاض کے مالی قواعد بھی پسند نہ تھے۔ اس فکری انتشار سے عرابی پاشا کی بغاوت کی بنیاد پڑی۔ سپاہی پہلے تو مطالبہ کرتے تھے کہ سب سپاہیوں سے یکساں سلوک کیا جائے لیکن اب وہ نظام حکومت کی تبدیلی چاہنے اور خدیو کو معزول کرنے کا نعرہ لگانے لگے۔ کیونکہ وہ اغیار کی حفاظت ڈھونڈتا تھا۔ اس کے بعد

جہاد کی دعوت دی جانے لگی۔ اس طرح یہ تحریک سپاہیوں سے لے کر علماء، اعیان قوم، تجار اور کسانوں تک پھیل گئی بعض لوگ رفیق پاشا کی جگہ امیر حلیم بن محمد علی کو تخت پر بٹھانا چاہتے تھے۔ ایک گروہ کا حامی الوزانطارہ کا ایڈیٹر اور دوسرے کا قائد راتب پاشا تھا۔

اس افراتفری میں عبداللہ ندیم نے عرابی پاشا کے حامیوں کا ساتھ دیا اور ان کے نفس ناطقہ بن گئے۔ انہوں نے تنکیت وتبکیت کی بجائے ایک دوسرا اخبار جاری کیا جس کا نام الطائف تھا۔ وہ اس کا دفتر اسکندریہ سے قاہرہ لے آئے اور اسماعیل کے اعمال پر جرأت اور دلیری سے نقد و تبصرہ کرتے۔ کسانوں کے آلام و مصائب دل کھول کر بیان کرتے کہ وہ امیروں کے ہاتھوں کس طرح مصیبت اٹھا رہے ہیں۔ عوام کی مفلوک الحالی اور ٹیکسوں کی گرانباری کا تذکرہ کرتے۔ انہوں نے عرابی پاشا کو قوم کے حامی کا خطاب بخشا۔ اس کے دوستوں کی حمایت اور دشمنوں کی مذمت کرتے۔ یورپینوں کے تصرفات اور توفیق پاشا کے اعمال کا مضحکہ اڑاتے۔ جب بغاوت شروع ہوئی تو اپنے اخبار کا دفتر چھاؤنی میں منتقل کر لیا اب فوجیوں کو جہاد پر ابھارا جاتا۔ قوم کے نام چندہ کی اپیل شائع کی جاتی۔ اس طرح ہیجان بڑھتا گیا اور اخبار کی اشتعال انگیزی بھی بڑھتی گئی۔ اخبار کے صفحات چار سے گھٹ کر دو رہ گئے۔ مصریوں کی ہزیمت کو فتح کا رنگ دیا جاتا۔ اور انگریزوں کی فتح کو شکست ظاہر کیا جاتا۔ یہاں تک کہ باغیوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

یہ تو تھا ان کا صحافتی کارنامہ۔ تقریری معرکے الگ تھے۔

وہ ہر محفل میں پہنچتے اور تقریر کرتے ان کی زبان آوری سے لوگ حیران رہ جاتے۔ جونہی تقریر کرتے الفاظ اور معانی کا سیلاب امڈ آتا۔ اسوقت ملک میں فن خطابت خوب پھیل گیا تھا۔ جب وہ اسکندریہ کے اسلامیہ سکول میں انشا و ادب کے استاد تھے تو بہت سے نوجوانوں کو خطابت سکھا دی تھی۔ توفیق پاشا کے عہد میں دستور کا اعلان ہوا تو لوگ بہت خوش ہوئے اور سمجھے کہ جدید نظام حکومت ماضی کے مفاسد کی اصلاح کرے گا اور مستقبل کے لئے نیک فال ہوگا۔ عوام بھی اس خوش کو سننے کے شائق رہتے تھے جلسہ پر جلسہ ہوتا۔ عبداللہ ندیم ان کے تلامذہ اور رفقاء بلائے جاتے۔ وہ قوم کی امیدوں اور آرزوؤں کو دل کھول کر بیان کرتے۔ ان جلسوں میں عوام و خواص۔ امیر و کبیر۔ جہلاء و علماء سب حاضر ہو کر لطف اندوز ہوتے۔

جمعیۃ المقاصد نے بھی اسی قسم کے جلسہ کا انتظام کیا تھا جس کا افتتاح عبداللہ ندیم نے قصیدہ سے کیا۔ اس کے بعد ابراہیم لقانی نے عہد استبداد اور عہد شوریٰ کا فرق ظاہر کیا۔ پھر عبداللہ ندیم نے دل کھول کر دونوں زمانوں

کی بابۃ الامتیاز خصوصیات پر روشنی ڈالی۔ مصطفیٰ ماہر (جو بعد میں ماہر پاشا بنے) نے قوم کو علوم و فنون سیکھنے پر ابھارا اور امیروں کو قومی بینک کھولنے کی ترغیب دی اور خاتمہ میں اتفاق اور اتحاد کی دعوت دی۔ شیخ محمد عبدہ نے کھڑے ہو کر نمائندہ حکومت کی خصوصیات بتلائیں اور کہا قومی نمائندہ کے لئے خواندہ ہونا ضروری ہے۔ آپ نے تعلیم کی اشاعت پر لوگوں کو ابھارا۔ تقریر اور تحریر کے احترام کی طرف اُن کو دعوت دی۔ افراد کے حقوق و فرائض کے لئے قانون سازی کی اہمیت جتلائی۔ اس کے بعد ادیب اسحاق اور فتح اللہ آفندی صبری (فتحی پاشا زغلول) نے اتحاد اور ثبات پر تقریریں کیں۔ اس پر جلسہ ختم ہو گیا۔ اس قسم کے اجتماعات روز روز ہوتے۔ شہر کے نامور رئیس عبداللہ ندیم کو تقریر کی دعوت دیتے۔ ان سرگرمیوں کا محور عبداللہ ندیم کی ذات تھی۔ بعض دفعہ ایک ہی موضوع اور بعض دفعہ مختلف موضوع تقریریں ہوتی۔ مثلاً ابراہیم اللقانی قوت و اتحاد کی دعوت دیتے۔ ڈر اور خوف ترک کرنے پر آمادہ کرتے۔ فتحی زغلول جدید تمدن اختیار کرنے کو کہتے۔ شبینہ مدارس قائم کرنے پر قوم کو ابھارتے۔ ان جلسوں کی کاروائی الوقائع المصریہ میں چھپتی۔ تقریروں کا خلاصہ نکلتا۔ اور سارے ملک میں پڑھا جاتا۔ جب دستور معطل کر دیا گیا اور عرابی پاشا کی بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ تو عبداللہ ندیم کی تقریروں کا موضوع انقلاب بن گیا۔ وہ ازہر میں تقریر کرتے فوج میں جا کر تقریر کرتے۔ خوشی یا کسی قسم کے تہوار کا موقع ہوتا تو عبداللہ ندیم اور ان کے تلامذہ وہاں جا نکلتے اور انقلاب پر تقریریں کرتے۔ حتیٰ کہ تمام پیشہ ور گانے والے بھی ان کے خطبات سے لطف اندوز ہوتے۔ محمد عثمان مشہور مغنی تھا اس سے پوچھا گیا کہ کل رات تم کہاں تھے۔ جواب ملا۔ کہ عبداللہ ندیم کی تقریر سننے فلاں جلسے میں گیا تھا۔ وہ بعض اوقات بعید از عقل و فہم باتیں کرتے۔ مثلاً ایک تقریر میں کہا تھا۔ ہم ایک طرف اسکندریہ سے قبرص پر گولہ باری کریں گے اور دوسری طرف آستانہ سے۔ اس کے بعد انگریزی بیڑہ ہمارے رحم و کرم پر ہو گا۔ لوگ یہ سنتے اور تالیاں بجاتے۔ فتحی زغلول تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوتے تو عبداللہ ندیم کہتے۔ کیا تم میرے اس شاگرد کی فصاحت بیان اور مختلف موضوعات پر قادر الکلامی کو تعجب اور حیرت سے نہیں دیکھتے۔ گلیڈسٹون جو انگریزی زبان کا مشہور مقرر ہے وہ ایک وقت میں ایک ہی موضوع پر بول سکتا ہے۔ مصطفیٰ ماہر بولنے کے لئے اٹھتے تو عبداللہ ندیم کہتے کہ جس قوم میں ایسے مقرر موجود ہوں وہ کس طرح مغلوب ہو سکتی ہے۔

عبداللہ ندیم اپنی تقریروں سے قوم کا نفس ناطقہ بنے ہوئے تھے۔ اخباروں میں ان کے مضامین کی نگارش ہر گاؤں اور قصبہ تک پہنچتی تھی۔ اسطرح مصری عوام میں بیداری پیدا ہوئی جو نظام شوریٰ پر ایمان رکھتی تھے اور اقتصادی۔ اجتماعی اور سیاسی اصلاح کی جویاں۔ اس بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر سید جمال الدین افغانی

خواص کے نمائندہ تھے تو عبداللہ ندیم عوام کے تھے۔ انہوں نے سید افغانی کا پیغام تاجروں، کسانوں اور طالب علموں تک پہنچایا۔ سید جمال الدین افغانی اپنے ماحول تعلیم و تربیت اور تقریر و تحریر کے لحاظ سے ارستقراطی تھے۔ لیکن عبداللہ ندیم عوامی آدمی تھے۔

ہم عرابی پاشا کی بغاوت اور اس کے نفع و نقصان کی بحث میں پڑنا نہیں چاہتے۔ اگرچہ عبداللہ ندیم جس انقلاب کی دعوت دیتے تھے وہ ناکامی پر منتج ہوا۔ لیکن اس سے مصری قوم کو بہت فائدہ پہنچا۔ لوگوں میں شعوری بیداری پیدا ہوئی۔ وہ ظلم کے خلاف آواز اٹھانے لگے اور انصاف و عدل کا مطالبہ کرنے لگے۔ انہوں نے لوگوں کے دل میں یہ بات اتار دی تھی۔ کہ بادشاہِ وقت رعیت کے سامنے جواب دہ ہو سکتا ہے۔ مطلق العنان حکومت کے علاوہ اور بھی طریق حکومت ہو سکتا ہے۔ مصر مصریوں کا ہے۔ کبھی اجنبی اور غیر ملکی حکومت کا صوبہ بن نہیں سکتا۔ ان باتوں کو پہلے خواص جانتے تھے۔ اب عوام کے کانوں میں بھی ان کی بھنک پڑنے لگی۔ انقلاب کی آگ تو ٹھنڈی ہو گئی لیکن رائے عامہ آہستہ آہستہ بیدار ہوتی گئی۔

(۴)

عرابی پاشا کی تحریک کی قسمت میں ناکامی لکھی ہوئی تھی۔ لیکن اس سے قوم کے خُلق اجتماعی کو بھی شکست ہو ئی۔ بہت سے راہنما دل چھوڑ چکے تھے۔ ان کے حامیوں نے ان سے آنکھیں پھیر لی تھیں۔ اب لوگ ایک دوسرے کے خلاف غیبت، چغلی اور سازش میں مصروف تھے۔ ہر کوئی اپنے مخالف کو نیچا دکھانے کے لئے اس کو انقلاب میں شرکت کا الزام دیتا۔ خصوصی عدالتوں میں نالشوں کی بھر مار تھی۔ تحریک کے بہت سے شرکائے کار اپنے قول و فعل سے براءۃ ظاہر کر رہے تھے لیکن عبداللہ ندیم کے لئے مشکل کام تھا۔ ان کے خطبے لوگوں کی زبان پر تھے۔ الطائف کے قائل بھی ان کے قول و کردار پر گواہ تھے۔ خیال تھا کہ اگر ان پر مقدمہ چلے گا تو انہیں سزائے موت دی جائے گی۔

عرابی اور اس کے ہمراہیوں نے خدیو سے معافی کی درخواست کر دی۔ انہوں نے اس مضمون کی عرضداشت خدیو کی خدمت میں بھی پیش کی۔ اس عرضداشت کو ادل بدل کر کے عبداللہ ندیم کے پاس بھیجا اور وہ اسے لے کر اسکندریہ بھی گئے لیکن انہیں معلوم ہوا کہ بعض سرکردہ رہنما گرفتار کئے جا چکے ہیں۔

وہ یہ سن کر قاہرہ چلے آئے۔ موت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ اب انہوں نے ملک سے بھاگ جانے کی ٹھانی۔ لیکن حکومت کے ارکان ان کی تلاش میں تھے۔ سلطان پاشا اور ریاض پاشا نے سپاہیوں کو ہدایات دے رکھی تھیں کہ عبداللہ ندیم جہاں بھی ملیں گرفتار کر لئے جائیں۔ سراغ لگانے والے کے لئے ایک ہزار پونڈ کا انعام بھی مشتہر ہو تھا۔ پناہ دینے والے کے لئے سخت سزا مقرر ہوئی۔ لیکن یہ سب کچھ بے کار تھا۔ وہ مقامات حریری کے ہیرو ابوزید سروجی کی طرح بچنے کا کوئی نہ کوئی حیلہ نکال لیتے تھے۔

آخر کار حکومت نے تنگ آکر غیر حاضری میں جلاوطنی کی سزا کا حکم صادر کر دیا۔

عبداللہ ندیم بولاق چلے آئے اور اپنے دوست کے ہاں چھپے رہے۔ جب پولیس کی پوچھ گچھ جاتی رہی۔ تو بھیس بدل کر باہر نکلے۔ سرخ کوٹ زیب تن کیا۔ سرخ عمامہ سر پر باندھا۔ آنکھوں پر رومال ڈال لیا۔ داڑھی بڑھالی۔ ہاتھ میں بڑا سا ڈنڈا لیا اور شیخ طریقت بن کر ایک گاؤں میں چلے گئے اس طرح کوئی بھی انہیں پہچان نہ سکا۔

ان کا خادم جوان پڑھ تھا یہ دیکھ کر گھبرایا اور اپنے گھر جانے کا ارادہ کرنے لگا۔ عبداللہ ندیم نے خیال کیا کہ یہ واپس چلا گیا تو سارا راز فاش ہو جائے گا۔ ایک دن آپ نے اخبار پڑھ کر اضطراب کا اظہار کیا اور لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم کہا۔ خادم نے اس گھبراہٹ کا سبب پوچھا تو کہا حکومت نے میرا سراغ لگانے والے کیلئے ایک ہزار پونڈ اور تمہارا سراغ لانے کے لئے پانچ ہزار پاونڈ کا انعام مشتہر کیا ہے۔ اس پر خادم ڈر گیا اور بھیس بدلنے کیلئے اور زیادہ مستعد رہنے لگا۔ اس کے بعد روپوشی کے زمانہ میں وہ ان کے ساتھ چمٹا رہا۔ عبداللہ ندیم اس زمانے کے متعلق لکھتے ہیں!

"میں مصر سے چھپ کر نکل آیا اور دوسرے ملک میں بھیس بدل کر پھرتا رہا۔ جہاں کہیں جاتا موقع اور محل کے لحاظ سے لباس بدل کر ظاہر ہوتا۔ رفتار گفتار میں فرق نہ پیدا ہونے دیتا۔ اپنے تئیں کبھی مغربی کبھی یمنی ظاہر کرتا اور کبھی مدنی یا فیومی یا شرقاوی یا نجدی بنتا مشیخت کا دعویٰ کرتا تو داڑھی بڑھا لیتا۔ سیاح بنتا تو منڈوا لیتا۔ ایک قصبہ میں داڑھی سیاہ کر لیتا تو دوسرے میں پہنچ کر مہندی لگا لیتا۔ کبھی اپنا نام شیخ یوسف مدنی اور کبھی الحاج علی المغربی بتاتا۔ کسی روشناس سے مڈبھیڑ ہو جاتی تو وہ حیرت کا اظہار کرتا کیونکہ شکل، لہجہ اور آواز بدلنے میں عبداللہ ندیم کو کمال حاصل تھا۔ جس پر لوگ سبحان اللہ جل من لا شبیہ لہ "(پاک اور بزرگ ہے وہ ذات جس کی کوئی شبیہ نہیں) کہہ اٹھتے۔

اس روپوشی میں جو انہیں کامیابی ہوئی۔ اس کی بڑی وجہ انکی حیلہ گری میں کمال مہارت ہے اگر وہ مغربی الاصل

ہونے کا دعویٰ کرتے۔ تو مغربی (شمالی افریقہ) کی زبان بولتے۔ ایک دفعہ انہوں نے یمنی عالم ہونے کا دعویٰ بھی کیا تھا۔ علم و ادب میں ان کی شہرت قاہرہ تک پہنچی۔ ریاض پاشا نے ایک ضرب المثل کسی اخبار میں پڑھی تھی جو اس کی سمجھ میں نہ آئی تھی۔ اس مثل کے معنی دریافت کرنے کے لئے ریاض پاشا نے سعد زغلول کو ان کے پاس روانہ کیا۔ عبداللہ ندیم یمنی عالم کے بھیس میں سعد زغلول سے ملے اور اس ضرب المثل کی تشریح کر دی۔ ان کی حیلہ گری کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ روپوشی کے ایام میں ان کی دوستی ایک فرانسیسی سے ہو گئی تھی اور وہ اس پر اعتماد کرنے لگا تھا۔ اس نے یہ بے پر کی اڑا دی کہ عبداللہ ندیم فرار ہو کر اٹلی چلے گئے ہیں۔ اس افواہ کو الاہرام نے بھی نقل کر دیا تو لوگوں نے سچ مان لیا۔ اس پر حکومت نے پولیس والوں پر سختی کی کہ ان کی غفلت سے وہ فرار ہونے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ حالانکہ یہ عبداللہ ندیم کی صرف ایک چال تھی۔ اس کے بعد پولیس نے ان کا پیچھا چھوڑ دیا "المحروسہ" نے ان کی روپوشی کے دو سال بعد لکھا تھا۔ کہ عبداللہ ندیم کے ٹھکانے کے متعلق جتنے منہ اتنی باتیں ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ وہ اٹلی چلے گئے ہیں۔ کوئی انہیں طرابلس الغرب میں بتاتا ہے۔ کوئی انہیں سوڈان میں مہدی کا ہم جلیس کہتا ہے تو کوئی سیلون میں عرابی پاشا کے ساتھ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ آج کل پیرس میں اقامت گزیں ہیں۔ وہاں انہوں نے عرابی پاشا کی بغاوت کے ذکر کے ضمن میں مصریوں کو بزدلی سے متہم کیا ہے

اہل کرم ان سے رحم دل سے پیش آتے۔ انعام و اکرام کے لالچ کے باوجود ان کا پتہ نہ بتاتے۔ ان میں شیخ محمد الہمشری ساکن قصبہ العقوہ خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔ عبداللہ ندیم ان کے ہاں جا کر اترے تو اپنا تعارف کرایا۔ شیخ محمد الہمشری نے ان کی خوب خاطر و تواضع کی۔ اور تین سال تک ایک مکان میں جو آبادی سے قدرے دور تھا۔ ٹھہرائے رکھا۔ ان کی احسان کے ملازم کی شادی بھی کر دی۔ جب شیخ محمد الہمشری نے وفات پائی۔ تو عبداللہ ندیم کی بیوی نے شیخ صاحب کے لڑکے کو بلا کر کہا کہ وہ بھی باپ کے نقش قدم پر چل کر پڑوسیوں اور پناہ گزینوں سے ہمدردی اور احسان سے پیش آتا رہے۔ لڑکے نے وعدہ کیا کہ وہ اپنے باپ جیسا سلوک کرتا رہے گا۔ لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد کسی نے مخبری کر دی اور عبداللہ ندیم کو یہاں سے بھی نکلنا پڑا۔

اس آوارہ گردی میں ایک دفعہ ان کی مڈبھیڑ ایک جرکسی عہدہ دار سے ہو گئی جس نے ان کو فوراً پہچان لیا اور کہا میں آپ کو جانتا ہوں۔ بھیس بدلنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

اس سرکاری عہدیدار نے نہ صرف ان کی مالی خدمت کی بلکہ ایک ایسے راستے کا پتہ دیدیا جہاں ان پر کوئی ہاتھ نہ ڈال سکتا تھا۔

شروع شروع میں تو انہیں والدین اور بھائی کی یاد ستاتی رہی۔ یہ پتہ نہ تھا کہ ان پر کیا گذری ہے۔ اس سے زیادہ سکندریہ میں کتابوں اور مسودوں کا خیال دامن گیر رہتا۔ ان کا ایک فرانسیسی دوست تھا۔ اس کو تحقیق حال کے لئے گھر بھیجا۔ معلوم ہوا کہ ان کا سارا کنبہ بکھر چکا ہے۔ لوگوں نے ان سے آنکھیں پھیر لی ہیں۔ تمام افراد خاندان کے پیچھے خفیہ پولیس لگی ہوئی ہے۔ ان کا باپ ایک گاؤں میں مقیم ہے۔ ان کے گھر والوں نے اسکندریہ چھوڑتے وقت تمام کتابوں اور مسودوں کو تین صندوقوں میں بند کر کے گاڑی کے ایک ڈبہ میں رکھ دیا تھا۔ راستہ میں مسافروں کی بھیڑ ہوئی تو ریل والوں نے تینوں صندوق دوسرے اسباب سمیت دریائے نیل میں پھینک دیئے۔ اس طرح ان کا علمی اور فکری اثاثہ دریا برد ہو گیا۔

جب خفیہ پولیس کی کارستانیوں سے انہیں کچھ سکون ہوا۔ تو والدین اور بھائی کی عافیت انہیں باقاعدہ طور پر ملنے لگی۔

ان پر مشکلات و مصائب کی گھٹائیں آتیں لیکن جلد ہی چھٹ جاتیں۔ ایک دفعہ وہ مندرہ نامی گاؤں میں مقیم تھے۔ عید قربان کا دن آیا تو ان کے پاس کھانے پینے کے لئے کچھ بھی نہ تھا۔ ان کی وفا شعار بیوی تنہا ان کی مونس و ہمدم تھی۔ ان کا ملازم جو ان سے علیحدہ رہتا تھا۔ فقر و فاقہ کی شکایت کرنے لگا۔ ناگہاں چند اصحاب خیر نے کچھ اناج، شہد اور کپڑے بھیج دیئے۔ ان کی بیوی کے لئے علیحدہ ریشمی ملبوسات بھیجے۔ اس مسافری میں انہیں جو تھوڑا سا سکون خاطر ملتا تو وہ مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں لگ جاتے۔ حمل و نقل میں سہولت کی خاطر انہوں نے تھوڑی سی کتابیں بھی اپنے ساتھ رکھی ہوئی تھیں ان میں مفتی ابوالسعود کی تفسیر القرآن۔ فیروز آبادی کی قاموس۔ ابن شمیل کا مسئلہ شرقیہ الطائی اور ملطبرون کا جغرافیہ مترجمہ شیخ رفاعہ قابل ذکر ہیں۔ ان سے فائدہ اٹھا کر عبداللہ ندیم نے مذہب اور تاریخ پر چند کتابیں بھی تصنیف کیں۔ تصنیف و تالیف کی فرصت انہیں کم میسر آئی تھی ان ایام میں ایک دوست کو لکھتے ہیں"

میں بخیریت ہوں اور اچھے حال میں ہوں۔ دن ہوتا ہے تو مجھے رات کا غم نہیں ہوتا۔ مصائب اور تکالیف کی یاد سے میں اپنے ذہن کو پریشان نہیں کرنا چاہتا کیونکہ میرا اعتقاد ہے کہ مصائب و آلام جلد گذر جاتے ہیں اور حالت سدھر جاتی ہے۔ اس وقت قلم میرا مونس اور قلم میرا ہمدم

ہے۔ کبھی تو میں علم اصول میں عقائد اہل سنت پر لکھتا ہوں اور کبھی شعر و شاعری اور مختلف مضامین کی نگارش سے دل بہلاتا ہوں۔ کبھی تصوف و سلوک سیر الاخبار والملوک۔ عادات و اخلاق۔ تاریخ و جغرافیہ پر خامہ فرسائی کرتا ہوں۔ اور کبھی نعت بھی نظم کر لیتا ہوں۔ اس طرح چھوٹی اور بڑی بیس کتابیں مرتب ہو گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کو دیکھئے کہ اس نے مشکلات و مصائب کے دنوں کو اپنے فضل و کرم سے بدل دیا ہے۔ آپ کو تو معلوم ہو گا کہ پہلے میں کثیر الاولاد والدہ سے زیادہ مصروف رہتا تھا۔ دن کو سالوں کے لئے لکھا کرتا اور رات مصریوں کے حالات کے مطالعہ میں مصروف رہتا۔ انجمن خیریہ اور اس کے مدارس کی ذمہ داریاں الگ تھیں۔ ملنے والوں کا جمگھٹا لگا رہتا۔ اس مصروفیت نے مجھے اہل و عیال اور کھانے پینے سے بھلا رکھا تھا۔ میری حالت ایسی مشغولیت کی تھی۔ جبکہ سکون و قرار میسر نہیں ہوتا۔ ان حالات میں تصنیف و تالیف کی طرف دھیان بھی نہیں جا سکتا۔"

اس مسافری میں اپنے ملازم حسین پر بڑا احسان یہ کیا کہ اس کی شادی کرا دی۔ اس کو لکھنا پڑھنا سکھانے کے علاوہ قرآن پاک کا بہت سا حصہ زبانی یاد کرا دیا۔ فقہ اور توحید کی مبادیات سکھائیں اور اس کو اپنا مصاحب بنائے رکھا۔

مصیبت کے دن جو انہوں نے گذارے ایک بچے کو بوڑھا کر سکتے ہیں۔ بسا اوقات ان کی بیوی غضبناک ہو جاتی اور ان کے منہ پر طمانچہ دے مارتی۔ اس حال میں ان کے دل میں خیال گذرتا کہ حکومت کے سامنے پیش ہو جانا ہی اس مصیبت کے مقابلہ میں آسان رہے گا۔ لیکن وہ جلد ہی اپنی بیوی کو رضامند کر لیتے۔ کبھی وہ ملازم کی بیوی سے الجھ جاتی جس سے اندیشہ ہوتا کہ ان کا راز فاش ہو جائے گا۔ لیکن وہ کمال ہوشیاری سے اس قضیہ کو رفع دفع کر لیتے۔ خطرہ محسوس کرنے لئے احتیاطی تدابیر اور زیادہ اختیار کرتے۔ ایک دفعہ ایک تہ خانے میں نو ماہ رہے۔ اس مدت میں مٹی کے تیل کا دیا جلا کر لکھتے اور پڑھتے رہے۔ اس پر بھی وہ صابر اور شاکر تھے۔ بعض اہل سخا ان کی دستگیری اور غمخواری کرتے۔ محمد معبد ایک حجام تھا جس نے شباس الشہداء میں انکو چھپائے رکھا۔ اپنی مقدرت سے زیادہ ان کی خدمت کی۔ احمد جو وہ ایک کسان تھا۔ جو ان کی خاطر ہر خطرے میں کود نے کے لئے تیار رہتا۔ اس روپوشی نے ان کا اور دوسرے لوگوں کا برا حال کر رکھا تھا۔ لیکن وہ اپنی میٹھی میٹھی باتوں اور حکایتوں سے ان کا دل بہلائے رکھتے۔

وہ جمیزہ میں تھے کہ وہاں کے نمبردار نے انہیں پہچان لیا۔لیکن ان کا معاملہ پوشیدہ رکھا۔گاؤں میں....
حسن الفراجی ایک فوجی تھا۔جو جاسوسی پہ مامور تھا۔اس نے حکام بالا کو عبداللہ ندیم کی موجودگی کی اطلاع دیدی
پولیس کے ایک افیسر نے فوج کا دستہ لے کر گاؤں کا محاصرہ کر لیا عبداللہ ندیم نے پرانے حیلہ کو کام میں لاکر بھاگنا
چاہا لیکن بھاگ نہ سکے۔اور اپنے آپ کو فوج کے حوالہ کر دیا۔خوش قسمتی سے ان کے مسودات محفوظ رہے بعض
مسودات توفیق خدیو کی ہجو میں لکھے ہوئے تھے۔اگر وہ حکومت کے ہاتھ لگ جاتے تو ان کی زندگی کا رخ کچھ اور ہی
ہوتا۔وہ ذیقعد ۱۲۹۹ھ میں روپوش ہوئے تھے اور گرفتاری صفر ۱۳۰۹ھ میں عمل میں آئی تھی۔وہ پوچھ گچھ کے
لئے طنطا روانہ کر دئے گئے۔وہاں سرکاری وکیل قاسم بک امین تھے۔جنہوں نے اچھا برتاؤ کیا۔ان کے حکم
سے عبداللہ ندیم کو قید خانہ میں صاف ستھری جگہ میسر آئی۔روشنی کا بھی معقول انتظام تھا۔چائے اور سگریٹ
پینے کی بھی اجازت تھی۔قاسم بک امین نے ان کی مالی اعانت بھی کی۔تفتیش کے وقت سر فہرست یہ سوال تھا کہ
کس کس نے ان کو پناہ دی تھی۔وہ ان کو جانتے بھی تھے یا نہیں۔لیکن وہ جواب دیتے کہ جس کسی نے بھی ان کو
پناہ.......وہ ان کی حقیقت حال سے بے خبر تھا۔بالآخر خدیو نے معافی کا حکم صادر کر دیا اور کہہ دیا
کہ وہ مصر چھوڑ کر جہاں مرضی چاہے چلے جائیں۔عبداللہ ندیم نے یافا کا قصد کیا اور وہاں جا کر طرح اقامت
ڈال دی۔وہاں کے لوگوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ان کے گھر میں علماء اور ادباء کا جمگھٹا رہنے لگا۔
انہوں نے فلسطین کی سیر کی۔اس کے آثار کو دیکھے۔مزاروں کی زیارت کی اور مناظر طبعی سے دل کو شاد
کام کیا۔

توفیق پاشا کے مرنے کے بعد عباس الاوّل سریر آرائے سلطنت ہوا تو عبداللہ ندیم کو وطن واپس آنے
کی اجازت مل گئی۔وہ ۱۸۹۲ء میں مصر واپس چلے آئے۔وہ سوچ رہے تھے کہ اسکندریہ میں طرح اقامت ڈالی
جائے یا قاہرہ میں۔آخر کافی سوچ بچار کے بعد انہوں نے قاہرہ سے ایک رسالہ الاستاد نامی نکالنے کا فیصلہ کیا
جو ان کی کتاب جہاد کا نیا باب ہے۔

⑤

جب عباس خدیو بنے تو حالات بے حد نازک ہو چکے تھے۔ان کی عمر اٹھارہ برس کی تھی اور وہ وی آنا
میں تعلیم پا رہے تھے کہ ان کو وہاں سے بلا کر مصر کے تخت پہ بٹھا دیا گیا۔اسوقت مصر میں بغاوت کی آگ فرو

ہو چکی تھی اور انگریز ملک پر تسلط حاصل کر کے ہر شعبہ حکومت پر قبضہ جما چکے تھے۔ عباس بالکل نوجوان تھے۔ ان کو آزادی۔ حب الوطنی اور مستقل مزاجی سے کام کرنے کی تعلیم دی گئی تھی۔ وہ مصر کو دوبارہ بام عروج پر پہنچانا چاہتے تھے۔ ان کو اپنے دادا اسمٰعیل کے اسراف اور باپ رفیق کی فرمانبرداری سے نفرت تھی۔ وہ نوجوانوں کیطرح پر جوش تھے۔ نماز جمعہ مسجد الحسینی میں پڑھنے جاتے تو لوگ ان کا جوش و خروش سے استقبال کرتے۔ ان کی گاڑی سے گھوڑے کھول کر خود گاڑی کھینچتے۔ اب ان کے مشیر اور صلاح کار دوسرے آدمی تھے۔ اسوقت فرانس دوبارہ اثر و نفوذ جمانے کی فکر میں تھا۔ اس نے خدیو کی نظر التفات ڈھونڈنے کی کوشش کی۔

ترکی نے بھی نادم ہو کر یہی راستہ اختیار کیا تھا۔ اب تمام طاقتیں مطالبہ کر رہی تھیں۔ کہ ملکی حالات کی اصلاح کے بعد انگریزوں کو مصر چھوڑنے کا وعدہ پورا کرنا چاہیے۔ لیکن انگریزی حکومت پارلیمنٹ میں یہ بات اشارتاً کہہ چکی تھی کہ عباس کو چاہیے کہ انگریز دوستی میں وہ اپنے باپ کے نقش قدم پر چلے۔

خدیو عباس تمام ملک کا دورہ کرتے۔ عوام سے خود ملتے۔ اعیان قوم اور علماء سے بالمشافہ گفتگو کرتے مدارس کا معائنہ کرتے۔ عمال حکومت سے خود رابطہ رکھتے۔ تعلیم اور فوج کے متعلق رپورٹیں منگواتے لیکن لارڈ کرومر سے ان کے تعلقات کچھ اچھے نہ رہ سکے۔

اسوقت ملک میں مختلف فکر و نظر کی تحریکیں چل رہی تھیں۔ مختلف پارٹیاں قائم ہو رہی تھیں۔ اور مختلف خیالات کے حامل اخبار نکل رہے تھے۔ کوئی تو قومی تحریک کا مؤید تھا اور کوئی انگریزوں اور فرانسیسیوں کا ہوا خواہ تھا۔ استفادہ کی خاطر یا عقیدہ کے لحاظ سے اب اخبارات اور مجالس بھی اس ہنگامہ آرائی سے بچے ہوئے نہ تھے۔

اس دھندلی فضاء میں عبداللہ ندیم دوبارہ ظاہر ہوئے۔ خدیو مصر عباس نے انہیں مصر واپس آنے کی اجازت دے دی تھی۔ پہلے تو وہ ملکی معاملات کا مطالعہ کرتے رہے اس کے بعد اخبار نکالنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اخبار کے متعلق اعلان کیا تھا کہ وہ علمی تہذیبی اور فکاہی ہو گا اور ہر ہفتہ دوشنبہ کے دن نکلا کرے گا۔ پہلا شمارہ اوّل صفر ۱۳۱۰ھ ہجری بمطابق ۲۴ اگست ۱۸۹۲ء ظاہر ہوا۔ اخبار کی ادارت ان کے ذمہ تھی۔ ان کے بھائی انتظامی امور کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے۔ اس میں بصراحت مذکور تھا کہ اخبار کا ملکی سیاست سے تعلق نہ ہو گا۔ لیکن بحیثیت فن کے سیاست اس کے موضوع سے خارج نہ ہو گی۔

تبکیت و تنکیت میں پہلے تو وہ مصری قوم کے عیوب اجتماعیہ پر عامی زبان میں نقد و تبصرہ کیا کرتے تھے۔

اور سیاسی معاملات پر فصیح عربی زبان میں اظہار خیال کیا کرتے۔

ان کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملک میں شراب نوشی کی عادت زور پکڑ گئی تھی۔ بہت سے شراب خانے شہروں اور قصبوں میں کھل گئے تھے۔ چور راستوں سے مال بھجوا لیتے تھے۔ عورتیں آزاد منش ہو گئی تھیں اور بن ٹھن کر کھلے منہ بازاروں میں نکلا کرتی تھیں۔ بھنگ اور نشہ آور چیزوں کا شوق بڑھ گیا تھا۔ ان مجالس کی خوب گرم بازاری تھی۔ لذات و شہوات میں انہماک کو آزادی کا نام دے دیا گیا تھا۔ مغربی تقلید کے شوق میں مصری عام بول چال میں یورپی الفاظ بے تکلف استعمال کرتے تنگ یورپی ملبوسات پہنے جاتے۔ انھوں نے اس اخلاقی بے راہ روی پر زور شور سے تنقید کی اور مشرقی اخلاق باختگی کے لئے یورپ کو ذمہ دار گردانا۔ اسی طرح نظامِ تعلیم کو ہدفِ ملامت بنایا کہ ان سے حب الوطنی کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا اور لوگوں کو انجمن اسلامیہ کی تشکیل پر ابھارتے رہتے۔

انگریزی تسلط کے رعب سے لوگوں کے منہ پر مہر سکوت لگی ہوئی تھی ان میں دم مارنے کی مجال نہ تھی لوگ گھروں سے باہر نہ نکلتے تھے۔ قومی معاملات کے بارے میں درپردہ گفتگو کرتے۔ اب وہ بغیر قائد اور راہنما کے تھے۔ عبداللہ ندیم نے قوم کے سربرآوردہ لوگوں کو پکارا کہ وہ عزلت نشینی چھوڑ کر باہر نکلیں۔ عوام سے رابطہ قائم کریں۔ ماضی اور حال کے معاملات کی تشریح کر کے ان میں بصیرت پیدا کریں

الاستاذ کا پہلا شمارہ نکلا تو لوگ پہلے سے اس آواز پر لبیک کہنے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ ان کا کوئی راہنما نہ تھا جو ان کی صحیح راہنمائی کرتا۔ الاستاذ کی اشاعت سے ان کی دلی مراد پوری ہو گئی۔ اخبار چل نکلا۔ اس وقت تین ہزار کے قریب چھپتا تھا۔ مقبولیت کے پیشِ نظر پہلا شمارہ دوبارہ چھاپنا پڑا۔

پہلے تو انہیں فصیح عربی زبان میں اخبار نکالنے کا خیال دامن گیر تھا۔ لیکن لوگوں کے مطالبہ اور اصرار سے عامی زبان اختیار کی۔ کیونکہ اس کے مقالات گھروں۔ بازاروں۔ کارخانوں اور کھیتوں میں پڑھے جاتے تھے۔ اور عورتیں۔ مزدور۔ کسان یہ مقالات سن کر یکساں طور پر محظوظ ہوتے تھے۔

آہستہ آہستہ انہوں نے سیاسی موضوعات پر لکھنا شروع کیا۔ قومی تحریک اور خدیو عباس کی حمایت و اعانت کی دعوت دی۔ ۱۷ نومبر ۱۸۹۳ء کے شمارہ میں چھبیس صفحہ کا پرزور مضمون لکھا جس میں مشرق اور مغرب کے حالات اور اسباب کے وسائل کا تذکرہ تھا۔ مغرب کے مکروفریب اور مشرق کی غفلت پر ماتم تھا۔ مغرب نے اپنی اقوام کی ترقی کے لئے جو کوشش کی تھی اور مشرق میں جو کچھ کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ اسکا بصراحت ذکر تھا۔ آپ نے قوم کو خدیو کے گرد

جمع ہونے کی دعوت دی اور مقالہ ان الفاظ پر ختم کیا۔.......... پانی سر سے گذر چکا ہے۔ اگر ہم نے اصلاح احوال کر لی ایک دوسرے کی پشت پناہ بنے رہے اور مصریوں۔ شامیوں عربوں اور ترکوں میں الفت اور یگانگت پیدا ہو گئی تو ہم یورپ سے آنکھیں ملا سکتے ہیں۔ بصورت دیگر اگر نا اتفاقی۔ ناچاقی۔ تحاسد اور اغیار کی خوشامد ہمارا وطیرہ رہا تو اجنبی ہمیں ملک سے باہر نکال کر رہیں گے۔"

اس زمانہ میں ایک واقعہ ایسا رونما ہوا جس سے ان کی صدا میں شدت پیدا ہونے میں مدد ملی۔ خدیو عباس اور لارڈ کرومر کے تعلقات کشیدہ تھے۔ ۱۵ فروری ۱۸۹۳ء کو خدیو نے مصطفیٰ پاشا سے استعفیٰ لے لیا، اور حسین فخری پاشا کو تشکیل وزارت کی دعوت دیدی۔ اس پر لارڈ کرومر بگڑ گیا کہ اس کی صلاح مشورہ کے بغیر وزارت میں کیوں ادل بدل ہوا۔ خدیو کو شدید دھمکیاں دی گئیں۔ بالآخر لارڈ کرومر کے اشارے سے حسین فخری پاشا کو مستعفی ہونا پڑا اور ریاض پاشا وزیر اعظم بنائے گئے۔ اس خبر کا شائع ہونا تھا کہ خدیو کے پاس وفود آ کر ان کی تائید و حمایت کا یقین دلانے لگے۔ قومی تحریک کے حامی اخبارات میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ ان سیاسی حالات نے عبد اللہ ندیم کے قلم میں حرارت پیدا کر دی۔ وہ خدیو کی حمایت اور ان کے مخالفوں کی مخالفت میں بے دھڑک لکھنے لگے۔

اس کے ساتھ ساتھ وہ اجتماعی اصلاحات کے طلبگار تھے۔ وہ ازہری علماء کی عیب چینی کرتے کہ وہ دنیاوی معاملات سے الگ تھلگ ہو کر بیٹھ رہے ہیں۔ انہوں نے ازہر کی اصلاح کا پروگرام بھی بنایا تھا۔ مصر میں زراعت کی درماندگی پر بھی لکھتے رہے۔ وہ عربی زبان کی کس مپرسی پر ماتم کناں تھے۔ اس کی ترقی کے لئے ایک علمی انجمن قائم کرنے کی تحریک کی تھی۔ تصوف کی وجہ سے قوم میں جو خرافات اور توہمات راہ پا گئے تھے اس کے وہ شدید ترین ناقد تھے۔

اب انہوں نے دوسری صدا بھی بلند کی۔ ہندوستان اور مصر میں انگریزوں کی سیاست ان کی تنقید کا نشانہ بننے لگی۔ وہ استعمار کے حامیوں کی بری طرح خبر لیتے اور پادریوں اور عیسائیت کی اشاعت کی مخالفت پر لوگوں کو ابھارتے۔ وہ کہتے تھے کہ بعض سیاسی عوامل ان کی مدد کرتے ہیں اور در پردہ ان کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ اس پر مخالف اخباروں نے شورش کی کہ وہ مسلمانوں اور دوسرے مذاہب کے پیرووں کے درمیان دشمنی اور نا اتفاقی کا بیج بونا چاہتے ہیں اور ایک دوسرے انقلاب کے برپا کرنے کے درپے ہیں۔ انہوں نے انگریز حکام کو مداخلت کی دعوت بھی دی۔ بعض انگریزی اخبارات مثلاً ٹائمز اور ڈیلی نیوز نے بھی اس فتنہ کی آگ

کو ہوا دے رکھی تھی۔ ان کے خیال میں عبداللہ ندیم سخت مذہبی آدمی تھے۔ اور یورپ والوں کے جملہ اعمال کو برا سمجھتے تھے۔ المقطم انگریزی اخبارات کے حمایت میں پیش پیش تھا۔ المؤید۔ الاہرام اور وطن اور بعض فرانسیسی اخبارات عبداللہ ندیم کی طرف سے مدافعت کرتے تھے لیکن وہ اس شورش سے ذرا خائف نہ تھے۔ انہوں نے زمانہ ماضی میں بڑی صعوبتیں برداشت کی تھیں۔ آنے والے مصائب اس کے مقابلہ میں کچھ حقیقت نہ رکھتے تھے انہوں نے ایک قصیدہ بھی لکھا تھا جو ان کے افکار کی ترجمانی کرتا تھا۔

بالآخر لارڈ کرومر نے خدیو عباس سے مطالبہ کیا کہ عبداللہ ندیم کو ملک بدر کر دیا جائے۔ خدیو عباس کو حکم ماننے سے چارہ نہ تھا وہ کسی کی حمایت میں مدافعت نہ کر سکتے تھے۔ ۱۲ رجون ۱۸۹۳ء میں الاستاذ نے اپنے قارئین کو الوداع کہا۔ اخبار بند کرنے کی اصلی وجہ انہوں نے ظاہر نہیں کی بلکہ اپنی بیماری کا سبب بتلایا۔ الوداعی پیغام میں انہوں نے یہ لکھا ہے کہ بہادر لوگ مصائب برداشت کرنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ اور عقلمند تاریخ کے صفحات سے عظمت اور جلالت کو دیکھ کر شاد کام ہوا کرتا ہے اب میں اپنے بھائیوں سے رخصت ہوتا ہوں۔

اودعکم و اللہ یعلم اننی احب لقاءکم والخلو دالیکم

ترجمہ: میں تم سے جدا ہو رہا ہوں لیکن خدا شاہد ہے کہ میں تمہارے درمیان رہنا چاہتا ہوں

وما عن قلی کان الرحیل انما وداع لعلت فالسلام علیکم

ترجمہ: میں نے کسی دشمنی سے رخت سفر نہیں باندھا ہے۔ لیکن حالات ہی نے کچھ ایسی صورت اختیار کر لی ہے۔ بس سلام ہو سب پر۔

وہ الاستاذ میں "کان دیکون" کے صفحات بھی دیا کرتے تھے یہ ان کے دینی۔ لغوی۔ سیاسی۔ ادبی۔ تاریخی اور انسانی افکار کا خلاصہ تھا۔ جس میں حریت فکر۔ مذہبی اور جنسی رواداری کی جھلک تھی۔ مصری حوادث کے مشاہدات کا بھی تذکرہ تھا۔

ان کے ایک فرانسیسی دوست تھے جنہوں نے عرابی پاشا کی بغاوت سے قبل ترکی اور عربی سیکھی تھی۔ عبداللہ ندیم نے ان کے ہاں قیام بھی کیا تھا۔ "کان دیکون" ان دونوں کی گفتگو پر مشتمل ہے۔ اس میں یہودیت نصرانیت اور اسلام کی تاریخ بھی آگئی ہے۔ بعض سیاسی نظریات بھی ہیں۔ افسوس ہے کہ اخبار کے بند ہونے سے کتاب کی سیاسی اور مصری تاریخ اشاعت پذیر نہ ہو سکی لیکن جو حصہ چھپ گیا ہے۔ وہ ان کی عمق نظر۔

وسعت اطلاع ۔ مذہبی رواداری اور مصر اور مشرقیوں کے لئے بے پناہ محبت پر دال کرتا ہے ۔ اس کے بعد عبداللہ ندیم نے یافا کی راہ لی ۔ وہاں اس سے پیشتر بھی قیام کر چکے تھے ۔ حکومت مصر نے پچیس پونڈ ماہوار کی پنشن گذر اوقات کے لئے مقرر کر دی تھی ۔ شرط یہ تھی کہ وہ مصری سیاست کے بارے میں کچھ نہ لکھیں ۔ لیکن ابھی ان کو یافا آئے ہوئے چار ماہ بھی نہ گذرے تھے کہ چغل خوروں نے بارگاہ سلطانی میں یہ خبر پہنچائی کہ وہ سلطان پر نکتہ چینی کرتے ہیں اس پر ان کے اخراج کا حکم صادر ہو گیا ۔ اب وہ حیران تھے کہ کہاں جائیں نہ مصر ان کو لینے کے لئے تیار ہے نہ ترکی ۔ آخر کار وہ اسکندریہ آ گئے اور یہاں آ کر ان کی مشکل حل ہو گئی ۔

بہت سے ترک احرار ترکی چھوڑ کر یورپ اور مصر چلے آئے تھے ۔ یہ لوگ مختلف اخبارات نکالتے تھے ۔ جس میں دستور اور قومی اصلاح کا مطالبہ ہوتا ۔ سلطان کی بھی خبر لی جاتی تھی ۔ سلطان عبدالحمید کی سیاسی چال تھی کہ وہ بعض اوقات ان حریت پسندوں کو راضی کر کے آستانہ کے قیام کی ترغیب اور تشویق دیا کرتے تھے تاکہ یہ آزاد منش اصحاب ان کی آنکھوں کے سامنے رہیں ۔ اس کے لئے ان کو بیش قرار وظائف بھی دیتے اور کوئی کام بھی ان کے متعلق کر دیتے ۔ اس طرح آستانہ میں ارباب قلم و لسان کا بڑا گروہ جمع ہو گیا تھا ۔ ان میں سید جمال الدین افغانی اور دیگر ترک ارباب قلم بھی شامل تھے ۔ غازی مختار پاشا نے سلطان کو مشورہ دیا کہ وہ عبداللہ ندیم سے ایسا ہی فیاضانہ سلوک روا رکھے ۔ سلطان فوراً مان گئے اور عبداللہ ندیم آستانہ چلے آئے ۔ ایک سلطانی فرمان کی رو سے باب عالی کی سرکاری مطبوعات کے انسپکٹر کی حیثیت سے بمشاہرہ ۴۵ مجیدی پونڈ ان کا تقرر ہو گیا ۔ مصری وظیفہ اس سے الگ تھا ۔ یہ وظیفہ وہ اپنے اہل و عیال اور عزیز و اقارب پر خرچ کر سکتے تھے ۔ یہ قدر افزائی ان کی ادبی خدمات کے صلہ میں تھی کیونکہ وہ اہل قلم تھے اور پس انداز کرنا نہیں جانتے تھے ۔

وہ آستانہ کیا آئے سید جمال الدین افغانی کی طرح سنہری جال میں پھنس گئے ۔ فرق صرف اتنا تھا کہ سید جمال الدین کا پنجرہ سونے کا تھا مگر تنگ تھا اور ان کا لوہے کا تھا مگر کشادہ ۔ دونوں میں حسب و نسب اور عزت و جاہ کے لحاظ سے بھی تفاوت تھا ۔ سید جمال الدین کو رہنے کے لئے عالیشان مکان ملا تھا سواری کے لئے گاڑی تھی ۔ نوکر چاکر خدمت کے لئے موجود تھے ۔ ہر ماہ ۷۵ لیرہ کا وظیفہ ملتا تھا ۔ انہیں شیخ الاسلام کا منصب بھی پیش کیا گیا تھا ۔ لیکن انہوں نے معذرت کر دی ۔ سید جمال الدین حسب و نسب اور طبیعت کے لحاظ سے اپنے آپ کو شاہوں اور سلطانوں کا ہمسر خیال کرتے تھے ۔ اگرچہ وہ امارت اور سلطنت سے محروم تھے ۔ عبداللہ ندیم عوامی آدمی تھے اور عوام کے خادم تھے ۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ذکاوت اور فصاحت

بیان کی نعمت سے سرفراز کیا تھا۔ سید جمال الدین جب دعوت اصلاح لیکر اٹھے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی بلندی پر کھڑے ہو کر ہیبت اور جلال سے وعظ کر رہے ہیں۔ برخلاف اس کے عبداللہ ندیم عوام کے اندر کھڑے وعظ و ارشاد کرتے تھے۔ خود ہنستے تھے اور لوگوں کو ہنساتے تھے۔ سید جمال الدین کی تقریر لوگ خوف اور خشیت سے سنتے۔ وہ وعظ و نصیحت کرتے تو معلوم ہوتا کہ لوگوں کو کوڑے مار رہے ہیں۔ عبداللہ ندیم کو عوام میں بے پناہ مقبولیت حاصل تھی۔ لوگ ہنسی خوشی ان کی باتیں سنتے۔ لہذا جب عبداللہ ندیم نے مصر چھوڑا تو لوگوں کو سید جمال الدین سے زیادہ ان کا فراق شاق گزرا۔ کیونکہ سید جمال الدین کی حکمرانی خواص کے دلوں پر تھی اور عبداللہ ندیم کی عوام پر۔

کس قدر عجیب بات ہے کہ انہوں نے ناظر مطبوعات ہونا منظور کر لیا۔ حالانکہ وہ ساری عمر ناظر مطبوعات سے نالاں رہے تھے۔ پہلے تو انہیں اخبارات پر کسی کی نگرانی منظور نہ تھی، اب خود نگران بن گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسمی عہدہ تھا جو ان کی مدد معاش کے لئے پیدا کر لیا گیا تھا۔

اب آستانہ میں ان کی فطری استعداد ضائع ہو رہی تھی۔ انکی نہ تقریر سے سرنہ کارتھا نہ تحریر سے وہ لوگوں کو اشتعال دلا سکتے تھے نہ شورش برپا کر سکتے تھے۔ فضا اور ماحول بھی گھٹا گھٹا سا تھا۔ وہ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے سید جمال الدین کے ہاں چلے جاتے اور دونوں مل کر دل کی بھڑاس نکال لیتے۔

لیکن عبداللہ ندیم کب تک زبان روک سکتے تھے۔ ناگہاں وہ ابوالھدیٰ الصیادی سے لڑ پڑے اس سے سید جمال الدین کی بھی ان بن رہ چکی تھی۔ سید جمال الدین شخصی جھگڑوں میں بھی زبان کی شائستگی برقرار رکھتے تھے۔ لیکن عبداللہ ندیم مخالف کی خوب خبر لیتے تھے اور اسے لوہے کے چنے چبوا کر ہی چھوڑتے تھے۔ ابوالھدیٰ کی شخصیت بھی عجائب روزگار تھی۔ جب سلطان عبدالحمید کے عہد کی تاریخ لکھی جائے گی تو بہت سے صفحات اس کے کارناموں کی نذر کرنے پڑیں گے۔ اس کا ہاتھ پس پردہ کام کرتا۔ لیکن اس کے نام کی شہرت تمام ممالک عثمانیہ۔ مصر۔ شام۔ عراق۔ تونس اور الجزائر میں تھی۔ تمام والی حل مشکلات میں اس کی طرف رجوع کرتے۔ قضا و قدر نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ ہر چیز پر حاوی ہے۔ وہ حلب کا رہنے والا شامی تھا۔ حسب و نسب اور مال و جاہ کے لحاظ سے ناقابل لحاظ تھا۔ تقدیر نے اسے آستانہ میں لا ڈالا تھا۔ بڑا ہوشیار، سمجھدار اور خوبصورت تھا۔ عزم کا دھنی تھا۔ نفسیات کا ماہر تھا۔ خوابوں کی تعبیر، سلوک اور تصوف کی رمز شناسی سے سلطان عبدالحمید پر حاوی ہو گیا تھا۔ اپنے آپ کو قرشی ہاشمی علوی بتلاتا رفاعی

سلسلہ میں بیعت تھا اور اس کے بہت سے مرید تھے۔ ہاتھ کا کھلا تھا۔ کثرت آمدن کے باوجود ہمیشہ مقروض رہتا کیونکہ اس نے معلوم کر لیا تھا کہ مالی عزت سے جاہ و سلطنت زیادہ وقیع ہوتی ہے۔ ابوالھدیٰ نے ہر جگہ اپنے جاسوس لگا رکھے تھے۔ اس کا اثر و نفوذ دین۔ تصوف اور حاکموں تک محدود نہ تھا بلکہ تمام سیاسی۔ انتظامی۔ فوجی معاملات بھی اس کے تصرف میں تھے۔ اس کے خوابوں کی انتہا نہ تھی۔ اس طرح اس کی پکڑ بھی بے حد سخت تھی۔ اس کو مستشار الملک۔ حامی العثمانیین اور سید العرب کا خطاب ملا تھا۔ بہت سے علماء۔ ادباء اور امراء اپنے ساتھ ملا رکھے تھے۔ علمی شہرت حاصل کرنے کے لئے کتابیں لکھاتا۔ قصیدے نظم کراتا۔ اور اپنے اخلاق و فضائل اور سخاوت کے من گھڑت قصے لکھاتا تھا

وہ تمام دنیا کو اپنی شخصیت کے سامنے مسخر اور مطیع سمجھتا۔ اس کے لئے حق و باطل کی اسے پرواہ نہ تھی وہ ہر اصلاح کا دشمن اور ہر حریت پسند کا جان لیوا تھا۔ اس کی کرم فرمائی سے بے شمار لوگوں نے جیل خانہ کی سیر کی۔ بہت سے سمندر میں غرق کئے گئے اور بہتوں کو فقر و فاقہ اور مسافری کے مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ بڑے بڑے امیر اس کی خوشامد کرتے اور علماء اس سے ڈرتے تھے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ احکام سلطانی منسوخ ہو گئے اور ان کی بجائے اس کی مرضی کے نئے احکام جاری ہوئے۔ سلطان عبدالحمید اس کی ناز برداری میں لگے رہتے۔ روٹھ جاتا۔ تو کوشش سے مناتے۔ جو کچھ مانگتا بلا دریغ دے ڈالتے۔

عبداللہ ندیم بھلا ابوالھدیٰ کو کب ماننے والے تھے آخر کسی وجہ سے اس سے الجھ پڑے۔ اس کو طعن طعن کیا اور ایک کتاب المسامیر لکھ کر اس کی خوب خبر لی یہ کتاب ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی۔ حق بات یہ ہے کہ کتاب نہ ابوالھدیٰ الصیادی کو زیب دیتی ہے نہ عبداللہ ندیم ہی کو کیونکہ اس کا اسلوب بیان۔ بجائیہ اور تہذیب و متانت سے گرا ہوا ہے۔

اس کتاب کی تالیف کی خبر ابوالھدیٰ کو ملی تو اس نے یہ بات سلطان عبدالحمید کے گوش گذار کی کہ عبداللہ ندیم نے ایک کتاب ذات شاہانہ کی ہجو میں لکھی ہے۔ اس پر ان کے مکان کی تلاشی ہوئی۔ لیکن مسودہ برآمد نہ ہوا۔ اصل میں کتاب کا مسودہ جارج کرچی لے اڑا تھا جو عبداللہ ندیم اور سید جمال الدین کا دوست تھا وہ چھپا کر یہ کتاب مصر لے آیا اور بعد میں اس کو چھاپ کر شائع کر دیا۔

عبداللہ ندیم کو آستانہ آئے ہوئے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ سل کی بیماری نے انھیں آ لیا۔ بعد ازاں اس بیماری نے مہلک صورت اختیار کر لی اور آخر کار دس اکتوبر ۱۸۹۶ء کو آپ نے اس جہان فانی سے سفر آخرت

اختیار کیا۔ ان کے جنازہ میں بڑا اژدہام تھا۔ سید جمال الدین بھی جنازہ کے ہمراہ تھے۔ وہ بھی ایک ماہ بعد اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ عبداللہ ندیم یحییٰ آفندی کے قبرستان باشکطاش میں دفن کئے گئے۔

انہوں نے صرف چھپن سال کی عمر پائی تھی۔ اگرچہ یہ عمر زیادہ لمبی نہیں ہے لیکن کارناموں کے لحاظ سے وسعت آمیز ہے۔ انہوں نے اپنے قلم سے لوگوں کو فکری غذا بہم پہنچائی۔ اپنے افکار سے انہیں مضطرب کیا کبھی انہیں ہنسایا تو کبھی رلایا۔ پولیس کو حیران و پریشان کئے رکھا۔ سیاسی بزرگوں کے لئے دردِ سر بنے رہے ارباب صحافت سے معرکہ آرا رہے۔ جہاں کہیں گئے نہ اپنے قلم کو آرام دیا نہ زبان کو آسائش دی۔ تا آنکہ موت کے ہاتھ نے ان کے لبوں پر مہر سکوت لگا دی۔

ان کی کوتاہیوں کے باوجود ان کی خدمات کی فہرست بے حد طویل ہے۔ انہوں نے اپنے اخبارات التبکیت والتنکیت اور الاستاذ کے صفحات اجتماعی اصلاح کے لئے وقف کر رکھے تھے۔ تعلیم، زراعت، زبان، صناعت اخلاق وغیرہ کے لئے ان اخبارات کے صفحات ہمیشہ کھلے رہے۔ بعد میں آنے والے مصلحین ان کے نقش قدم پر چلتے رہے۔

ان کے زمانہ میں المقطم، الاہرام، المؤید اور النیل مشہور اخبار تھے۔ ان کے تین گروہ تھے ایک تو انگریزی اقتدار کا حامی تھا۔ دوسرا وطن پرور اور فرانس کی طرف مائل تھا۔ تیسرا قوم پرست اور اسلامیت کا علمبردار تھا اور ملک کا رشتہ دولت عثمانیہ سے جوڑنا چاہتا تھا۔ ہر ایک سکون اور سلامتی سے اپنے جادۂ فکر پر گامزن تھا۔ جب الاستاذ صحافت کے افق سے طلوع ہوا تو اس نے صدا دی کہ مصر مصریوں کا ہے نہ کہ ترکوں اور یورپینوں کا۔ اس نے خدیو مصر کے گرد قوم کو جمع ہونے کی دعوت دی۔ انگریزی تسلط سے جن لوگوں پر خوف و دہشت طاری ہو چکا تھا ان کو باہر نکلنے، عوام سے رابطہ پیدا کرنے اور قوم کو بیدار کرنے کے لئے کہا۔

انہوں نے مختلف سیاسی پارٹیاں قائم کرنے کی دعوت دی۔ ہر ایک کو اسکے دستور العمل کے مطابق کام کرنے اور اخبار نکالنے کا مشورہ دیا۔ وہ اپنے معاصرین کے خلاف بلند آہنگ اور آتش بدہن تھے۔ اس سے اخبارات میں ردّ و قدح کا سلسلہ چل نکلتا تھا۔ لیکن اس جدل و مناظرہ سے یہ فائدہ ہوا کہ لوگوں میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی۔ ان میں نفع و نقصان کا شعور پیدا ہوا۔ ہم صواب اور ناصواب کی بحث میں پڑے بغیر یہ کہہ سکتے ہیں کہ عبداللہ ندیم کے احسانات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مصطفیٰ کامل اگرچہ من حیث الاسلوب اور ثقافت ان سے بہت کچھ مختلف تھے۔ لیکن انہوں نے الاستاذ سے بہت کچھ حاصل کیا تھا۔

ذکاوت اور حسن بیان ان کی عظمت کے ستون ہیں ان کے متعلق مرحوم احمد پاشا تیمور نے لکھا تھا۔
"کہ وہ شیریں بیان تھے۔ ان کی گفتگو ظرافت آمیز ہوتی۔ سننے والا چاہتا کہ وہ اختصار بیانی کی بجائے طوالت گفتگو سے اس کے کانوں کو شاد کام کرتے رہیں۔ میں ان کی مصری اقامت کے آخری زمانہ میں ان سے ملا تھا۔ وہ ذکاوت میں ایاس۔ فصاحت زبان میں سحبان اور بدصورتی میں جاحظ تھے۔ ان کا شعر ان کی نثر سے کم درجہ ہے اور ان کی نثر خطابت سے گھٹیا ہے۔ ہمارے زمانہ میں ان کی جادو بیانی منتہائے مقصود متصور ہوتی تھی۔
سید جمال الدین افغانی بھی مناظرہ میں عبداللہ ندیم کی حجت بازی۔ بداہیہ گوئی قوت بیان اور فصاحت دلیل اور تقریر و تحریر میں مناسب الفاظ کے استعمال پر اظہار حیرت کیا کرتے تھے۔
عبداللہ ندیم بے خوف اور نڈر تھے۔ بڑے بڑے لوگوں سے معرکہ آرائی میں انہیں مزا ملتا۔ عوام سے خوش ہو کرتے اور بولتے۔ ان سے تواضع سے پیش آتے۔ کسی کی مخالفت کرتے تو اسکو خوب مزا چکھاتے۔ چاہے وہ خدیو مصر ہو۔ انگریز حاکم ہو یا ابوالھدیٰ الصیادی ہو۔ ان کی جاہ و حشمت کے سامنے متکبروں کی گردنیں جھک جاتی تھیں۔ ان کے مقابل عبداللہ ندیم فقر بے نوا تھے جو ملتا تھا۔ خرچ کر ڈالتے تھے۔ وہ اپنے پالنے والے پر آسرا لگائے ہوئے تھے کہ وہ جسطرح ہر پرندکو رزق دیتا ہے انہیں بھی ضرور دے گا۔ جسم کے کمزور تھے۔ عوارض و امراض میں مبتلا رہتے تھے۔

ان کے سب بچے عالم طفولیت ہی میں مر گئے تھے لیکن وہ رواں دواں کام میں لگے رہتے اس سے نہ تھکتے تھے نہ اکتاتے تھے ان کی صلبی اولاد کی موت سے ان کی یادگار مٹ چکی ہے لیکن ان کے کارنامے زندہ جاوید ہیں۔

کثرت اطلاع اور وسعت تجربہ نے ان کو عظمت عطا کی تھی۔ ایک جگہ اپنے متعلق لکھتے ہیں "میں نے شہر کے بڑے بڑے لوگوں کی صحبت پائی ہے۔ کاریگروں۔ کسانوں اور مزدوروں سے گھل مل کر رہا ہوں۔ ان کی جہالت تکالیف اور آرزؤں سے شناسا ہوں۔ فرنگی ہاکموں کے ساتھ مل کر بیٹھا ہوں۔ ان کی روشن خیالی سے آزردہ بھی ہوا ہوں۔ مغرب کے لوگوں سے بھی واقف ہوں۔ ان کے مشرق سے متعلق افکار اور ان کے اغراض و مقاصد سے بھی خوب آگاہ

ہوں ۔ بڑے بڑے تاجروں سے ملا ہوں ۔ ان کے طور طریق جانتا ہوں ۔ مختلف جنسوں ۔ وطنوں اور مذہبوں کے پیروکاروں سے نشست و برخاست رکھتا رہا ہوں ۔ مذاہب ۔ حکمت ۔ تاریخ اور ادب کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے ۔ اسکے علاوہ ایک عرصہ تک اخبار بینی بھی کرتا رہا ہوں ۔ ۔ حکومت کے مختلف عہدوں پر بھی کام کر چکا ہوں ۔ تجارت کے علاوہ زمینداری بھی کی ہے ۔ درس و تدریس کا مشغلہ بھی اختیار کر چکا ہوں ۔ خطابت اور صحافت سے بھی کام لے چکا ہوں ۔ ان تمام مصائب کو اپنے مقصد کے وسیلہ کے طور پر اختیار کیا تھا جس سے میں جوانی میں بوڑھا ہو چکا ہوں ۔ شکل و صورت سے میں ستر سال کا بوڑھا معلوم ہوتا ہوں ۔ حالانکہ میری عمر صرف ۳۹ سال کی ہے ۔"

ان میں بڑی بات یہ تھی کہ وہ اپنے خیالات پر مضبوطی سے قائم رہتے تھے ۔ جس بات میں قوم کی بھلائی دیکھتے اس کے لئے جان جوکھوں میں ڈال دیتے ۔ عرابی پاشا کی بغاوت میں حصہ لینے والے افراد اپنے قول و فعل سے انحراف اختیار کر چکے تھے ۔ وہ اپنے کئے پر پشیمان تھے لیکن اس سے ان لوگوں کو کوئی فائدہ نہ پہنچا ان کو سزا مل گئی ۔ لیکن عبداللہ ندیم کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی ۔ انہوں نے روپوشی میں سخت تکالیف اٹھائیں ۔ لیکن اپنی دھن میں لگے رہے ۔

ان کو ملک بدر کیا گیا ۔ آخر میں معافی بھی مل گئی لیکن وہ کام میں لگے رہے ۔ انہیں نہ کسی دھمکی کا ڈر تھا نہ کسی طمع کی خواہش ۔ یہاں تک کہ وہ اپنے پالنے والے سے جا ملے ۔ رحمہ اللہ ۔

○

سید عبد الرحمٰن الکواکبی

۱۲۶۵ - - ۱۳۲۰ھ

۱۸۴۸ - - ۱۹۰۲ء

سید عبد الرحمٰن الکواکبی حلب کے ایک مشہور، معزز، امیر اور علمی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے گھر والے حلب کے نقیب الاشراف تھے ان کا اپنا مدرسہ تھا جسکو المدرسۃ الکواکبیہ کہتے تھے۔ جامع اموی میں تھا۔ اس میں ان کے والد درس و تدریس کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ ان کا گھرانا معزز، باوقار اور غیور تھا۔ یہی فضائل ان کی تعلیم و تربیت میں ممد و معاون ثابت ہوئے۔ ان کی والدہ کی وفات کے بعد ان کی خالہ نے ان کی پرورش کی ۔ وہ مشرق کی نادر روزگار عورتوں میں سے تھی۔ ادب اور سوجھ بوجھ کی وجہ سے شہرت رکھتی تھی۔ اس میں سچائی اور بھلائی اور صالح تربیت کا جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا۔

سید عبد الرحمٰن پر کوئی بھی ناقد اخلاق حرف گیری کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ گفتگو کے لحاظ سے وہ بے حد مؤدب تھے۔ یاوہ گوئی سے انہیں نفرت تھی۔ منہ سے بات نکالنے سے پہلے خوب سوچ لیتے۔ اگر کوئی سلام بھی کرتا تو سوچ کر جواب دیتے۔ کوئی بات کاٹتا تو چپ رہتے۔ یہاں تک کہ دوسرا گفتگو ختم کر لیتا پھر وہ رشتۂ کلام جوڑتے۔ اس سے وہ دوسرے کو تہذیب کلام سکھاتے۔ پاکباز تھے نہ لالچ انہیں دھوکہ دے سکتا تھا اور نہ جاہ و منصب انہیں غرور دلا سکتا تھا۔ قول و عمل میں بے باق تھے۔ اس جرأت و بے باکی کی وجہ سے انہیں قید خانہ کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ مالی نقصان بھی اٹھایا تھا اور دیس نکالا بھی ملا تھا۔ وہ امراء سے برابری سے پیش آتے تھے لیکن کمزوروں، مفلوک الحالوں کے سامنے سراپا تواضع بن جاتے۔ ان کی دست گیری کرتے۔ ان کا ہم جلیس انہیں باوقار سوچ بچار کرنے والا حق کا حامی اور راہ فضیلت کا جان سپار سمجھتا۔ انہوں نے دستور زمانہ کے مطابق دینی تعلیم پائی تھی۔ عربی ادب اور دینی مبادیات کی تعلیم اپنے خاندانی مدرسہ میں حاصل کی تھی۔ یہ مدرسہ ازہر کے نصاب تعلیم پر کاربند تھا۔ عبد الرحمٰن الکواکبی نے علوم ریاضیہ اور طبعیہ میں مطالعہ سے درک بہم پہنچا لیا تھا۔ ان کے والد نے ترکی اور فارسی کی بھی تعلیم دلائی تھی۔ انہوں نے خود بہت سی تاریخی کتابوں اور دولت عثمانیہ کے قوانین کا مطالعہ کیا تھا۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد جب عملی زندگی اختیار کی تو انہیں مختلف حیثیتوں اور متعدد جگہوں پر کام کرنے کا اتفاق ہوا۔ پہلے وہ سرکاری اخبار میں کام کرتے رہے۔ پھر محکمہ شرعیہ میں میر منشی بن گئے۔ ازاں بعد میونسپل پریذیڈنٹ کے مددگار رہے۔ پھر سرکاری ملازمت کو چھوڑ کر الشہباء نام کا ایک اخبار حلب سے نکالنے لگے۔ کاروبار بھی کرتے تھے۔ اس سے حیات انسانی کے مختلف گوشوں سے انہیں واقفیت بہم پہنچانے کا موقع ملا تھا۔ سرکاری ملازمت کے دوران ان کی خودسر حکام سے ان بن رہتی تھی۔ کبھی یہ جیت جاتے تو کبھی مستبد حکام غالب آجاتے۔ ان کو پایۂ [illegible] عدل و انصاف اور ثابت قدمی پر بھروسہ تھا۔ حکام وسیلہ کاری۔ تہمت تراشی اور ضابطہ وقانون کے انحراف سے کام لیتے تھے۔ ظالموں کی جسطرح عادت ہوتی ہے۔ ان کو شور و شغب ڈالنے کا ملزم گردانا جاتا۔ یہ سلطان عبدالحمید کا زمانہ تھا۔ نظام حکومت ا[illegible] انتہا تک پہنچ چکی تھی۔ کوئی آزاد منش انسان جی سکتا تھا نہ کوئی پاکباز تاجر کامیاب ہو سکتا تھا۔ اور نہ بے باک سرکاری ملازم سربرزہ رہ سکتا تھا۔ یہ نظام حکومت ہر ترقی۔ تولید اور ابتکار کا دشمن تھا۔

شہر میں انہیں اعزاز حاصل تھا۔ ضرورت منداصحاب ان کے پاس آتے۔ حل مشکلات کے لئے ان کی مدد کے خواہاں ہوتے۔ سرکاری ملازم پیچیدہ معاملات میں ان سے مشورہ کرتے۔ ان معاملات میں وہ بے باکی سے گفتگو کرتے۔ ظالم کے ظلم کو طشت از بام کرتے۔ کبھی جابر کے منصب وجاہ سے نہ دبتے۔ اس وجہ سے انہوں نے عارف پاشا والی حلب کی مخالفت مول لے لی ۔ وہ عارف پاشا کی بداعمالیوں کے خلاف لوگوں کو ابھارتے اور دارالخلافت میں ان کے خلاف آواز پہنچانے کی کوشش کرتے۔ عارف پاشا نے اسکا انتقام اس طرح لیا۔ کہ بعض جعلی کاغذات ان کی طرف منسوب کر دیئے اور الزام دیا۔ کہ وہ حلب کو کسی اجنبی طاقت کے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔ اس الزام میں وہ قید کئے گئے اور ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ کواکبی اور ان کے ساتھیوں نے ازحد کوشش کی کہ ان کے مقدمہ کی سماعت کسی دوسرے شہر میں ہو۔ مدتوں بیروت میں عدالت کا اجلاس ہوتا رہا جہاں وہ باعزت طور پر بری کر دیئے گئے۔ اس جھوٹے مقدمہ سے والی کی خیانت ظاہر ہوتی تھی۔ اسکی پاداش میں عارف پاشا معزول کر دیئے گئے۔

ان کا دشمن ابوالہدیٰ الصیادی بھی تھا جس کا ذکر عبداللہ ندیم کے ترجمہ کے ضمن میں آچکا ہے کواکبی ابوالہدیٰ کے حسب ونسب کی صحت کے منکر تھے۔ کیونکہ وہ حلب کی نقابۃ الاشراف خود ہتھیانا چاہتا تھا۔ ....

...... اور حاکموں کو ان کے خلاف ابھارتا رہتا۔

الضیاء) کی اس مخالفت سے وہ مقدمہ میں ماخوذ ہوئے اور کاروبار میں لاکھوں کا خسارہ اٹھایا جسے انہوں نے نہایت صبر و حوصلہ سے برداشت کیا۔

ان کی تاریخ حیات کا سنہری باب مسلمانوں کی بدحالی سے آگاہ ہونا ہے۔ انہوں نے زندگی کا بڑا حصہ تمام مسلمانانِ عالم کے حالات کی معرفت بہم پہنچانے میں خرچ کر ڈالا۔ ان کے امراض کی تشخیص کی اور علاج کا طریقہ ڈھونڈ نکالا۔ ان کے ماضی اور حال کی تاریخ کھنگال ڈالی۔ نئے مصنفوں نے کتابوں اور اخبارات میں جو کچھ لکھا تھا وہ سب پڑھ ڈالا۔ مملکت عثمانیہ میں مسلمانوں کی حالت کا معائنہ کیا اس کے بعد بہت سے اسلامی ممالک کا سفر کیا۔ مشرقی افریقہ اور مغربی ایشیا کے سواحل پر گھومے پھرے۔ بلاد عرب میں داخل ہو کر قبائل کے رؤسا سے ملاقاتیں کیں۔ ہندوستان آکر وہاں کے حالات کا مشاہدہ کیا۔ جہاں جاتے وہاں کی اجتماعی، اقتصادی، زراعتی، زمینی اور معدنی حالت کا مطالعہ کرتے۔ پھر آکر بھی قیام کیا تھا۔ وہ بلاد مغرب کی بھی سیاحت کرنا چاہتے تھے لیکن موت نے مہلت نہ دی۔

وہ درس و مطالعہ کے نتائج کو اخبارات و رسائل میں شائع کرتے رہتے پھر آپنے مقالات کو دو کتابوں میں جمع کر کے شائع کیا۔ ایک کا نام طبائع الاستبداد ہے اور دوسری کا ام القریٰ۔ پہلی کتاب میں حکومات اسلامیہ پر نقد و تبصرہ ہے اور دوسری میں مسلمان اقوام پر۔ کواکبی نے طبائع الاستبداد اور ام القریٰ میں جن موضوعات پر لکھا ہے وہ اس وقت شجر ممنوعہ تھے کیونکہ اس سے نظام حکومت پر قریب سے زد پڑتی تھی۔ عوام اپنے حقوق و واجبات سے آگاہ ہوتے تھے۔ وہ ظلم و عدل کے مفہوم سے آشنا ہوتے تھے۔ حقوق سے محرومی پر ان کا مطالبہ کر سکتے تھے۔ یہ سب باتیں جابر حاکم کے لئے مبغوض تھیں۔ ہم مشاہدہ کر چکے ہیں کہ ابن خلدون کے بعد بحث و تمحیص کا دروازہ بند رہا اور اس کا مقدمہ بلا نتیجہ رہ گیا۔ سارا زور علم نحو، صرف، ادب اور فقہ کے پڑھنے پڑھانے پر رہا کیونکہ ان علوم کی تدریس سے عوام کو حکومت اور حاکم کا کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ علم ادب کیا تھا۔ حکام اور ملوک کی مدح طرازی تھی ان کے ظلم کو عدل اور بگاڑ کو اصلاح کا نام دیا جاتا۔ اگر رعایا سے چھین جھپٹ کر ادیبوں کو دیا جاتا تو وہ خوشی کے نعرے لگاتے سلطان کی حاتمانہ کرم نوازی اور بے نظیر سخاوت کے مدح خواں رہتے۔ مورخین کا کام بادشاہوں کی سیرت نگاری انکی خانہ جنگی، بیگمات اور اولاد و احفاد کا ذکر اذکار رہ گیا تھا۔ عوام کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ وہ حکام کی خدمت کے لئے پیدا ہوتے تھے۔ ظالم حکام کو وہی علم پسند تھا جو ان کے قاعدہ اور قانون سے متصادم نہ ہو وہی علماء مقرب بارگاہ ہوتے

جو لوگوں کو قضا و قدر کے سامنے سر تسلیم کرنے کے لئے وعظ و نصیحت کرتے رہتے۔ اور السلطان ظل اللہ فی الارض (بادشاہ زمین پر اللہ تعالیٰ کا سایہ ہے) جیسے الفاظ گھڑتے رہتے۔ لوگوں کا ابن خلدون کے بعد علم الاجتماع۔ علم السیاست اور اقتصاد سے کوئی واسطہ نہیں رہا تھا۔

یہ تو تھا مشرق کا حال۔ مغرب میں علم الاجتماع پر تحقیقات ہو رہی تھی جماعتوں کے علل اور ان کے امراض۔ حکومت کی اقسام اور ان کی خصوصیات اور عیوب کا پتہ چلایا جا رہا تھا۔ وہ ہر قسم کی فکری قید سے آزاد ہو رہے تھے۔ ترقی کے میدان میں ان کا ہر قدم آگے بڑھتا تھا۔ مشرق میں سلطان عبدالحمید کے عہد میں فکری گھٹن انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ قاعدہ ہے کہ زیادہ دباؤ ڈالنے سے چیز پھٹ جاتی ہے۔ سختی اور ظلم حیلہ گری اور بغض کو جنم دیتے ہیں۔ اس زمانہ میں بہت سی خفیہ انجمنیں ممالک عثمانیہ کی آزادی کے لئے سرگرم عمل تھیں اور جمہوری طرز حکومت کے قیام کے لئے کوشاں تھیں۔ بہت سے ترک احرار یورپ آ رہے تھے جو وہاں کے دستور حکومت اور اجتماعی حالات کا مطالعہ کرتے اور اخبارات و رسائل میں جو ممالک عثمانیہ کی حدود سے باہر نکلتے تھے اپنے نتائج فکر شائع کرتے تھے۔ یہ خیالات اندرون ملک بھی راہ پا لیتے تھے۔ مصر بہت سے احرار کی پناہ گاہ بنا ہوا تھا۔ عربی میں بہت سے مقالات احوال جماعت کی تشریح اور اصول حکومت کے بارے میں اخبارات و رسائل میں نکلتے تھے مونٹیسکو کے اصول النوامیس والشرائع کا عربی میں ترجمہ بھی ہو اتھا۔ اجتماعیات پر مباحثات تراجم کے ذریعہ عام ہو رہے تھے۔

اس اثنا میں کواکبی کا ظہور ہوا۔ انہوں نے اپنی دونوں کتابوں میں جرأت مندانہ خیالات ظاہر کئے۔ کواکبی صرف عربی۔ ترکی اور فارسی زبانیں جانتے تھے۔ انہوں نے عربی تراجم سے کافی استفادہ کیا۔ اس کا اثر طبائع الاستبداد اور ام القریٰ میں نمایاں ہے۔ کتابوں کے مباحث ان کی وسعت عقل۔ قوت فکر۔ حیرت انگیز اطلاع اور عالم اسلامی پر سچی غیرت کے شاہد ہیں۔

طبائع الاستبداد کے مقالات بعض مصری اخباروں میں ۱۳۱۸ھ میں شائع ہوئے تھے۔ بعد ازاں کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ اس کے دیباچہ میں لکھا تھا " میں نے بعض علمی اور سیاسی مباحث طبائع الاستبداد اور مصارع الاستعباد کے بارے میں شائع کرائے تھے۔ اس میں بعض تو میرے فکر کا نتیجہ ہیں اور بعض ترجمہ شدہ ہیں۔ ان سے کوئی خاص شخص یا خاص حکومت مراد نہیں بلکہ غفلت کے ماروں کو نیند سے بیدار کرنا ہے۔ شاید مشرقی اقوام یہ بھید پا لیں کہ وہ اپنے زوال کے خود ذمہ دار ہیں ان میں قضا و قدر یا

غیروں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس میں بعض اضافے بھی شامل ہیں۔ انہوں نے مشہور اطالوی ادیب الفیری (۱۷۴۹ء - ۱۸۰۳ء) کے بہت سے اقتباسات بھی دیئے ہیں۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ الفیری کے خیالات تک ان کی رسائی کیسے ہوئی؟ الفیری نے ۹ سال تک یورپ کی سیاحت کی تھی۔ والٹیر، لوسو اور مونٹسکیو کی تصانیف کا مطالعہ کیا تھا۔ ان کے خیالات سے سرشار ہو کر اسے آزادی سے عشق اور استبداد سے نفرت پیدا ہوئی۔ اس کی کتابوں میں حرّیت کے ترانے ہیں اور استبداد کی مخالفت ہے۔ کواکبی نے ان خیالات کو مشرق کے احوال و ظروف اور اسلامی افکار کے مطابق ڈھال لیا تھا اور ان میں اپنے تجارب آراء کی بنیاد پر بہت کچھ اضافہ کیا تھا۔

(۲)

کتاب طبائع الاستبداد میں استبداد کی تعریف اس طرح بیان کی ہے کہ وہ ایسی مطلق العنان حکومت ہے جو حساب و کتاب اور عذاب و عقاب کے اندیشے کے بغیر رعایا پر حکومت کرتی ہے۔ اس کا نہ کوئی قانون ہے اور نہ رعایا کی مرضی کو حکومت کے معاملات میں دخل ہے۔ بعض دفعہ یہ حکومت چند قوانین پر ... بھی ہوتی ہے۔ لیکن ان کو توڑتی رہتی ہے۔ حکومتیں طبعی طور پر استبداد کی دلدادہ ہوتی ہیں۔ رائے عامہ کی قوت ہی ان کو قابو میں لا سکتی ہے۔ مستبد سچائی اور آزادی کا دشمن ہوتا ہے۔ مستبد حاکم اپنی مرضی اور ارادہ سے حکومت کرتا ہے۔ اس کو شریعت کی پروا نہیں ہوتی وہ عوام کے لبوں پر مہر سکوت لگا کے رکھتا ہے۔

وہ رعایا کو دودھ دینے والی گائے سمجھتا ہے یا ذلیل و خوار کتا۔ وہ رعیت کو اپنا غلام بے دام تصور کرتا ہے۔ عقلمند رعایا بادشاہ کو ظلم سے روک سکتی ہے اور اپنے قول کو عمل میں لا سکتی ہے۔ کیونکہ جب ظالم مظلوم کو زبردست دیکھتا ہے تو اس پر ظلم نہیں کر سکتا۔ انہوں نے استبداد اور مذہب کے تعلق پر بڑی تفصیلی بحث کی ہے۔ اور فرانسیسی علماء سے نقل کیا ہے کہ دینی استبداد سے سیاسی استبداد پیدا ہوتا ہے۔ بہت سے مذاہب نفوس انسانی میں ایک بڑی قوت اور طاقت کا ڈر اور ہیبت پیدا کر دیتے ہیں جن کی کنہ انسانی عقول نہیں پا سکتیں۔ ان کو عذاب بعد الممات کی دردناکی کی دھمکی دی جاتی ہے۔ پھر کہا جاتا ہے کہ نجات اور خلاصی کا ذریعہ مذہبی علماء اور مشائخ اور پادری ہیں۔ اس طرح عوام کو سامنے مذہبی راہنماؤں کے سامنے جھکنے انکی عبودیت

اختیار کرنے اور طلب مغفرت کا دروازہ کھونے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ تید سیاسی راہنما بھی یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ لوگوں کو عظمت اور بڑائی کے نام سے ڈراتے ہیں زور و جبر اور لوٹ مار سے ان کو ذلیل کرتے ہیں اور قربت کا ذریعہ ڈھونڈتے ہیں۔ لوگوں کے اذہان میں معبود اور حکام کا تصور خلط ملط ہو جاتا ہے۔ ان کو پتہ نہیں چلتا کہ حقیقی تعظیم کا کون مستحق ہے۔ ان کو پوچھ گچھ اور تحقیق حال کا حوصلہ نہیں ہوتا جسطرح ان کو اللہ تعالیٰ کی مرضی اور مشیئت میں دخل دینے کا حق نہیں پہنچتا۔ انہوں نے مطلق العنان حاکم کو ولی نعمت، عظیم الشان اور جلیل القدر جیسے خداوندی خطاب دے رکھے ہیں۔ سیاسی خداؤں کے لئے قدسی صفات وضع کی جاتی ہیں اور ان کا رشتہ اللہ تعالیٰ سے جوڑا جاتا ہے۔ علمائے دین کو آلہ کار بنا کر اللہ تعالیٰ کے نام کے بہانے عوام پر ظلم و ستم کیا جاتا ہے۔ کواکبی کی رائے میں اسلام کی تعلیمات پر یہ قول صادق نہیں آسکتا کیونکہ اس کی تعلیمات سیاسی حریت پر مبنی ہیں جو کہ جمہوریت اور بادشاہت کے بین بین ہیں۔ ان کی اساس جمہوریت اور خواص کی شوریٰ پر ہے جو کہ ارباب حل و عقد ہوتے ہیں۔ قرآنی تعلیمات خودسری اور خودرائی کے منافی ہیں قرآن پاک میں عدل و انصاف اور نظام شوریٰ کی متابعت کی تعلیم دی گئی ہے۔ ایک جگہ آیا ہے شاورہم فی الأمر (معاملات میں ان سے مشورہ کرو)، وامرہم شوریٰ بینہم یعنی ان کے معاملات آپس میں مشورے طے ہوتے ہیں۔ قصص میں بھی مذکور ہے جب تک تم حاضر نہ ہو جاؤ۔ میں آخری فیصلہ نہیں کروں گا۔ آنحضرت صلعم اور خلفاء راشدین کے عہد میں ان احکام پر اچھی طرح عمل درآمد ہوا تھا۔ اسلام دینی غلبہ کو بھی نہیں مانتا اور نہ مغفرت اور معافی کی تجارت کرتا ہے۔ علمائے دین کی خاص منزلت نہیں ہے۔ لیکن بعد میں ہر مذہب کی طرح اسلام میں بگاڑ راہ پا گیا۔ مسلمان مختلف جماعتوں میں منقسم ہو گئے۔ حکومت کا نظام شوریٰ شخصی حکومت میں بدل گیا۔ عوام ذلت کے گڑھے میں جا گرے ان کی آواز پست ہو گئی وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ سے غافل ہو بیٹھے جس سے ارباب حل و عقد کی نگرانی ہو سکتی تھی۔ نتیجہ وہ نکلا جو ہم دیکھ رہے ہیں۔

کواکبی نے فرانسیسی علماء کے افکار کے نصف اول کا رد نہیں کیا۔ اس سے ایسے معبود کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ جو قوی عظیم اور مقتدر ہے جس سے لوگ خودسروں اور متکبروں کے آگے جھکتے ہیں۔ میرے نزدیک دین کا محور لا الٰہ الا اللہ ہے جس کی ہر اذان اور ہر مناسبت پر تکرار کی جاتی ہے۔ یہ کلمہ لوگوں کو یاد دلانے کے لئے کافی ہے کہ غلبہ اور اقبال صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے۔ اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے کے آگے جھکنا درست نہیں ہے۔ یہ کلمہ اللہ کے سامنے عاجزی اور غیروں کے آگے سربلندی سکھاتا ہے۔

لیکن جوں جوں وقت گذرتا گیا عقائد میں بدعات داخل ہونے لگیں۔ اب یہ کلمہ بہت سے مسلمانوں کے نزدیک کھوکھلا سا بن کر رہ گیا ہے۔ جو قوت و طاقت کی بجائے کمزوری پیدا کرتا ہے جس سے نہ صرف ظالم حاکم اور جابر رئیس کو بلکہ مال وجاہ و منصب کو بھی اللہ تعالیٰ کا شریک سمجھا جانے لگا ہے۔ اور ایسی ہی اور چیزیں..... معبود حقیقی شریک بن کر رہ گئی ہیں اور لا الہ الا اللہ کا مدلول حقیقی کسی کو بھی یاد نہیں رہا۔

○

پھر انہوں نے بالتفصیل بتایا ہے کہ ایک خود سر حاکم حقیقی علم سے ڈرتا ہے۔ وہ رعایا کو جہالت کے اندھیرے میں رکھنا چاہتا ہے۔ کیونکہ جہالت سے فرمانروائی کی توسیع ہو سکتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک مشرقی رئیس کا ایک استاد تھا..... جو سوئٹزرلینڈ کا رہنے والا تھا۔ جب اس کے شاگرد نے امارت حاصل کر لی تو استاد نے کہا کاش کہ تم اپنی رعایا میں علم کو فروغ دیتے

امیر نے جواب دیا۔ تو پھر ان پر حکومت کرنا دشوار ہو جائے گا۔ ایک خود رائے حاکم ادب اور دینی علوم سے ہرگز نہیں ڈرتا۔ بلکہ وہ اپنے استبداد کی تائید میں ان سے کام لیتا ہے۔ علماء کے منہ میں چند لقمے ڈال کر ان کا منہ بند کر دیتا ہے۔ اس کی جان تو عقلی فلسفہ، حقوق الامم کے مطالعہ، علوم سیاست واجتماع اور علم تاریخ کی اشاعت سے نکلتی ہے۔ اسے ادبی خطابت بھی پسند نہیں کیونکہ ان علوم سے ذہن میں روشنی پیدا ہوتی ہے اور لوگ ظالم کے خلاف بھڑک اٹھتے ہیں۔ ان کو اپنے حقوق سے آگاہی ہوتی ہے۔ اور اپنے مطالبات کے تحفظ کا ڈھنگ آتا ہے۔ کیونکہ حاکم تو چور ہوتا ہے اور ان علوم کے عالم ہی چوری کا پتہ اور کھوج لگا سکتے ہیں۔

ظالم حکام اور ان علماء میں ان بن رہتی ہے ان علوم کے ماہرین آگ بھڑکاتے ہیں اور ظالم حکام آگ بجھانا چاہتے ہیں۔ دونوں عوام کی رضامندی کے حصول کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ ظالم ڈرانے دھمکانے پر اور علماء افہام وتفہیم پر۔ تاکہ وہ قول کے بعد عملی قدم بھی اٹھا سکیں۔

جابر حاکم کو یہ پسند ہے کہ عوام خواب غفلت میں پڑے رہیں کیونکہ ان کی غفلت سے وہ ان پر حکومت کر سکتا ہے۔ وہ انکے مال غصب کرتا ہے۔ اور یہ اس کے لئے زندہ باد کے نعرے لگاتے ہیں۔ جب حاکم ان کو آپس ہی میں لڑاتا ہے تو اس کے اس فعل کو حسن سیاست اور تدبر کا نام دیتے ہیں۔ جو انکا مال بے دریغ اڑاتا ہے۔

تو یہ اُسکو سخی و کریم سمجھتے ہیں۔ وہ انہیں قتل کرتا ہے تو یہ اس کو رحیم سمجھتے ہیں اگر کوئی ظلم وستم کے خلاف آواز بلند کرتا ہے تو اس کو باغی سمجھ کر کیفرِ کردار تک پہنچایا جاتا ہے۔ ظالم حاکم رعیت سے ایسا ڈرتا ہے۔ جس طرح رعیت اس سے ڈرتی ہے۔ محقق مؤرخوں نے اس کے استبدادی درجہ کا قیاس اس کے جو کئے ہیں۔ عدل وانصاف اور اطمینان کے درجہ سے کیا ہے۔ استبداد کی گہرائی کا اندازہ حاکم کے عیش و عشرت، شان وشوکت سے اور بڑے بڑے القابات سے لگایا جاسکتا ہے۔ کیونکہ زبان میں تعظیمی الفاظ کی کثرت استبداد کی قدیم تاریخ کا پتہ دیتی ہے۔ جیسا کہ فارسی زبان کا حال ہے۔ برخلاف اس کے عربی زبان میں القاب کے بھاری بھرکم الفاظ بہت کم ہیں جو اس کی آزادی کا ثبوت ہیں۔

قصہ مختصر یہ ہے کہ مستبد حاکم سب سے زیادہ علم سے ڈرتا ہے۔ کیونکہ علم سے پتہ چلتا ہے کہ آزادی زندگی سے زیادہ عزیز ہے۔ عزت ووقار، منصب اور مال و دولت سے زیادہ اچھے ہیں۔ علم سکھاتا ہے کہ حقوق کس طرح طلب کئے جاتے ہیں، کس طرح ان کی حفاظت کی جاسکتی ہے ظلم سے کس طرح نپٹا جاسکتا ہے۔ انسانیت کی قدر وقیمت کیا ہوتی ہے اور غلامی کے کیا نقصانات ہیں۔

کواکبی نے استبداد کے متعلق تمام کتابیں پڑھی تھیں۔ پھر اپنے زمانہ کی حکومت عثمانیہ کو دیکھ کر نتائج اخذ کئے تھے۔

○

انہوں نے استبداد اور عزت وشرف کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ مجد سے ان کی مراد عوام کے دلوں پر حکمرانی کرنے کی انسانی خواہش ہے جو کہ طبعی چیز ہے۔ بعض دفعہ اس حرص کا جذبہ لوگوں میں اتنی شدت اختیار کر لیتا ہے کہ وہ پوچھنے لگتے ہیں کہ شہرت طلبی کا داعیہ زیادہ مضبوط ہوتا ہے یا زندہ رہنے کا۔ کواکبی ان لوگوں میں سے ہیں جو جاہ و شہرت کی طلب میں زندگی سے زیادہ حریص نظر آتے ہیں۔

انہوں نے ابن خلدون کی عجب سجدی کی ہے۔ جو عزت وشرف کے مقابلہ میں زندہ رہنے کو مقدم سمجھتا ہے۔ ابن خلدون نے حضرت امام حسین بن علیؓ کے موقف پر نقد کیا تھا جو ایک بڑے ساز وسامان اور لاؤ لشکر والے سلطان کے مقابلہ کے لئے مختصر سے گروہ کو ساتھ لے کر نکلے تھے اور اپنے آپ کو ہلاکت کے منہ میں ڈال دیا تھا۔ اس کا کواکبی یہ جواب دیتے ہیں کہ حضرت امام حسین کو اس معاملہ میں معذور سمجھا جائے۔

کیونکہ وہ باعزت موت کو اس ذلیل زندگی پر ترجیح دیتے تھے ۔ جو ابن خلدون کا شعار تھا ۔ اہل بیت کی مثال ان معزز جانوروں، چوندوں اور پرندوں کی ہے جو اسارت کے پنجرہ میں انڈے بچے نہیں دیتے اور ذلت کی قید سے خلاصی پانے کے لئے جان دے دیتے ہیں ۔ کواکبی ابن خلدون سے ناراض ہیں کیونکہ وہ خود سید ہیں اور سادات کے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں وہ خود عزت اور سربلندی کے جویا ہیں چاہے اس راہ میں ان کی جان ہی چلی جائے لیکن ابن خلدون کے دلائل عقلی ہیں اور کواکبی کے جذباتی ۔ اس کے بعد انہوں نے استبداد اور مال کے رشتے کے بارے میں لکھا ہے وہ معتدل اشتراکیت کو بھلائی کا سرچشمہ سمجھتے ہیں ۔ ان کے نزدیک ایک عالم جو کسی فائدہ بخش علم کی تحصیل میں ساری جوانی صرف کر دیتا ہے یا کوئی ماہر کسی مفید صنعت کی دریافت میں زندگی کھپا دیتا ہے ۔ ایک جاہل اور آرام طلب شخص کے برابر کیسے ہو سکتا ہے ۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ دولت مند فقیر کی دست گیری کرے اور اپنی معیشت میں اسے شریک بنائے ۔ اسلام نے اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر زکاۃ فرض کی ہے ۔ جو اڑھائی فیصد کے حساب سے فقراء کو دی جاتی ہے سود کو بھی حرام قرار دیا ہے ۔ اگرچہ بعض معیشی ماہرین نے چند معقول اقتصادی اسباب کی بنا پر اس کو جائز رکھا ہے کیونکہ بہت سے صحیح اور قابل لوگوں کو سرمایہ نہیں ملتا اس کی علت یہ ہے کہ بازاروں میں گردش کرنے والا سرمایہ بعض دفعہ ناکافی ہوتا ہے اور اگر سرمایہ دار سرمایہ کا بعض حصہ روک لے تو قلتی وقت کا سامنا ہو گا ۔) شخصی حکومت سے قومی دولت میں خلل پیدا ہوتا ہے کیونکہ سیاسی مدبروں دینی علماء اور ان کے حاشیہ نشینوں پر قومی دولت بے دریغ خرچ کی جاتی ہے ۔ شاہ کے نوکر چاکر اور آلۂ کار گلچھرے اڑاتے ہیں جب کہ ساری قوم میں غربت ۔ تباہ حالی اور تنگدستی کا دور دورہ ہوتا ہے ۔

(۳)

اس کے بعد کواکبی نے اخلاق میں استبداد کے اثر کو بیان کیا ہے جس سے اخلاقِ فاضلہ کمزور ہو جاتے ہیں اور ان میں بگاڑ واقع ہو جاتا ہے ۔ استبداد انسان کو محبت کے جذبہ سے محروم کر دیتا ہے ۔ وہ اپنی قوم سے نفرت کرتا ہے ۔ کیونکہ وہ استبداد کی مددگار اور معاون ہوتی ہے وہ اپنے وطن سے محبت نہیں کرتا کیونکہ وہ محرومی کی زندگی گذارتا ہے وہ اپنے دوست کا خیر خواہ نہیں بن سکتا کیونکہ وہ اسے استبداد کا حامی تصور کرتا ہے ۔

استبداد مؤرخوں کی عقلوں پر قبضہ کر لیتا ہے۔ وہ جابر کشور کشاؤں کو عظیم اور جلیل القدر سمجھتے ہیں حالانکہ وہ قتل و غارت اور تباہی و بربادی کا بازار گرم رکھتے ہیں اور اسلاف کی مدح سرائی سے اخلاف کو خوشامد کا عادی بناتے ہیں۔

استبداد سے ایک دوسرے پر اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ اعتماد کی جگہ خوف لے لیتا ہے جس سے افراد کے درمیان تعاون میں کمی آجاتی ہے۔ حالانکہ باہمی تعاون سے قومیں زندہ رہتی ہیں۔

انبیائے اکرام کا اخلاق کی تکوین کے لئے خاص مسلک ہے۔ وہ غیر اللہ کی تعظیم سے عقل انسانی کو نجات دلاتے ہیں۔ اس کے لئے فطری ایمان کو مضبوط کرتے ہیں۔ حکمت کی مبادیات سے انسانی عقول کو روشن کرتے ہیں۔ ان کو فکری آزادی سے آگاہ کرتے ہیں۔ ان تعلیمات سے وہ استبداد کے قلعوں کو پاش پاش کر دیتے ہیں۔ ان کو سمجھاتے ہیں کہ وہ انسانی قانون کے پابند ہیں جس کے مبادیات کی اتباع سے ساری قوم ترقی کر سکتی ہے۔

تمام کتاب اسی قسم کے مباحث سے بھری ہوئی ہے۔ اس میں ان کا خلوص غیرت اور ہمدردی ہر سطر سے نمایاں ہے۔ یہ افکار انہوں نے اگرچہ مغربی علماء سے لئے ہیں لیکن ان کا انطباق انہوں نے مشرق کے حالات پر کر دیا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے صرف نظریات کے تنگ دائرہ میں اپنے کو محصور کر رکھا ہے۔ اگر وہ نظریات کے ساتھ شواہد اور تجربات بھی نقل کر دیتے ہیں تو کتاب زیادہ نفع بخش ہو سکتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنا نام چھپانے میں مصلحت سمجھی۔ کتاب کے مقدمہ میں لکھا ہے "اس سے نہ کوئی خاص ظالم مراد ہے اور نہ خاص حکومت۔ اگر شواہد لکھے جاتے تو اس سے مشار الیہ کا پتہ لگ سکتا تھا۔ اور شاید یہ بات نفع مند بھی ہوتی۔ لیکن امور کا اندازہ ظروف اور احوال سے کیا جا سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے اپنے نظریات نہایت جرأت اور ہمت سے ظاہر کئے ہیں۔

ان کی دوسری کتاب جس کا نام ام القریٰ ہے۔ ان کی عبقریت اور عظیم شخصیت پر شاہد عدل ہے۔ وہ مسلمانوں کی سیاسی بیماری کی تشخیص ایک حکیم کی طرح کرتے ہیں اس کے اسباب وغیرہ معلوم کرتے اور علاج کو افسانے کی شکل میں بیان کرتے ہیں۔ وہ ایک اسلامی انجمن کا حال لکھتے ہیں جس کا جلسہ مکہ مکرمہ میں ہوا تھا اور اس میں ہر اسلامی ملک کے نمائندوں نے حصہ لیا تھا۔ ممبروں میں شامی۔ اسکندری۔ مصری۔ مقدسی۔ یمنی۔ بصری۔ نجدی۔ مدنی۔ مکی۔ تونسی فاسی۔ انگریزی۔ رومی۔ کردی۔ تبریزی۔ تاتاری۔ قازانی۔ ترکی۔ افغانی۔ ہندی۔ سندھی اور چینی شامل تھے۔ انجمن کا صدر مکی اور سیکرٹری سید فراتی (کواکبی) تھا ان سب کا اجتماع حج سے قبل مکہ مکرمہ میں ہوا تھا۔ موضوع بحث مسلمانوں

کی حالت تھی۔ پہلا اجتماع ۱۵ ذیقعدہ ۱۳۱۶ھ میں ہوا تھا۔ یہ انجمن حقیقی تھی یا محض خیالی؟ میری رائے میں صرف خیالی تھی۔ انجمن کے صدر نے اس کا دستور العمل بھی بنایا تھا اس میں شامل تھا کہ ہر بات کو خفیہ رکھا جائے گا۔ اس سے ہر ممبر اپنے افکار کو دل کھول کر بیان کر سکے گا۔ مذہبی اختلاف کا ذکر نہ ہوگا۔ کیونکہ سنی بشیعہ۔ شافعی اور حنفی سب برابر کے مسلمان ہیں۔ مسلمانوں کی اصلاح سے مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جبکہ رومیوں۔ یونانیوں۔ جاپانیوں نے اپنی عظمت رفتہ حاصل کر لی ہے۔ اب مسلمانوں کی صحت کے آثار ظاہر ہونے لگے ہیں اور اس جلسہ کا انعقاد ہی مسلمانوں کی بیداری پر دال ہے جس میں مسلمانوں کے زوال کے اسباب اور اس کے تدارک کے طرق بحث و نظر کا موضوع بنے ہوئے ہیں۔ صدر انجمن نے جلسہ کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کے امراض کا سب سے بڑا سبب ان کی بدنظمی اور انتشار ہے۔ اس سے کوئی قصبہ، شہر اور ملک مستثنیٰ نہیں، ممالک اسلامیہ میں دوسرے مذاہب کے پیروکار ہر فن اور صنعت میں ان سے بڑھے ہوئے ہیں۔ حالانکہ تمام شہروں کے مسلمان امانت۔ شجاعت اور سخاوت میں دوسری قوموں سے ممتاز ہیں۔ بعض فلاسفروں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اسلام اور حسن انتظام ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔

ہندوستانی ممبر نے اعتراض اٹھاتے ہوئے کہا کہ کئی ملکوں کے مسلمان اپنے پڑوسیوں سے اچھی حالت میں ہیں۔ مثلاً ہندوستان کے اور عراق کے مسلمان بت پرست اور صابیوں سے بدرجہا بہتر ہیں۔ اس پر صاحب صدر نے ان کی دقت نظر کی داد دی۔

تمام ممبروں نے مرض کے اسباب کے متعلق مختلف آراء کا اظہار کیا شامی نمائندے کا کہنا تھا کہ مسلمان کے فتور کا بڑا سبب جبریہ عقیدہ ہے جس سے مسلمانوں میں دنیا سے بے رغبتی پیدا ہو گئی ہے۔ وہ تھوڑے سے رزق پر قناعت کر بیٹھے ہیں۔ قضا و قدر کے مان لینے سے ترقی اور آگے بڑھنے کا جذبہ فنا ہو جاتا ہے۔ اب مسلمان زندہ لاشیں بن گئے ہیں۔ عقل اور شرع تو اس عقیدہ کو اچھا نہیں سمجھتی۔

مقدسی کی رائے تھی کہ سیاست اسلامیہ نے جمہوریت کی بجائے شخصیت کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ جس سے عقل اور اخلاق مردہ ہو گئے ہیں۔

اس پر اعتراض کرتے ہوئے تونسی نمائندہ نے کہا۔ کہ یورپ میں بھی بعض حکومتیں استبدادی ہیں لیکن وہاں کے باشندے برابر ترقی کر رہے ہیں ان کی رائے میں مسلمانوں کے زوال کے ذمہ دار وہ فضول خرچ امراء ہیں جو قوم کے حقوق کی نگہداشت نہیں کرتے۔

رومی نمائندہ نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ امراء کو ذمہ دار کو ٹھہرانا قرین ثواب نہیں۔ یہ تو قوم کا محدود سا طبقہ ہوتا ہے۔ حقیقی سبب یہ ہے کہ مسلمان اقوام ہر قسم کی آزادی سے محروم ہیں۔ ان میں نہ تعلیمی آزادی ہے اور نہ تقریر کی نہ علمی بحث کی۔ آزادی کے کھو جانے سے حوصلہ مندی جاتی رہتی ہے۔ دل مردہ ہو جاتے ہیں۔ قوانین مختل ہو جاتے ہیں اور قوم۔۔۔ بدنظمی اور انتشار کا شکار ہو جاتی ہے۔

تبریزی کی رائے تھی کہ زوال کا اصلی سبب یہ ہے کہ مسلمانوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو ترک کر دیا ہے۔ ان کے امراء خواہشات نفسانی میں حد سے بڑھ گئے ہیں۔ لیکن ان پہ نگران کوئی نہیں ہے۔

فاسی کے خیال میں کمزوری کا سبب مسلمانوں کی دینی امور سے غفلت شعاری تھی۔ اب مذہب کا ذکر زبانوں پر رہ گیا ہے۔ ان کے امراء نے سیاسی غلبہ حاصل کرنے کے لئے بناوٹی دینداری کو اختیار کر لیا ہے۔ اگرچہ یہ امراء ظالم اور جابر ہیں جس زمانہ میں مسلمانوں کا رشتہ مذہب سے مضبوط تھا وہ اقبال مند تھے جب یہ رشتہ کمزور پڑ گیا۔ ان کے اخلاق بھی کمزور ہو گئے۔ مدنی ممبر نے اس کا یہ جواب دیا کہ صرف مذہبی برگشتگی اس بدنظمی کا سبب نہیں ہے بلکہ بعض دھوکا باز علماء اور غالی صوفی بھی اس انتشار کے ذمہ دار ہیں۔ جنہوں نے صحیح دین کو بہت سے رنگ دے رکھے ہیں۔ انہوں نے مذہب اور اہل مذہب کا ستیاناس کر دیا ہے۔ اصل میں علمائے عاملین ہی قوم کی قدر و منزلت کے مستحق ہوتے ہیں۔ ان کے اقتدار کے چلتے ہوئے بعض نقلی صوفی تصوف کا پیشہ اختیار کر لیتے ہیں۔ مشاہدہ ہے کہ کم استطاعت رکھنے والے انسان بھی تصوف کی پناہ لیتے ہیں جس طرح ایک غریب آدمی زیب و زینت کی نمائش کرتا ہے اسطرح یہ لوگ اپنی دینداری کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔ ان متصوفین نے دین میں بدعات داخل کر دی ہیں جیسے علم لدنی۔ ترتیب مقامات۔ روحانی خلافت۔ ظاہری عفت۔ تبرکات۔ کرامات روحانی تصرفات وغیرہ جس سے یہ لوگ جاہلوں اور عورتوں کو اپنے جال میں پھنسا لیتے ہیں۔ عورتیں اس اعتقاد کو اپنی اولاد میں منتقل کر دیتی ہیں۔ ان خرافات سے دل مردہ اور عقلیں گمراہ ہو جاتی ہیں۔ ان روحانی شعبدہ بازوں سے ابداد۔ مصر، شام اور آستانہ کے بازار بھرے ہوئے ہیں اور یہ متعدی مرض ہر جگہ پھیل گیا ہے۔

رومی نے تائید میں تقریر کرتے ہوئے وضاحت بتلایا کہ اس ساری بیماری کی جڑ رسمی علماء ہیں۔ بلاد عثمانیہ میں بڑے بڑے القاب، جاہل ملاؤں کو دیے جاتے ہیں حتیٰ کہ بچوں اور ان پڑھوں کو شیخ طریقت اور اعلم العلماء

کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے ان کو اعلم العلماء المتبحرین اور افضل الفضلاء المتورعین اور ینبوع الفضل والیقین کے گراں قدر خطابات سے نوازا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ اپنے القابات اور خطابات کو ٹھیک طرح سے پڑھ بھی نہیں سکتے۔ یہ لوگ بھی سلطان کو ملاقات کے وقت صاحب العظمۃ والاجلال۔ المنزہ عن النظیر والمثال۔ مہبط الالہامات مصدر الکرامات۔ سلطان السلاطین اور مالک رکاب العالمین کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ ارشاد و وعظ اور خطابت و امامت۔ تجارتی چیزیں بن کر رہ گئی ہیں جن کو بیچا اور خریدا جا سکتا ہے ان کو ہبہ کیا جا سکتا ہے۔ اور نسلاً بعد نسلٍ ان کا انتقال کیا جا سکتا ہے۔ یہ لوگ تمام شعبوں پر قابض ہیں۔ اور جب اجنبی طاقتیں ملکی اصلاح کا مطالبہ کرتی ہیں تو امراء کہہ دیتے ہیں کہ عوام خاص کر علماء مدنی اصلاح کے سخت مخالف ہیں۔

کردی نے جواب میں کہا کہ یہ مرض بعض علاقوں کے ساتھ مخصوص ہے لیکن فتور سب جگہ موجود ہے۔ میرے نزدیک تو مسلمانوں کی پستی کا یہ سبب ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو صرف علوم دینیہ میں محصور کر لیا ہے اور دنیاوی علوم ریاضیات طبعیات اور کیمیا سے قطع نظر کر لیا ہے۔ حالانکہ ان علوم کا آفتاب عالم تاب مغرب میں ضوفشاں ہے اور اس کے اثرات زندگی کے تمام شعبوں پر ظاہر ہو رہے ہیں۔ لیکن مسلمان تمام امور میں یورپ کے دست نگر ہیں۔ بچہ کی تربیت سے لے کر انتظام سلطنت تک۔ سوئی سے لے کر توپ اور تفنگ تک۔ ان حیات بخش علوم سے دوری نے مسلمانوں کو ذلت کے گڑھے میں ڈال رکھا ہے۔ جوں جوں وقت گذرتا جاتا ہے۔ اسی نسبت سے ان کے اور ان کے پڑوسیوں کے درمیان دوری بڑھتی جاتی ہے۔ اسکندری نے کہا یہ ایک سبب ہو سکتا ہے۔ ان علوم کی محرومی سے ہم اخلاق عالیہ سے عاری نہیں ہو سکتے۔ اصل سبب تو ہماری غفلت اور ناامیدی ہے۔

تاتاری نے اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ یہ شکایت حال اسباب کی شرح کا کام نہیں دے سکتی۔ میرا تو خیال ہے کہ فساد کی جڑ راہنماؤں کا فقدان ہے نہ کوئی صاحب تدبیر امیر موجود ہے جو قوم کی ہدایت کی طرف راہنمائی کرے نہ کوئی مخلص زعیم موجود ہے۔ جس کے عوام و خواص مطیع و فرمانبردار ہو سکیں نہ کوئی رائے عامہ موجود ہے جو لوگوں کو کسی مقصد اور نصب العین کے لئے جمع کر سکے۔

افغانی نے بتلایا کہ اس کے نزدیک تمام برائیوں کی جڑ فقر و فاقہ ہے کیونکہ غربت سے ہر قسم کا فتنہ پیدا پیدا ہوتا ہے اس سے جہالت پھیلتی ہے خلقی انحطاط پیدا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے دین میں بھی یک جہتی پیدا

نہیں ہو سکتی۔ ہماری اقتصادی حالت زندہ قوموں کے مقابلہ میں ہمیں پیچھے رکھے ہوئے ہے۔ ہاتھوں کو چومیں۔ بڑے بڑے آدمیوں کے سامنے اس لئے اپنے کو ذلیل کرتے ہیں کہ کمزور اور ضعیف عوام ان کی قدر و منزلت کریں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ منافق علماء کا درجہ اور قدر و قیمت عوام ہی گھٹا دی جائے۔ تاکہ وہ خود باعمل علماء کا احترام کر سکیں۔ چین میں ایسے عقلمند اور دانا لوگ موجود ہیں جن کا دبدبہ علماء پر بھی ہے۔ اسلام میں یہ لوگ ارباب حل وعقد کہلاتے ہیں۔ خواص کا یہی وہ اونچا طبقہ ہے جس کی نسبت ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حکم ہوا تھا کہ ان کے ساتھ مشورہ کر لیا کریں۔ تاریخ اسلام ارباب حل وعقد کی کمزوری اور طاقت کے ارتباط کی شاہد عادل ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ فتور کا سبب امراء کے استبداد کا استحکام اور امت میں اہل حل وعقد کا فقدان ہے۔

نجدی ممبر نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ مسلمانوں کے زوال کا سبب یہ ہے کہ وہ سلف الصالحین کے مذہب سے ہٹ گئے ہیں۔ انہوں نے علم۔ مال اور جہاد سے طاقت حاصل کرنی چھوڑ دی ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ اقامت حدود اور ادائے زکاۃ سے پہلو تہی کی جاتی ہے۔ ایک معترض کہہ سکتا ہے کہ بعض مذاہب اپنی اصلیت کھو بیٹھے ہیں لیکن ان کے پیروؤں میں کوئی کمزوری پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ بہت سے مغربی فضلاء تو یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے ترقی تب ہی کی جب کہ دنیاوی معاملات کو دین سے علیحدہ کر لیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہر قوم کا کوئی نہ کوئی نصب العین ہوتا ہے جس کے موافق اس کے تجارتی اور سیاسی معاملات سر انجام پاتے ہیں۔ قانون طبعی جو بشری طبیعت کے ہم آہنگ ہے۔ تقاضا کرتا ہے کہ انسان قوت غالبہ یعنی اللہ تعالیٰ کا مطیع اور فرمانبردار بن جائے۔ اس فطرت کا زندگی کے معاملات سے گہرا اور مضبوط رشتہ ہے۔ تمام ادیان کی اصل ایک تھی اور جب اس میں تبدیلی اور تغیر پیدا ہوا تو عوام میں بھی بگاڑ پیدا ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "جو میری یاد سے منہ موڑتا ہے اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے" قوم صحیح مبادیات سے جتنی قریب ہوگی اسی قدر کمال پر پہنچے گی

صاحب صدر نے اعلان کیا کہ اسباب زوال امت پر کافی بحث ہو چکی ہے۔ اب ہمیں دوسرے موضوع کی طرف توجہ کرنی چاہیئے اور جیسا کہ نجدی بھائی نے اشارہ کیا ہے۔ صحیح اسلام کو موضوع سخن بنانا چاہیئے

نجدی نمائندہ نے بیان کیا تھا کہ ایمان باللہ ایک فطری تقاضا ہے۔ اس کے لئے لوگوں کی طرف رسول بھیجے گئے تاکہ وہ ایمان کی کیفیت سے انہیں آگاہ کریں۔ لوگ اللہ تعالیٰ کے بارے میں مختلف تصورات رکھتے ہیں عقول البشری جتنی قوی اور وسیع ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ کی ازلی صفات کو مادہ زمان اور مکان سے علیحدہ کر کے ان کا ادراک نہیں کر سکتیں اس کے لئے ایک راہنما کی ضرورت ہے۔

اسلام کی بنیاد دو جملوں پر قائم ہے لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ پہلے کلمہ پر ایمان کا ثمرہ یہ ملتا ہے کہ انسانی عقول ہر قسم کی قید سے آزاد ہو جاتی ہیں اور دوسرے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ انسان حضرت محمد صلعم کی تعلیمات کی راہنمائی سے ہر قسم کے شرک سے نجات پاتا ہے۔

توحید کا ادراک اور اس پر مواظبت انسانی طبیعت پر شاق گذرتی ہے۔ شرک کی تین قسمیں ہیں ۱۔ شرک فی الذات۔ جیسے حلول کا عقیدہ۔ ۲۔ شرک فی الملک۔ تکوینی تدبیروں میں بعض مخلوقات کو شریک سمجھنا ۳۔ شرک فی الصفات۔ بعض مخلوقات کو کمالی صفات سے متصف کرنا۔ مسلمانوں میں شرک زوروں پر ہے جیسے تعظیم قبور۔ ان پر مساجد اور مشاہد کی تعمیر۔ ان کا طواف۔ ان پر چراغاں کرنا اور ان کے آگے سجدہ کرنا۔ یہ دعویٰ کرنا کہ بعض لوگوں کو علم باطن حاصل ہے۔ رقص و سرود کی محافل کا انعقاد۔ سبز اور سرخ لباس زیب تن کرنا۔ جنوں اور شیطانوں کو قابو میں کرنا۔ یہ سب شرک کی باتیں ہیں۔ شرک کے علاوہ دوہم باتیں اور ہیں۔ اسلام بالکل آسان مذہب تھا۔ بعد میں بعض لوگوں نے شدت اختیار کرنی شروع کر دی۔ ہر فرقہ اس شدت میں کچھ نہ کچھ اضافہ کرتا گیا جس سے مذہب پر عمل کرنا دشوار ہو گیا کثرت مذامت اور تصوف و سلوک کے مختلف طریقوں سے انسانی ذہن پریشان ہو کر رہ گیا۔ صاحب صدر نے دیکھا کہ دو ممبروں نے ابھی تک اظہار خیال نہیں کیا۔ یہ دو ممبر ہندی اور قازانی تھے۔ سندھی نے کھڑے ہو کر تصوف کے اسباب اور اس کے نفع اور نقصان پر تقریر کی۔ قازانی نے مفتی قازان اور روسی عیسائی کا قصہ سنایا جو مسلمان ہو گیا تھا۔ مفتی صاحب تقلید سلف کی دعوت دیتے تھے اور ان کے اقوال پر مذہب کا انحصار بتاتے تھے۔ نومسلم روسی اجتہاد اور عدم تقلید کا قائل تھا۔ قازانی نمائندہ نے دونوں کے سوالات و جوابات بیان کئے۔ بالآخر نومسلم روسی مناظرہ میں بازی لے گیا۔ اور اسے اطمینان ہو گیا کہ تقلید نقصان دہ ہے جس سے سستی بھارتی ہے اور اجتہاد ضروری اور واجب ہے۔ لیکن اس کے قیام کے لئے سخت کوشش اور محنت ضروری ہے۔

صدر مجلس نے سیکرٹری کو بلا کر کہا کہ زوال امت پر جتنی تقریریں ہوئی ہیں ان سب کا خلاصہ بیان کر دیا

ہمارے اور اگر کسی ممبر نے کوئی بحث تشنہ چھوڑ دی ہے۔ تو وہ بوضاحت بیان کرے۔ انہوں نے کاروائی کا خلاصہ اس طرح بیان کیا۔

دینی اسباب :۔ اہم ترین سبب عقیدۂ جبر ہے اس کے بعد دنیاوی علائق اور سعی وعمل کا ترک کرنا ہے۔ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کا باہمی اختلاف۔ دین میں سہولت کی بجائے فقہائے متاخرین کا تشدد، اسلامی تعلیمات میں اوہام وخرافات کی آمیزش۔ دین کے بارے میں قول اور عمل میں عدم مطابقت۔ غالی صوفیوں کا دین کو کھیل اور مذاق سمجھنا۔ نصوص میں من مانی تاویلات۔ فرائض اور واجبات سے بچنے کیلئے حیلہ جوئی۔ دجالوں کا لوگوں کے دل میں یہ وسوسہ ڈالنا کہ دین کے بعض امور باطن سے تعلق رکھتے ہیں۔ علوم حکمیہ اور علمیہ کو دین کے منافی سمجھنا۔ عقیدہ توحید میں شرک کا امتزاج۔ علماء کی نماز باجماعت جمعہ اور حج کی حکمت سے بے خبری اور غفلت۔ یہ ہیں مسلمانوں کی کمزوری کے اسباب۔

سیاسی اسباب : مسئولیت سے سیاست کا بری الذمہ ہونا۔ قوم میں قول وعمل کی حریت اور امن و امید کا فقدان۔ قوم کے مختلف طبقات میں حقوق کی عدم مساوات۔ امراء کا دھوکا بازوں علماء کی طرف میلان، علم کو امراء کا صدقہ سمجھنا۔ ان کا ناصحوں سے دور رہنا اور خوشامدیوں کو مقرب بارگاہ بنانا۔

۳۔ خلقی اسباب :۔ جہالت میں مستغرق اور خوش ہونا۔ قوم کا مایوس رہنا۔ گمنامی پر راضی رہنا۔ تعلیم اور مالی نظام کی خرابی۔ عوام کا بزدلی سے حقوق نہ طلب کرنا۔ ملازمت کو صنعت وحرفت سے اچھا سمجھنا۔ قومی معاملات میں حصہ نہ لینا۔

سیکرٹری نے اور بھی بہت سے اسباب بیان کئے تھے۔ جن میں قابل ذکر زندگی کے معاملات کی تنظیم سے غفلت۔ کام کی تقسیم میں عدم انصاف۔ بچوں کی تعلیم وتربیت سے غفلت۔ کم ہمتی اور توکل ہیں۔ مؤتمر نے مرض اور علاج کی بحث پر اکتفا نہ کی۔ بلکہ ایک مستقل انجمن کے قیام کو ناگزیر قرار دیا تھا جس کے مقاصد میں مسلمانوں کی اصلاح اور اصلاحی پروگرام کا نفاذ بھی داخل تھا۔ یہ بھی قرار پایا تھا کہ انجمن کے سو ممبر ہوں گے۔ دس انتظامی۔ دس مشاورتی اور اسی اعزازی ہوں گے۔ عام ممبروں کے لئے کوئی تعداد مقرر نہ تھی۔ انتظامی ممبروں کے لئے کڑی شرائط تھیں۔ مثلاً پاکبازی۔ امانت۔ خلوص اور وسعت علم اثر انگیزی کی قدرت اور مؤتمر کے اغراض کے لئے فرصت عمل۔ مؤتمر کا مرکز مکہ معظمہ میں رکھا گیا تھا۔ اس کی شاخیں آستانہ۔ مصر۔ عدن۔ شام۔ طہران۔ وتفلس۔ کابل۔ کلکتہ۔ سنگاپور۔ تونس اور مراکش وغیرہ . . .

میں قائم کی جائیں گی۔ انجمن کسی حکومت کے زیر اقتدار نہ ہوگی، نہ کسی فقہی مذہب کی تائید کرے گی۔ "ہم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کریں گے یہ اس کا شعار ہوگا" اس کے اہم اغراض میں مسلمانوں میں تعلیم کی اشاعت۔ نافع علوم وفنون کی ترغیب اعلیٰ تعلیم کے لیئے مدارس عالیہ کا قیام۔ تعلیمی اصولوں کی وحدت۔ اخلاقی بلندی کی ضابطہ بندی اور انجمن کے اغراض ومقاصد کی اشاعت کے لیئے ماہواری مجلہ کا اجراء شامل تھا۔ کامل اتفاق سے منظور ہوا کہ جمعیت کا دفتری مرکز مصر ہوگا۔ کیونکہ علم اور حریت کے لحاظ سے وہ تمام ملکوں سے بڑھا ہوا ہے جمعیۃ کے بارہ اجلاس منعقد ہوئے۔ اس کے بعد وہ ان نتائج پر پہنچ کر ملتوی ہوگئی۔

۱۔ مسلمانوں کی حالت کی ابتری۔

۲۔ اس کا تدارک

۳۔ جہالت کی بیماری کے جراثیم

۴۔ تعلیم سے روشن خیالی پیدا کرنا۔ نوجوانوں میں ترقی کا جذبہ پیدا کرنا۔

۵۔ اس علاج کے لئے انجمنوں کا قیام

۶۔ اس کا مکلف ہر وہ شخص ہوگا جو عمل پر قادر ہو سکے۔ خاص کر اعیان اور علمائے امت۔

○

ہم نے اس مفید ڈرامہ پر یہ سرسری سی نظر ڈالی ہے۔ آج سے پچاس برس پہلے کواکبی کا یہ فکر اس کی وسعت اطلاع، خلوص نیت۔ فکری بلندی اور حیرت انگیز شجاعت پر شاہد ناطق ہے۔ ان سے پہلے اس موضوع پر اخبارات میں جو کچھ لکھا جاتا تھا وہ صرف ڈھول کا پول تھا۔ لیکن کواکبی نے اس کو علمی رنگ میں پیش کیا۔ اسباب امراض بتلائے اور صبر۔ حوصلہ مندی اور تفصیل سے اس کا علاج متعین کیا۔

ام القریٰ ایک قسم کا سنجیدہ افسانہ ہے جس میں عشق وعاشقی کو کوئی دخل نہیں بلکہ اس کا مؤلف عالم اسلام کا عاشق زار ہے۔ اس کی راہ میں وہ مصائب جھیلتا ہے جو ستم رسیدہ عاشق ہی جھیل سکتا ہے۔ وہ دل سے چاہتا ہے کہ اس کا محبوب کمال کے اعلیٰ درجات تک پہنچ سکے اس کی راہ میں وہ مال ودولت کی قربانی دیتا ہے۔ اپنا وطن چھوڑ کر مصر چلا آتا ہے۔ کیونکہ یہاں وہ حق گوئی اور بے باکی سے اظہار خیال کر سکتا ہے۔ وہ فنی اختصاص حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس نے مسلمانوں کی اصلاح کیلئے اپنے آپ کو وقف کر رکھا ہے۔ اس غرض

کیلئے اس نے تاریخ اسلام کا دقت نظر سے مطالعہ کیا ہے تاکہ اسباب کے نتائج کا پتہ چل سکے۔ انہوں نے تمام ممالک اسلامیہ کی سیاحت کی تھی۔ ہر ملک کی خوبیوں اور برائیوں سے آگاہی حاصل کی تھی۔ جب انہوں نے ام القریٰ تصنیف کی ہے تو اس میں ہر نمائندہ اپنے ملک کے نکتۂ نظر کے مطابق گفتگو کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ نجدی مذہب کے عدم فروغ کی شکایت کرتا ہے۔ رومی حریت کا فقدان اور علماء کے اقتدار کا رونا روتا ہے۔ اسکندری اخلاق کی کمزوری بیان کرتا ہے۔ انگریز نومسلم نوحہ کناں ہے کہ مسلمانوں نے اجتماعات سے فائدہ اٹھانا چھوڑ دیا ہے تبادلہ افکار کے لئے خطبات اور محاضرات سے کام نہیں لیا جاتا وغیرہ وغیرہ۔ سید جمال الدین افغانی یورپی سیاست کے زخم خوردہ تھے۔ عروۃ الوثقیٰ میں ان کے غیض و غضب کا نشانہ انگریز رہے تھے۔ کواکبی عثمانی سیاست کے نخچیر تھے۔ لہٰذا ان کے نقد و تبصرہ کا موضوع دولت عثمانیہ رہی ہے۔ سید افغانی مسلمانوں کے بیرونی معاملات کی اصلاح کے داعی تھے۔ برخلاف اس کے سید کواکبی کی توجہ داخلی سیاست کی طرف مبذول تھی۔ ان کا نظریہ تھا کہ داخلی اصلاح سے کسی اجنبی کو ملکی معاملات میں دخل اندازی کا موقعہ نہیں مل سکتا۔ سید افغانی انقلابی قسم کے مصلح تھے۔ وہ ہمیشہ شعلہ فشاں رہتے۔ کواکبی دھیمے مزاج کے طبیب تھے۔ جو صبر و سکون سے مرض کی تشخیص کرتے تھے اور نسخہ بھی معتدل قسم کا تجویز کرتے تھے۔ سید افغانی جہاد کی دعوت دیتے تھے اور کواکبی تعلیم کی اشاعت کی ان دونوں کے طور طریق کا اختلاف ان کے مزاج کے فرق کی وجہ سے ہے سید جمال الدین نہایت ذہین اور گرم مزاج تھے اور کواکبی سلجھی ہوئی طبیعت اور مزاج کے دھیمے تھے۔ سید جمال الدین میں توپوں کی گھن گرج تھی۔ برخلاف اس کے کواکبی ایسے پانی کی طرح سبک رفتار تھے جو آہستہ آہستہ چٹانوں کو ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔ اگر وہ یورپی زبانیں جانتے ہوتے اور انہوں نے علم الاجتماع میں جدید تحقیقات سے فائدہ اٹھایا ہوتا تو ان کے فکر میں زیادہ گہرائی ہوتی۔ لوگ اخبارات اور رسائل میں ان کے اصلاحی مقالات پڑھتے اور پسند کرتے۔ ادبی مجالس میں ان کا تذکرہ رہتا۔ ۶ ربیع الاول سنہ ۱۳۲۱ھ کو اخبارات میں اچانک ہی ان کی وفات کی خبر شائع ہوئی۔ جسے پڑھ کر ہر اصلاح پسند کو دلی افسوس ہوا اور دوستوں نے گریہ وزاری کی۔ سید عبدالرحمٰن الکواکبی بے حد خلیق۔ بلند مقصد رکھنے والے۔ شستہ زبان اور دل کے صاف تھے اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

شیخ محمد عبدہ

۱۲۶۶ ——————— ۱۳۲۳ھ

۱۸۴۹ ——————— ۱۹۰۵ء

عبقری کی طبقریت کی بنیاد دو عناصر پر ہوتی ہے۔ استعداد فطری یا دوسرے الفاظ میں موروثی طبائع اور خاندانی ماحول اس کی مثال ایسے درخت کی ہے جس کا بیج عمدہ ہو مٹی، ہوا اور پانی اس کو خوب میسر آیا ہو۔ اگر بیج نکما ہو تو اس کے بڑھنے اور پھولنے کی کیا امید رکھی جا سکتی ہے۔ اسی طرح اگر بیج عمدہ ہو اور غذا مناسب نہ ملے تو نتیجہ یکساں رہتا ہے۔

خاندانی اثرات بھی پیچیدہ قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک بچہ اپنے والدین، عزیز و اقربا اور دور کے رشتہ داروں کی طبائع سے کہاں تک متاثر ہوتا ہے اس کا ابھی تک پورا اندازہ نہیں ہو سکا اگرچہ اس فن کے ماہرین بحث و تحقیق کی انتہا تک پہنچ چکے ہیں۔ بہر حال شیخ محمد عبدہ نے خاندانی صفات ورثہ میں پائی تھیں خاندانی ماحول میں ان کی پرورش ہوئی۔ ان کے گھرانے والے ذہانت، خود اعتمادی کے لحاظ سے ممتاز تھے ان صفات کا لازمی نتیجہ بلند نظری اور شفقت سے تھا۔

ان کا باپ ترکمان تھا اور والدہ عرب تھیں۔ ان کا بنی عدی کے قبیلہ سے تعلق تھا۔ ان کے نبوغ اور عبقریت کے لئے یہ سبب بالکل ناکافی ہے۔ کیونکہ ترکمانوں اور عربوں میں ذہین بھی ہوتے ہیں اور غبی بھی عزت مند بھی اور ذلیل بھی۔ جب تک ان کے آباؤ اجداد کے متعلق اچھی طرح پتہ نہ چل سکے کہ وہ کس قسم کے آدمی تھے ہم کوئی حکم نہیں لگا سکتے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی فطرت اس قسم کی تھی۔

بہت سے دہقانوں اور چھوٹے موٹے کاریگروں کے بچے شیخ محمد عبدہ کی طرح خاندانی صفات ورثہ میں پاتے ہیں لیکن وہ گم نام رہ کر اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اگر ان کو بھی شیخ محمد عبدہ کی طرح مساعد ماحول مل جاتا تو وہ بھی نیک نام ہوتے۔ عوام کی حالت ان مدفون جواہرات کی طرح ہے جو کبھی تو ہمیشہ کے لئے پوشیدہ رہ جاتے ہیں اور کبھی کسی کے ہاتھ لگ کر دولت اور امارت کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

ملک کے اجتماعی حالات اور نظام تعلیم و تربیت نے ہمیں مہلت ہی نہیں دی کہ اس قسم کے پوشیدہ خزانہ

کو بر آمد کرنے کی کوشش کرتے ۔ شیخ محمد عبدہ نے ایک گاؤں میں دہقانوں کے بچے کی طرح پرورش پائی۔ ان کے والد ایک متوسط درجہ کے خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے ۔ انہوں نے بچے کو تعلیم کے لئے ایک مکتب میں بٹھایا ۔ اس کے بعد طنطا کی جامع احمدی میں ان کو اعلیٰ تعلیم کے لئے بھیج دیا تا کہ وہ سیکھنے کے بعد قرآن پاک حفظ کر سکیں تجوید کا علم مشکل ہوتا ہے وہ مخارج حروف مقائیس المد، غنہ اور ادغام یاد کرنے لگے درسیات شروع ہو جائیں تو ایک کتاب فقہ اور دوسری نحو کی پڑھنے کو ملی ۔ فقہ کا معاملہ آسان تھا وہ وقت نظری سے وضو اور نماز کے احکام سیکھنے لگے ان مسائل کو وہ عملی طور پر پہلے سیکھ چکے تھے ۔ لیکن نحو کا معاملہ ٹیڑھا تھا اس کی تعلیم آجکل کی تعلیم سے مختلف ہوتی تھی ۔ ہم نحو کی ابتداء کلمہ کی تعریف سے کرتے ہیں ۔ جو اسم ۔ فعل اور حرف پر مشتمل ہوتا ہے اس کے بعد ہر ایک کی خصوصیات بیان ہوتی ہیں لیکن اس زمانہ میں کفراوی کی شرح اجرومیہ پڑھائی جاتی تھی اور پہلا سبق بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی ترکیب سے شروع ہوتا تھا ۔ جس طالب علم نے کبھی اعراب ۔ رفع نصب اور جر کا نام نہ سنا ہو ۔ اس کے لئے یہ ساری تعلیم ناقابل فہم اور مضحکہ خیز تھی ۔ شیخ یوسف مسجد سیدنا حسین رض میں قدوسی تھے ۔ وہ عورتوں کو وعظ و نصیحت کیا کرتے تھے ۔ عورتیں برکت کے لئے ان کے گرد حلقہ باندھ کر بیٹھ جاتیں ۔ وہ کوئی حدیث بیان کر کے اس کی شرح کرتے اور پوچھنے لگتے کہ یہاں مسند الیہ کیوں محذوف ہے ۔ ان کو یاد نہ رہتا کہ ان کی مخاطب ان پڑھ عورتیں ہیں ۔ ان کی تقریر گرجا گھروں کی لاطینی آیات ہو جاتیں یا جمعہ کا خطبہ ان ترکوں کے لئے جو عربی کا ایک حرف نہیں سمجھتے ۔

جامع احمدی اور ازہر میں نحو کی تعلیم اسی ڈھنگ پر ہوتی تھی اللہ تعالیٰ شیخ کفراوی پر اپنی رحمت نازل کرے اگر ان کو معلوم ہوتا کہ وہ یہ کتاب لکھ کر بچوں پر کتنا ظلم کر رہے ہیں تو کبھی ایک حرف نہ لکھتے ۔

اس وقت شیخ محمد عبدہ پندرہ برس کے ہو چکے تھے ۔ وہ ڈیڑھ سال تک بلا سوچے سمجھے اسی تعلیم میں لگے رہے ۔ طالب علموں کی بڑی تعداد اس طرز تعلیم سے اکتا جاتی ہے اور گھبرا کر پڑھنا لکھنا چھوڑ دیتی ہے بعض طالب علم سمجھتے ہیں کہ وہ علم نحو سے اچھی طرح آگاہ ہو رہے ہیں ۔ حالانکہ ان کو خاک بھی پتہ نہیں چلتا ۔

شیخ محمد عبدہ اس صورت حال کو اچھی طرح سمجھ رہے تھے ۔ انہیں خود اعتمادی حاصل تھی ۔ انہوں نے اس ذلت آمیز حالت میں رہنے اور تعلیم حاصل کرنے سے انکار کر دیا ۔ بعد میں انہوں نے ازہر کی اصلاح کا جو بیڑا اٹھایا وہ اسی درس کا رد عمل تھا ۔ اب وہ گھر آ کر کھیتی باڑی میں مصروف ہونا چاہتے تھے

لیکن ان کے والد کا اصرار تھا کہ وہ تعلیم ہی حاصل کریں۔ جب والد نے زیادہ اصرار کیا تو وہ بھاگ کر دوسرے شہر چلے گئے۔ جہاں ان کے عزیزواقارب رہتے تھے۔ اتفاق سے یہاں ان کی ایک صوفی منش بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ یہ بزرگ ان کے والد کے خالو شیخ درویش خضر تھے۔ ان سے ملتے ہی شیخ محمد عبدہٗ کچھ اور سے اور ہو گئے گویا ان پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ بڑے بڑے لوگوں کی زندگی میں اس قسم کے اتفاقی حوادث پیش آتے رہے ہیں اگر شیخ محمد عبدہ گھر سے نکل بھاگتے اور شیخ درویش سے ان کی ملاقات نہ ہوتی تو وہ کسانوں کی طرح گمنام زندگی گذار کر اس جہان سے رخصت ہو جاتے

شیخ خضر کا وجود مستثنیات میں سے تھا۔ میں نے خود اپنی زندگی میں بھی ایسے دو اشخاص دیکھے ہیں۔ ان کو علم کی معرفت سے زیادہ نور بصیرت حاصل ہوتا ہے وہ دنیا کے معاملات سے خوب آگاہ ہوتے ہیں لیکن ان کو کچھ اہمیت نہیں دیتے۔ ان کی بہترین عبادت اللہ تعالیٰ کو دل سے یاد کرنا ہے۔ یہ بزرگ رفق و ملاطفت درگذر اور نیکی سے کام لیتے ہیں۔ دنیا کو آخرت کا پل تصور کرتے ہیں جس پر آہستگی سے گذر جانا چاہیے۔ لوگوں کو غفلت اور دنیاوی لذات میں مدہوش دیکھ کر افسوس کرتے اور ان پر ترس کھاتے ہیں اور ان کی نجات کیلئے کوشاں ہوتے ہیں۔ ان کا نورانی چہرہ ان کے باطنی نور کا پتہ دیتا ہے۔ ان کی زیارت۔ تصرف۔ حرکات اور سکنات سے دل ان کی طرف کھنچتا ہے اور عجیب قسم کی لذت اور محبت محسوس کرتا ہے۔

شیخ محمد عبدہ ان سے مل کر بالکل بدل ہی گئے۔ یہ کوئی جادو کا کرشمہ یا آسمانی معجزہ نہ تھا بلکہ طبعی چیز تھی ان کا اعتقاد تھا کہ جو چیز سمجھ میں نہیں آتی اس پر جمے رہنے سے کیا فائدہ ہوگا۔ شیخ درویش نے ان کی الجھن اس طرح دور کی کہ ان کو اخلاق و مواعظ کی آسان کتاب پڑھنے کے لئے عطا کی۔ شیخ محمد عبدہ پڑھتے جاتے تھے اور شیخ درویش اس کی شرح کرتے جاتے تھے اس سے عدم فہم کی گرہیں کھلنے لگیں اور شیخ محمد عبدہ کو اطمینان ہوا کہ وہ کتاب سمجھ سکتے ہیں

شیخ درویش نے شیخ محمد عبدہ کو دوسرا سبق پڑھایا یہ اقدار کا درس تھا۔ اس سے پیشتر وہ لوگوں کی قدر و منزلت کا اندازہ ان کے مال و جاہ۔ زینت و تفاخر اور مال و دولت کی کثرت سے لگاتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ایک مسلمان کلمہ شہادت پڑھنے کے بعد تمام لوگوں کا سردار بن جاتا ہے۔ چاہے وہ کھل

کر بداعمالیاں کرتا جائے مبادا آخر اس کا ٹھکانا جنت ہوگا۔ شیخ درویش نے واضح کیا کہ اصل چیز تو عمل صالح ہے۔ نہ کہ مال وجاہ۔ اسلام پردہ نہیں ہے کہ اس کی آڑ میں جرائم کا ارتکاب کیا جائے اسلام عقیدہ اور عمل کا نام ہے نہ کہ چند رسمی الفاظ جو صرف منہ سے نکال دیئے جاتے ہیں۔ غیروں کی طرح مسلمانوں کے اعمال کی بھی پرسش ہوگی۔ بہت سے لوگ نام کے مسلمان ہیں۔ تعلیمات فاسدہ کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلام اور صحیح عقیدہ کی بنیاد صرف قرآن پر ہے اور بہترین عبادت فہم قرآن ہے۔

شیخ درویش۔ شیخ سنوسی کی تعلیمات سے متأثر تھے جو وہابیوں کی طرح سادہ اور اصل اسلام کی طرف دعوت دیتے تھے۔ انہوں نے طرابلس الغرب کا سفر بھی کیا تھا اور سنوسی کے مریدوں کی صحبت اٹھائی تھی۔

سات دنوں میں محمد عبدہ بالکل بدل گئے۔ وہ زراعت اور کھیل کو چھوڑ کر صفائی باطن اور علم کی تحصیل کی دھن میں لگ گئے تاکہ فہم قرآن سے لذت یاب ہوکر خود بھی ہدایت پائیں اور لوگوں کو بھی صحیح راستہ دکھائیں۔

اب وہ دوبارہ والد کے حکم کی تعمیل اور اپنے شوق سے جامع احمدی چلے آئے۔ اس دفعہ شیخ خالد کی شرح اجرومیہ درس میں داخل تھی۔ سوء انتظام سے یہ آسان کتاب شیخ کفراوی کی کتاب کے بعد پڑھائی جاتی تھی۔ اب استاد بھی دوسرا تھا جو مشکل مقامات اچھی طرح سمجھا دیتا تھا۔

سبق شروع ہونے سے پہلے شیخ محمد عبدہ بعض ہم سبقوں کو پڑھا دیتے تھے اس سے ان میں خود اعتمادی پیدا ہوئی اور وہ اس کام میں لگے رہے۔

شیخ درویش کے پاس انہوں نے جو سات دن گذارے تھے وہ بعد کے اصلاحی پروگرام کا پیش خیمہ تھے۔ انہوں نے قرآن پاک کی تفسیر کا اہتمام کیا اس کو اپنی دعوتی اصلاح کی بنیاد قرار دیا۔ اسلامی عقیدہ کو بدعت سے صاف کیا۔ متصوفانہ زندگی اختیار کی حال دودست سے کچھ سروکار نہ رکھا۔ مسلمانوں کی اصلاح کا ہر دم دھیان رکھا گویا کہ یہ سات دن آئندہ کارناموں کے بیج تھے جنہوں

سفے ظروف و احوال کی مساعدت سے خوب پرورش پائی تھی۔ شیخ محمد عبدہ جامع احمدی سے جامع ازہر چلے آئے۔ جامعہ ازہر کی درسگاہ دینی مدارس میں سرکردہ شمار کی جاتی تھی۔ یہاں تعلیم کا تمام تر بوجھ طالب علم کے سر رہتا تھا۔ کوئی دوسرا ذمہ دار نہ بنتا۔ طالب علم مدرسہ کے رجسٹر میں نام درج کرا دیتا اس کے بعد جو کچھ چاہتا پڑھتا رہتا۔ اس کو اختیار تھا کہ جس استاد کی چاہے شاگردی اختیار کر سکتا ہے۔ پھر چاہے وہ حاضر ہو یا غیر حاضر۔ اسباق اس کی سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں کوئی پوچھنے والا نہ ہوتا۔ یہ اسلوب تعلیم خواص کے لئے تو مفید ہو سکتا ہے مگر عوام کے لئے مضر ہے۔

طالب علموں کی رہائش کے لئے حجرے تھے۔ ایک حجرے میں ایک سے زیادہ طالب علم مقیم رہتے۔ حجرہ میں ان کا اسباب بھی رکھا رہتا۔ زمین پر چٹائی ہوتی اور کپڑوں کا صندوق ...... رات کو بستر فرش پر پھیلا دیا جاتا اور دن کو لپیٹ کر رکھ دیا جاتا۔ ایک چولہا بھی تھا جس سے کبھی کبھار کام لیا جاتا۔ کبھی کبھی گھر سے روٹی پنیر اور گھی آ جاتا کبھی کبھار مرغی بھی آ جاتی۔ بس یہی اسکی دنیا تھی۔

محنتی طالب علم فجر کی اذان ہوتے ہی جاگ اٹھتا اور نماز صبح سے فارغ ہو کر فقہ کے درس میں شامل ہونے کے لئے ازہر چلا جاتا۔ یہ سبق چاشت تک جاری رہتا۔ استاد کرسی پر بیٹھتا طالبعلم حلقہ باندھ کر چٹائیوں پر اسے گھیرے فرش پر بیٹھ جاتے۔ بعض شاگرد چوکیوں پر بیٹھتے۔ استاد جملہ پڑھ کر اس کی تشریح کرتا۔ طلبہ غور سے سنتے اور اعتراض کرتے استاد ان کا جواب دیتا اور کبھی کبھار غیض و غضب میں آ کر طعن و تشنیع بھی کرتا۔ اس کے بعد دوسرے فقرے کی باری آتی۔ بعض دفعہ ایک ایک سطر پر دو دو تین تین گھنٹے صرف ہو جاتے۔ آخر میں استاد واللہ اعلم کہہ کر سبق ختم کر دیتا اور طلبہ کھانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے۔ ان کے لئے روٹیاں مقرر تھیں وہ روٹیاں لے کر ازہر کے میدان میں نکل جاتے اور وہاں سالن یا سبزی وغیرہ لے لیتے۔ بڑے طالبعلم چھوٹوں کو کام پر بھیج دیتے۔ طالب علم اگر نادار ہوتا تو کچھ روٹیوں کے عوض سالن لے لیتا۔ خوشحال طالب علم روغن زیتون اور پنیر وغیرہ لے آتے تھے۔ ازہر میں دستر خوان بچھ جاتے اور طالب علم گھیرا باندھ کر مزے سے کھانا تناول کرتے۔

کھانے سے فارغ ہو کر محنتی طالب علم نحو کے اسباق کی تیاری میں لگ جاتے۔ اس سے فراغت

پاتے تو نماز ظہر کا وقت ہو جاتا نماز پڑھ کر نحو کا درس ہوتا اور نماز عصر تک جاری رہتا۔

تھوڑی سی استراحت کے بعد فقہ کے اسباق کا مطالعہ کیا جاتا اس کے بعد رات پڑ جاتی۔ اور طالب علم اپنے کمرہ میں چلا آتا۔ رات کو مطالعہ کے لئے مٹی کے تیل کا دیا ہوتا اس وقت لالٹین کا رواج نہ تھا اس سے دھواں خوب نکلتا طالب علم نادار ہوتے تو تیل کا خرچ بانٹ لیتے تھے۔ ہر ایک کے ذمہ ایک رات یا ایک ہفتہ کے تیل کا خرچ ہوتا۔ حلباوی نے لکھا ہے کہ وہ ایک ہم سبق سے لڑ پڑے تھے کیونکہ اس نے تیل کی قیمت ادا نہیں کی تھی۔

طالب علم ایک کتاب کے بعد دوسری کتاب پڑھتا ہر سال فقہ اور نحو کی ایک ایک کتاب داخل درس رہتی۔ کتاب بڑی ہوتی تو ایک سال سے زیادہ عرصہ لگ جاتا۔ متن کتاب کی شرح ہوتی۔ شرح کا حاشیہ ہوتا اور حاشیہ پر تقریر ہوتی۔ استاد ان سب کو طلبہ کے سوالات کا جواب دینے کے لئے پڑھتا۔ استاد کتاب کا متن پڑھتا اور جو کچھ از قسم شرح یا حاشیہ لکھا ہوتا اس کی تشریح کرتا اور مسئلہ کی مخالفت یا حمایت میں مناقشہ کرتا۔ اس طرح درسی معرکہ ختم ہو جاتا۔

کتب فقہ ختم ہو جاتیں تو ان کی جگہ اصول فقہ کی کتابیں لے لیتیں۔ اسی طرح نحو کی کتابیں ہو چکتیں تو بلاغت کی کتابیں شروع کر دی جاتیں۔ ان اسباق کے علاوہ بڑے طالبعلم صبح و شام تفسیر۔ حدیث اور منطق کے درس میں شمولیت کرتے۔ اکثر اوقات حلقہ کی کسی جگہ پر قبضہ کرنے کے لئے طالب علموں میں جھگڑا اور فساد ہوتا۔ شور و غوغا ہوتا۔ مار دھاڑ کی نوبت آجاتی ہر علاقہ کے طالبعلم اپنے اپنے وطن کے طالب علم کی حمایت کرتے اور اس جھگڑے کو ختم کرنے کیلئے ازہر کی فوج کو مداخلت کرنی پڑتی ازہر کے صحن میں روٹیاں دھوپ میں سکھانے کیلئے پھیلا دی جاتیں تاکہ ان میں تعفن نہ پیدا ہو جائے کپڑے بھی وہیں دھوئے جاتے۔ حلقہ درس میں تندرست اور مریض گندے اور ستھرے طالبعلم پاس پاس بیٹھتے۔ طبیب سے مشورے کا کسی کو خیال تک نہ آتا۔ اس ماحول میں کسی مدرس کو طلبہ کو اخلاق پر ابھارنے اور رذائل سے روکنے کا شاذ و نادر ہی خیال آتا۔

ازہر کے نصاب تعلیم میں جتنی کتابیں داخل درس تھیں۔ وہ سب متاخرین کے نتائج طبع کا

نتیجہ تھیں۔ بمرورِ زمانہ سے وہ بے روح ہو چکی تھیں اب ان کی نری شکل باقی تھی۔ نحو کی تعلیم سے مراد صحیح بول چال۔ درست انشاء پردازی اور کتب ادبیہ کا صحیح فہم تھا لیکن اب اس علم کا مقصد مؤلفین کے الفاظ کی گرہ کشائی رہ گیا تھا

اصول فقہ کی تعلیم کا مقصد شریعت میں اجتہاد کی مشق تھا لیکن اب نہ اجتہاد رہا تھا نہ شریعت۔ علم بلاغت کی تعلیم جو کلام میں زور فصاحت و بلاغت کے لئے دی جاتی تھی۔ اب وہ سعد تفتازانی کی طرح عجمی مصنفوں کی بازی گاہ بن گئی تھی جو خود عربی اسلوب بیان کے مطابق اظہار خیال نہ کر سکتے تھے۔ شیخ احمد رفاعی بلاغت کی سب سے بڑی کتاب مطوّل کا درس دیتے تھے لیکن خود خط بھی نہ لکھ سکتے تھے وہ انشاء پردازی کو سرکاری مدارس کے طلبہ کا کام سمجھتے تھے۔ اس زمانہ میں شیخ احمد الرفاعی کا بڑا شہرہ تھا۔ ان کی شہرت کی بنیاد یہ تھی کہ وہ کتابوں کو اچھی طرح سے سمجھتے تھے۔ فقروں کی ترکیب کر سکتے تھے۔ شبہات پیدا کرنے میں انہیں کمال حاصل تھا۔ وہ آسان کو پیچیدہ اور صاف کو مبہم بنا دیتے تھے۔ دوسرے شیخ عیش جو مغرب (مراکش) کے رہنے والے تھے۔ ان کی شہرت ان کی دین داری اور تنگ نظری کے سبب تھی۔ وہ معمولی سبب پر لوگوں پر کفر کا فتویٰ لگا دیا کرتے تھے۔ دوسرے علماء بھی تھے۔ جو ظروف و احوال کے طفیل دنیاوی معاملات اور جدید تہذیب و تمدن سے شناسا ہو چکے تھے۔ ان کا ذہنی افق وسیع تھا۔ ان میں شیخ البسیونی بھی تھے جو شکل و شباہت اور لباس وغیرہ میں ندرت آمیز تھے۔ دوسرے شیخ حسن الطویل تھے یہ نہایت ذہین اور بااور سمجھدار تھے۔ زندگی کے بارے میں ان کے نظریات درست ہوتے تھے۔ فلسفہ پڑھاتے تھے اور زندیق سمجھے جاتے تھے۔

یہ تھی ازہر کی ساری کائنات جس میں محمد عبدہ تعلیم پا رہے تھے۔ اس تعلیم کا مدار لفظی بحث پر تھا۔ طالب علم کو گہری سمجھ اور حجت بازی حاصل ہوتی تھی۔ یہ تو اس تعلیم کی خوبیاں تھیں۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ طالب علم کو حواشی اور شروح سے احتمال آفرینی کی عادت پڑ جاتی تھی اور وہ ناممکن کو ممکن ثابت کر سکتے تھے۔ شیخ محمد عبدہ کے قول کے مطابق ایک طالب علم تحصیل علم سے فارغ ہو کر بعض کتابیں سمجھ سکتا تھا لیکن وہ دنیا اور اس کے معاملات کے بارے میں جاہل ہوتا۔ وہ جغرافیہ۔ تاریخ

علوم طبیعی۔ کیمیا اور ریاضی سے کورا ہوتا۔ کیونکہ یہ علوم تمام تر دنیاوی تھے جن سے دین کا کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن سرکاری مناصب کے لئے خوب کشمکش رہا کرتی۔ جو چیز حد مالوف سے نکلی ہوتی وہ کفر، حرام یا مکروہ سمجھی جاتی۔ جغرافیہ۔ فزکس اور فلسفہ کی کتابوں کا پڑھنا حرام تھا۔ بوٹوں کا پہننا بدعت تھا۔ اگر کوئی نیک آدمی اصلاح کا بیڑہ اٹھاتا تو اس کی دعوتِ اصلاح کا گلا گھونٹ دیا جاتا اور اس پر زندقہ کا فتویٰ جڑ دیا جاتا۔ اس ماحول میں جامد شخصیتیں ہی پیدا ہو سکتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بیرونی اسباب کی بنا پر کچھ مستثنیٰ شخصیتیں بھی تھیں۔ شیخ محمد عبدہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے ان اثرات سے اپنے آپ کو پاک کرنا چاہا لیکن خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی۔ مقام تاسف ہے کہ بعض ارباب حل و عقد ازہر کے نقائص سے آگاہ تھے اور اس کی اصلاح کے آرزومند تھے لیکن علماء کے خوف اور عوام کی مخالفت سے وہ کچھ نہ کر سکے۔ اس کے مقابل انہوں نے جدید مدارس قائم کر دیئے جس کے انتظام و انصرام میں وہ بالکل آزاد تھے۔ اس ماحول میں شیخ محمد عبدہ نے بارہ سال گذارے اور ازہر سے عالمیت کی سند حاصل کی۔

اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں تین درخشاں ستارے بھی تھے۔ یہ شیخ درویش۔ شیخ حسن الطویل اور سید جمال الدین افغانی تھے۔ شیخ محمد عبدہ ہر سال شعبان اور رمضان کی تعطیلات میں شیخ درویش کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ تصوف اور عقائد کی تعلیم حاصل کرتے اور ازہر کی پڑھائی کے متعلق خیالات ظاہر کرتے۔ اور شیخ درویش کے ملاحظات اور ارشادات کو بغور سنتے۔ شیخ درویش نے انہیں دو سبق متعلق نہ یئے تھے ایک تو انہیں عزلت گزینی اور لوگوں کی اصلاح کو چھوڑ کر اپنی روحانیت کی تکمیل پر سرزنش کی تھی۔ دوسرے انہیں لوگوں سے میل جوڑ بڑھانے اور وعظ و نصیحت کی اہمیت بتائی تھی۔ صاحب محمد عبدہ عوام کو خیر خواہی کی دعوت دینے لگے۔ اس مقصد کے لئے وہ تمام عمر مصروف عمل رہے۔ سید جمال الدین نے اس تعلیم پر یہ اضافہ کیا تھا کہ دعوت میں موضوعات کلام کو کس طرح منتخب کیا جاتا ہے۔ دوسرے انہیں شیخ درویش نے سمجھایا کہ سب علوم قابل تعلیم ہوتے ہیں۔ سحر اور شعبدہ بازی کو چھوڑ کر تمام علوم تحصیل کے قابل ہوتے ہیں۔ منطق۔ فلسفہ۔ ریاضیات کے علوم

حرام نہیں ہیں۔ بلکہ ان کا پڑھنا طالب علم پر واجب ہے۔ اب جب شیخ محمد عبدہ ازہر واپس آئے تو انہیں نئے ذوق کی تسکین کا سامان شیخ حسن الطویل کے پاس ملا۔ ان کی شخصیت بھی عجائب روزگار تھی وہ بے حد فہین وفطین تھے۔ ریاضیات کے ماہر تھے حتیٰ کہ دارالعلوم کے طلبہ کو علم ہندسہ میں جو اشکال پیش آتے تھے وہ ان سے مل کر حل کرتے تھے۔ وہ فلسفہ قدیم سے اشتغال رکھتے تھے۔ مصطلحات کے عالم تھے۔ دنیا اور سیاست کے کاروبار کی معرفت رکھتے تھے۔ جو سچ سمجھتے برملا کہہ دیتے خواہ انہیں ملازمت ہی سے ہاتھ دھونے پڑیں۔ ان کو کبھی دنیادی چیز کی فکر نہ تھی۔ معمولی کپڑے کی قفطان اور جبہ پہنتے۔ ایک دفعہ انہیں کہا گیا کہ علی مبارک کل دارالعلوم کا معائنہ کرنے آئیں گے آپ ذرا اچھے کپڑے پہن کر آئیں جواب دیا کہ میں پشمینہ کا جبہ اور ریشمی قفطان دارالعلوم میں بھیج دونگا۔ اگر ان کو حسن الطویل سے ملنا ہو گا تو وہ انہیں کپڑوں میں ملیں گے۔ امرا انہیں رمضان میں افطاری پر مدعو کرتے دستر خوان پر پرتکلف کھانے ہوتے لیکن وہ معمولی کھانا اور تناول کرتے۔ سیاست میں حصہ لینے پر ایک دفعہ دارالعلوم سے نکالے گئے تھے۔ ایک قہوہ خانہ کا مالک ان کا خرچ اٹھاتا رہا۔ جب وہ ملازمت پہ بحال ہو گئے تو سارا خرچ ادا کر دیا۔ ازہر میں فلسفہ اور منطق کا درس دیتے تھے اور چیدہ طلبہ محمد عبدہ کی طرح ان کے درس میں شرکت کرتے تھے ان کو اور ان کے تلامذہ کو زندقہ کا الزام دیا جاتا تھا۔

شیخ حسن الطویل کی مجالس درس سے شیخ محمد عبدہ نے شوقِ علم میں اضافہ ہوا۔ لیکن علمی غذا سیّد جمال الدین افغانی کے فیضِ صحبت سے ملی۔ ان کے فیضِ ذہنی افق میں وسعت پیدا ہوئی اور انکے ذوق کو تسکین حاصل ہوئی۔

O

سیّد جمال الدین فہم و ذکاء کا شعلہ جوالہ اور بڑی طاقت ور شخصیت کے مالک تھے ان کی طبیعت سیمابی تھی۔ وہ دوسروں کو بھی گرماتے رہتے۔ ان کی کہربائی شخصیت سے ہر شخص بقدرِ استعداد

فیض یاب ہو سکتا تھا۔ سدا غور و فکر میں ڈوبے رہتے۔ اپنے افکار کی تبلیغ میں لگے رہتے۔ چاہے کوئی سمجھتا یا نہ سمجھتا۔ حقوق کے مطالبات کے سخت حامی تھے۔ جہاں چلے جاتے اضطراب اور ہیجان کی آگ لگا دیتے۔ عوام اپنے حقوق مانگتے اور حکومتیں پریشان ہوتیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک نصب العین متعین کر رکھا تھا اس کی تکمیل ساری عمر ان کے پیش نظر رہی وہ اسلامی ممالک کو بام رفعت پر پہنچانا چاہتے تھے۔ عوام کو ان کے حقوق سے آگاہ کرتے تھے۔ اجنبی تسلط سے مسلمان ملکوں کو آزاد کرانا چاہتے تھے

حاکم اور محکوم کے فرائض و واجبات کی حد بندی کرتے تھے اور تمام اسلامی ممالک کا خلافت عثمانیہ سے رشتہ استوار کرنا چاہتے تھے۔ اس نصب العین کے پیش نظر وہ چیدہ چیدہ اصحاب میں روشن خیالی پیدا کرتے تاکہ وہ اپنے موقف سے شناسا ہو کر بیرونی غاصبوں اور ظالم حکام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ ان کے ذمہ یہ کام لگا دیا جاتا کہ اخبارات اور رسائل میں مضامین محافل میں خطبات اور عام مجالس میں بات چیت کے ذریعہ رائے عامہ استوار کریں۔ یہ مقالات اور خطبات جتنے آتش فشاں اور بلند آہنگ ہوتے۔ اتنے زیادہ قابل ستائش اور مناسب حال خیال کیے جاتے۔ مصر میں محمد عبدہ۔ سعد زغلول۔ ابراہیم اللقانی اور ابراہیم الھلباوی ان کے صحبت یافتہ تھے۔ ان کی خاص مجالس کے ندیم محمود سامی البارودی۔ ابراہیم المویلحی اور ادیب اسحاق وغیرہم تھے۔ گھر میں سید افغانی علوم کا درس دیتے۔ قہوہ خانوں میں جہاں ملنے جلنے والے آ نکلتے تھے۔ سیاست اور اجتماع پر اظہار خیال کرتے۔

سب سے زیادہ ان کے منظور نظر محمد عبدہٗ تھے۔ سید جمال الدین نے ان میں ذکاوت حسن استعداد۔ قلبی پاکیزگی اور اصلاح کی گرمی محسوس کی تھی۔ محمد عبدہ نے اپنے استاذ سید جمال الدین میں وسعت عقل۔ صحت ارشاد۔ عالی نفسی اور نصب العین کی پاکیزگی اور بلندی دیکھی تھی جو اور ہیں مفقود تھی۔

جو کتابیں محمد عبدہ نے سید جمال الدین سے پڑھیں وہ قدر و قیمت میں کچھ زیادہ نہ تھیں۔ ان

جیسی کتابیں وہ شیخ حسن الطویل سے پڑھ چکے تھے لیکن یہاں کتاب کی اہمیت نہ تھی بلکہ شارح کی تھی۔ ایک ماہر استاد تقریر کے وقت اپنی تعلیمات سے چیونٹیوں اور درختوں کو بھی شناسا کر سکتا ہے۔ وہ ایک ایک فقرے کو تمام عالم میں پھیلا سکتا ہے۔

محمد عبدہ نے سید افغانی سے دنیاوی معاملات کے بارے میں بصیرت بھی پائی۔ ان کے فیض صحبت سے نظری تصوف کو چھوڑ کر عملی تصوف اختیار کیا۔ قوم کی خدمت کا بے پناہ جذبہ پایا۔ دینی، خلقی اور اجتماعی اصلاح کا شوق اور رغبت پیدا ہوئی۔ عوام تک پہنچنے کے لئے اخبارات میں مضامین نویسی کی لگن لگی۔

ہم ذوقی اور وحدت غرض نے دونوں کو محبت کے رشتہ سے مربوط کر دیا تھا۔ شیخ محمد عبدہ استاد کو جلالت نظر سے محبوب رکھتے تھے۔ سید جمال الدین بھی ہر طرح ان کا خیال رکھتے اور اپنا خلیفہ اور جانشین سمجھتے۔ دونوں غیرت مند۔ بلند حوصلہ اور باعظمت تھے اس وحدت خیال نے دوستی اور یگانگت کو اور پختہ کر دیا تھا دونوں عوام کی سطح سے اونچے تھے لیکن تکبر نام کو نہ تھا۔ ہر ایک سے محبت اور ملاطفت سے پیش آتے تھے محمد عبدہ کہا کرتے تھے کہ سید جمال الدین نے مجھے انبیاء اولیاء اور صدیقین کی زندگی سے شناسائی کا ذوق بخشا۔

بالآخر شیخ محمد عبدہ نے ازہر سے سند عالمیت حاصل کر کے ازہر میں پڑھانا شروع کر دیا۔ اس کے بعد مدرسۃ العلوم اور مدرسۃ الالسنۃ میں بھی تعلیم دیتے رہے۔

وہ نحو اور فقہ کی تعلیم دوسرے مشائخ کی طرح نہ دیتے تھے۔ ان علوم کی تعلیم ازہر میں علوم عقلیہ کی طرح دی جاتی تھی۔ برخلاف اس کے شیخ محمد عبدہ ان علوم سے انسانی عقل کی تربیت کرتے تھے۔ کون و مکان سے شناسا کرتے تھے اور اخلاق کو مہذب بناتے تھے۔ ازہر میں منطق، فلسفہ اور توحید کا درس دیتے تھے اور گھر میں ابن مسکویہ کی تہذیب اخلاق بعض طلبہ کو پڑھایا کرتے تھے۔ ایک فرانسیسی مصنف فرانسوا جیزو نے یورپ اور فرانس کے تمدن کی تاریخ لکھی تھی جسے نعمت اللہ فوری نے اس کا عربی میں ترجمہ "التحفۃ الادبیہ فی تاریخ تمدن الممالک الاوربیہ" کے نام سے کیا تھا۔ شیخ

محمد عبدہ اس کا بھی درس دیتے تھے۔

دار العلوم میں تاریخ کے استاد مقرر ہوئے تو طبری اور ابن الاثیر کا خلاصہ پڑھانے کی بجائے مقدمہ ابن خلدون پڑھاتے۔ شاگردوں کے لئے ایک کتاب بعنوان علم الاجتماع ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بھی لکھی لیکن یہ ضائع ہوگئی۔ اخبارات خاص کر الاہرام میں خلقی اور اجتماعی اصلاح کے بارے میں مضامین لکھا کرتے تھے۔

خدیو اسماعیل کے آخری عہد میں مصر اضطراب اور انتشار کا شکار تھا۔ ملک مقروض ہو چکا تھا۔ مالی نگرانی کے بہانے یورپی طاقتیں داخلی معاملات میں دخل دے رہی تھیں۔ اس وقت رائے عامہ بیدار نہ تھی۔ ان میں کسی حاکم کے فیصلہ پر نقد و تبصرہ کی جرأت نہ تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کا کام اطاعت اور فرمانبرداری ہے۔ قومی شعور کے فقدان کے پیش نظر بعض سمجھدار اصحاب کو اخبار کے اجرا کا خیال آیا۔ خدیو اسماعیل پاشا سید جمال الدین افغانی اور ریاض پاشا نے اس اقدام کی حوصلہ افزائی کی۔ خدیو اسماعیل کا خیال تھا۔ کہ اخبارات کو اجنبی مداخلت پر جرأت اور ہمت سے اظہار رائے کرنا چاہیے لیکن شخصیات پر کیچڑ اچھالنے کی اجازت نہ تھی اس کے لئے سخت سزا مقرر تھی۔ الاہرام نے سرکاری خزانہ میں غبن کی خبر شائع کی تھی جس کا پتہ نہ چل سکا تو اس کے ایڈیٹر کو سخت سزا ہوئی۔ یعقوب قنوع نے خدیو کے بعض اعمال پر کڑی نکتہ چینی کی تھی اس کو ملک سے باہر نکال دیا گیا۔ ریاض پاشا مالی معاملات کی تنظیم کا خواہاں تھا۔ وہ قوم کو مہذب اور علوم و فنون کو فروغ دینا چاہتا تھا۔ ملک جن خطرات میں گھرا ہوا تھا ان کا اس کو صحیح اندازہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اخبارات کی تنقید اور رائے عامہ کی بیداری اس خطرے کو دفع کر سکے گی۔ ان حالات کی بنا پر سید جمال الدین اور ان کی جماعت مقالہ نویسی پر آمادہ ہوگئے۔ ان میں نوجوانوں کو انشا پردازی کی تربیت دی گئی تھی۔

سید جمال الدین مصریوں کی بدحالی اور جمود سے بہت متاثر تھے۔ وہ ان میں انقلابی روح پھونکنا چاہتے تھے۔ اصلاح حال کی اخبار نویسی سے توقع رکھی جا سکتی تھی وہ فلسفہ کے درس کی آڑ میں بغاوت انگیز خیالات پھیلاتے اور نوجوانوں کو صحافی بننے کی تربیت دیتے۔

محمد عبدہ سید جمال الدین کی ملاقات کے بعد الاہرام میں مختلف عنوانوں پر مضامین لکھنے لگے۔ ان مضامین کے مطالعہ سے پتہ چلتا تھا کہ وہ مشرقی فلسفہ کی کتابوں سے متاثر تھے اصلاح کا شوق رکھتے تھے۔ یہ باتیں نیک مستقبل کی خوشخبری دیتی تھیں اگرچہ اسلوب بیان زور دار اور بلاغت آمیز نہ تھا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد انہوں نے صحافت کی طرف پوری توجہ دینی شروع کی تھی۔ خدیو کی معزولی کے بعد توفیق پاشا خدیو بنے تھے۔ سید جمال الدین کو مصر سے باہر نکالا جا چکا تھا۔ اب ریاض پاشا صدر اعظم تھے اور سلطنت کی مالی اور تعلیمی معاملات کی تنظیم کر رہے تھے۔ وہ ہر ادبی تحریک کے ممد و معاون تھے۔ ان کی حوصلہ افزائی سے بطرس البستانی نے دائرۃ المعارف شائع کیا ان کی سفارش سے خدیو نے بطرس البستانی کی مالی امداد کی ۔المقتطف والوں اور شبلی شمیل نے مرض سل کے جدید طریقۂ علاج کے مطالعہ کی غرض سے یورپ کا سفر کیا تو اس کو خاطر خواہ مالی مدد دی ۔

انہوں نے الوقائع المصریہ کی اصلاح کی جانب بھی توجہ دی ۔ یہ کام انہوں نے شیخ محمد عبدہ کے سپرد کیا اور انہوں نے سعد زغلول۔ شیخ عبدالکریم سلمان۔ ابراہیم الہلباوی۔ شیخ محمد خلیل اور سید وفا کو بھی شامل کر لیا۔ اب سرکاری خبروں کے علاوہ الوقائع المصریہ میں ادبی۔ اجتماعی اور اصلاحی مقالات بھی شائع ہونے لگے۔ محرر اول شیخ محمد عبدہ تھے وہ اٹھارہ سال تک اخبار چلاتے رہے اس کام میں ان کی مضبوط شخصیت پوری طرح ظاہر ہوئی۔ انہوں نے اخبار سے دعوتِ اصلاح کا کام خوب لیا۔ حکومت نے تمام شعبوں کے سربراہوں کو لکھا تھا کہ تمام اہم خبریں چھپنے کے لئے بھیجی جایا کریں، اس میں ہر طرح کے احکام چھپتے تھے۔ شیخ محمد عبدہ کو اجازت تھی کہ وہ حکومت کے تمام محکموں حتیٰ کہ وزارت داخلہ کے احکامات پر تنقید و تبصرہ کر سکتے تھے مختصر طور پر وہ حکومت کے تمام کاموں کی نگرانی کرتے تھے۔ اخبارات کی زبان کی اصلاح بھی ان سے متعلق تھی یہ کام ریاض پاشا کے دل پسند تھا کیونکہ اس سے وہ تمام اخبارات پر کنٹرول کر سکتے تھے۔ شیخ محمد عبدہ

نے اس زمانہ میں بے شمار مقالات لکھے تھے اہم ترین مقالات وزارت تعلیم اور اس کے اعمال کے نقد پر تھے۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ گورنمنٹ نے مجلس الاعلیٰ قائم کر دی۔ اور وہ اس کے ممبر بنا دیئے گئے۔ بعض مقالات عادات اجتماعیہ۔ دینیہ۔ نظام شوریٰ کی وضاحت اور مصر سے اس کی مناسبت پر ہوتے کبھی کبھی اشارتاً ریاض پاشا کی وزارت کی تائید اور مدح سرائی بھی ہوتی۔

حقیقت میں ریاض پاشا کی وزارت نے قوم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ مؤید اور معارض۔ کوئی معارض تو سچائی کیوجہ سے تھا اور کوئی باطل کیوجہ سے۔ ریاض پاشا دھیرے دھیرے مصر کی اصلاح چاہتے تھے ان کا اعتقاد تھا کہ مصریوں کی حالت قابل رحم ہے۔ ان کو ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی وہ ظالم اور جابر بھی تھے۔ ان کے غصہ سے ان کے قریب بیٹھنے والے بھی کانپ اٹھتے تھے۔ نتائج سے بے پرواہ ہو کر حکم دیا کرتے۔ وہ انگریزوں اور فرانسیسیوں سے موالات اور افہام و تفہیم کے قائل تھے۔

بہت سے گروہ ان کے مخالف بھی ہو گئے تھے۔ کوئی ان کے بے جا اسراف کو ناپسند کرتا تھا۔ اور کوئی ان کی اغیار پرستی کو۔ انہوں نے کوڑے کی سزا بھی موقوف کر دی تھی۔ مخالف انہیں ریاضتوں بروزن گگیڈ سٹون کہتے۔ بعض انہیں رجعت پسند بھی کہہ دیتے تھے۔ لوگ جانتے تھے کہ توفیق پاشا کی ان سے ان بن رہتی ہے کیونکہ وہ اس کی اغراض اور تصرفات کی مخالفت کیا کرتے تھے۔ اس سے لوگوں کو شہ ملی اور انہوں نے اخبار میں ان پر سب و شتم کا سلسلہ شروع کر دیا حالانکہ وہ اس سے قبل ان اخبارات کے سرپرست اور مؤید رہ چکے تھے۔

اس طرح عرابی پاشا کی بغاوت بار آور ہونے لگی۔ اتفاق سے شیخ محمد عبدہ الوقائع المصریہ اور ادارۃ المطبوعات کے ڈائریکٹر تھے۔ اب وہ بھی بعض لوگوں کی ناراضگی کا نشانہ بنے ہوئے تھے حالانکہ وہ لکھنے اور اظہار خیال میں آزاد تھے۔ لیکن چونکہ ریاض پاشا سید جمال الدین افغانی اور ان کے محسن تھے اور پھر ملازمت کی قیود بھی تھیں اس لئے وہ بعض مسائل کے اظہار میں آزاد

نہ تھے۔ اس کے بعد عرابی پاشا کی بغاوت کا واقعہ پیش آیا

ہر جماعت میں دو طرح کے راہنما ہوتے ہیں۔ ایک تو دھیرے دھیرے کام کرتے ہیں۔ نرمی اور احتیاط کو مد نظر رکھتے ہیں۔ سبب اور مسبب کے قانون پر ایمان رکھتے ہیں۔ دوسری طرف وہ لوگ ہوتے ہیں جو عقل کا حکم مانتے ہیں ان میں بھی بعض آتش مزاج ہوتے ہیں جو جذبات سے کام لیتے ہیں ان کو احرار کہتے ہیں۔ ان کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک دایاں بازو اور دوسرا بایاں بازو۔ نام خواہ کتنے رکھ لئے جائیں لیکن مطلب ایک ہی رہتا ہے۔ توفیق پاشا کے اول عہد میں یہ دونوں طبقے پائے جاتے تھے۔ دونوں ملک کی بدحالی پر نوحہ کناں تھے۔ کسان مصیبت زدہ۔ جاہل اور مفلوک تھا۔ قرضہ کی حفاظت کے بہانے انگریز اور فرانسیسی اندرونی معاملات میں دخیل تھے۔ حکومت کے محکموں میں رشوت کی گرم بازاری تھی۔ چرکسیوں کو مصریوں پر ترجیح حاصل تھی۔ سواد اعظم کی کوئی رائے نہ تھی وہ ظلم کے بوجھ سے دبے ہوئے تھے اور حقوق و مطالبات سے ناآشنا تھے۔ اب سب طبیب مرض کی تشخیص میں متفق تھے لیکن طریق علاج میں مختلف الرائے تھے۔

سلامتی پسند فریق تعلیم کی نشر و اشاعت سے قوم کے درد کا مداوا کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ وہ اپنے حقوق و واجبات سے خبردار ہو سکے۔ برائیوں کو دور کرنے کیلئے یہ فریق صحافت سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ تاکہ رائے عامہ بیدار ہو۔ حکومت کا سربراہ دانشمند اور انصاف پسند ہونا چاہئے۔ تاکہ معتدل اصلاحی پروگرام کو طاقت سے نافذ کر دے اور میونسپل کمیٹیوں کو قائم کرنے کے بعد پارلیمنٹ کے افتتاح پر منتج ہو۔ تعلیم و تربیت کی ترقی سے پارلیمنٹ کی نشوونما ہو۔ اگر قوم اس کی موید نہ ہو تو اس سے کیا حاصل ہوگا۔ لیکن اب جبر دل کی کہاں گنجائش ہے۔ جب کہ لوگوں میں حکومت کے معاملات پر رائے زنی کا حوصلہ نہیں ہے۔ یہ رائے شیخ محمد عبدہ اور سعد زغلول کی تھی خطبوں اور مقالات میں وہ اسی چیز کی دعوت دیتے تھے۔ اور ریاض پاشا کی ذات میں قومی امیدوں کو بار آور ہوتے دیکھتے تھے۔ کیونکہ وہ معتدل مزاج۔ میانہ رو ... بھلائی کی طرف راغب اور اصلاح پسند تھے۔ اگر کوئی دوست نصیحت کرتا تو سن لیتے اگرچہ ان میں اور عیب بھی تھے۔ یورپ میں تعلیم پائے

ہوئے حضرات درد سر بنے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے سرکاری وظائف پر کافی زمانہ یورپ میں بسر کیا تھا۔ وہاں کے نظام حکومت اور انفرادی آزادی کے مزاج شناس تھے۔ حکومت کے اعمال پر نکتہ چینی انہیں بھاتی تھی۔ مصر واپس آئے تو ملک کی حالت دیکھ کر سخت متنفر ہوئے اور مجالس و اخبارات میں فوری اصلاح کا مطالبہ کرنے لگے۔ یہ لوگ چاہتے تھے کہ حکومت انفرادی آزادی میں مداخلت نہ کرے۔ حکومت کے کاروبار پر نقد و تبصرہ کا حق قوم کو ملنا چاہیئے۔ ان کا اہم ترین مطالبہ انگریزی پارلیمنٹ کی طرح ایک نمائندہ مجلس کا قیام تھا جو حکومت کے کاروبار کی نگران ہو اور خدیو کے بجائے قوم کے سامنے جواب دہ ہو۔ یہ رائے بعض مصریوں اور جلاوطن شامیوں کی تھی۔

دونوں فریق دست بگریباں رہا کرتے۔ شیخ محمد عبدہ الوقائع المصریہ میں تعلیم و تربیت کی دعوت دیتے۔ بری عادتوں کو چھوڑنے کے لئے کہتے۔ قاعدہ اور قانون کے احترام کی صدا لگاتے ایک مضمون جس کا نام خطاء العقلاء تھا۔ مخالف فریق کو انفرادی آزادی کا نعرہ لگانے پر آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ ان کی رائے میں بغیر تعلیم و تربیت کے انفرادی آزادی نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔ اس سے لوگوں میں جوا بازی اور شراب نوشی بڑھ سکتی تھی۔ لوگوں کی عزت و آبرو کو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ سیاسی معاملات میں بھی وہ اسی رائے پر قائم تھے۔ پارلیمنٹ کے قیام سے قبل وہ میونسپل کمیٹیوں کا وجود ضروری خیال کرتے تھے۔ ان کی رائے میں شخصی اور انصاف پسند حکومت پندرہ سال کے عرصہ میں حیرت انگیز کام کر سکتی تھی اور قوم کو ترقی کی راہ پر چلا سکتی تھی۔

فریق ثانی شخصی آزادی کو ایک انسان کا فطری حق سمجھتا تھا جس سے محروم ہونے کی کوئی وجہ بھی معقول نہیں ہو سکتی تھی اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی ریلوے لائن کے بند کرنے کا مطالبہ پیش کردے کہ اس سے بعض اوقات انسانی جانیں تلف ہو جاتی ہیں۔ یہ فریق اس عزت و ناموس کو جس کی حفاظت کے لئے چوکیدار رکھنا پڑے کوئی قدر و قیمت نہیں سمجھتا تھا۔

اس دعوت کا نقیب ایک شامی نوجوان تھا جس کا نام ادیب اسحاق تھا۔ وہ ذہین۔ انشاء پرداز مقرر اور عالم تھا۔ یورپی ممالک کی تاریخ اور وہاں کے سیاسی معاملات سے واقف تھا۔ عربی۔

فرانسیسی اور ترکی زبانیں اچھی طرح جانتا تھا۔ اسلوب بیان کے زور میں شیخ محمد عبدہ سے بھی بڑھا ہوا تھا۔ سید جمال الدین افغانی کی شاگردی بھی کی تھی اور ان کے سیاسی اور اصلاحی خیالات سے سرشار تھا۔ فرانسیسی عقلیت اور ثقافت سے بھی متاثر تھا جس طرح شیخ محمد عبدہ مشرقی اور ازہری ثقافت سے متاثر تھے وہ مصر کے حالات سے مطمئن نہ تھا۔ حالانکہ شیخ محمد عبدہ دین دار اور پاکباز تھے۔ ادیب اسحاق کے دو اخبار تھے۔ ایک کا نام مصر تھا اور دوسرے کا نام تجارت ۔ ادیب اسحاق آتش کا پرکالہ تھا۔ استبداد کی مخالفت اور پارلیمنٹری نظام حکومت کا مطالبہ اس کا شعار تھا۔ ایک جگہ لکھتا ہے "اب عوام شخصی حکومت کی برائیوں سے آگاہ ہو چکے ہیں۔ روس کے سوا تمام متمدن اقوام میں دستوری حکومت قائم ہو چکی ہے۔"

"۱۷۸۹ء کے انقلاب فرانس نے استبداد کی جڑیں ہلا ڈالی ہیں۔ اس کی اصلی حالت سے نقاب اٹھایا جا چکا ہے۔ لوگوں نے غلامی کا لبادہ اتار پھینکا ہے۔ اب وہ نور حریت دیکھ رہے ہیں۔ عبودیت غلامی کے پرستاروں نے اس تحریک کا گلا گھونٹنا چاہا۔ لیکن اب لوگ آزادی کی راہ میں موت کو زندگی اور غلامی کی زندگی کو موت سمجھنے لگے ہیں۔ اب دنیا میں آزادی کی بنیادیں قائم ہو چکی ہیں اور دنیا اس کی ہولناکیوں سے دہشت ناک ہو رہی ہے۔" وہ ریاض پاشا اور اس کے ہم نواؤں کا بھی سخت مخالف تھا۔ ریاض پاشا سے ایک ملاقات کا حال اس طرح لکھتا ہے "میں ریاض پاشا سے وزارت داخلہ کے دفتر میں ملا۔ وہ کمرہ سے باہر نکل رہے تھے۔ ہم دروازے میں بیٹھ گئے وہ مجھ سے ملکی حالات دریافت کرنے لگے۔ میں نے جواب دیا۔ عزت مآب مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ پھر پوچھنے لگے گاؤں سے تم کو کیا کیا خبریں ملتی ہیں۔ میں نے کہا۔ کہ لوگوں کو امید کے مطابق کچھ نہیں ملا۔ ڈر ہے کہ وہ کہیں مایوس نہ ہو جائیں۔ آپ جانتے ہیں کہ مایوسی بیماری سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ یہ سن کر حقارت سے کہنے لگے۔ تو ان کو ذلت و خواری سے دوچار ہونے دو۔ میں نے کہا وہ تو آزادی چاہتے ہیں اور قومی تحریک کی تائید کرتے ہیں۔ تمسخر سے کہنے لگے کہ کیا وہ پارلیمنٹ چاہتے ہیں۔ میں نے جواب دیا۔ کہ یہ تو نئی چیز نہیں ہے۔ کہنے لگے۔ مصر میں کوئی بھی ملکوں کے سیاسی نظام کو اچھی طرح نہیں سمجھتا

اور پھر وہ پارلیمنٹ کا ممبر بننے کے کس قابل ہے۔ میں نے کہا کہ اگر یہ مان بھی لیا جائے۔ تب بھی ملک کو دستوری حکومت سے محروم رکھنا کہاں تک درست ہے۔ مصری نمائندے امور داخلہ اور احوال رعیتہ کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ وہ ملک کے نفع و نقصان کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ کیونکہ گھر والے کو گھر کے معاملات سے زیادہ خبر ہوتی ہے یہ کہہ کر میں چلا آیا۔"

وہ وطن۔ وطنیت۔ حقوق۔ واجبات اور دستور وغیرہ کے متعلق بہت سی باتیں کرتے رہتے تھے۔ جو فرانسیسی ثقافت کے اثر کا پتہ دیتی تھیں۔ مناسب عربی اصطلاحات ڈھالنے میں انہیں کمال حاصل تھا۔

ادیب اسحاق کا ایک دوست شریف پاشا تھا۔ بقول شیخ محمد عبدہ اسکا اس سیاسی بیداری میں بڑا حصہ تھا جس سے فتنہ بپا ہوا تھا۔ وہ کہتا رہتا تھا کہ اگر ریاض پاشا نے اجنبیوں سے صلح و آشتی نہ پیدا کی ہوتی تو غیر ملکی اثر و نفوذ اتنا نہ بڑھ سکتا تھا۔ لوگوں کو باور کراتا کہ اگر وہ وزیر اعظم بن گیا تو اغیار کے اثر و نفوذ محدود کر دیا جائے گا۔ اور ملک دن دونی رات چوگنی ترقی کرے گا۔ وہ مضبوط پارلیمنٹ کے قیام کا خواب دیکھتا تھا۔ عوام بھی کہنے لگے تھے کہ شخصی حکومت سے اصلاح کی امید نہیں رکھی جا سکتی۔ اگرچہ حاکم مخلص ہو۔ کیونکہ فرد واحد کی رائے قصور وار ہو سکتی ہے اگرچہ اس میں خود غرضی کا شائبہ نہ ہو۔ یہ لوگ محمد عبدہ اور ریاض پاشا کو رجعت پسند سمجھتے تھے۔ حالانکہ یہ رجعت پسند نہ تھے بلکہ اعتدال پسند تھے۔ بالآخر ریاض پاشا نے ادیب اسحاق کے اخبارات بند کر دیئے اور ان کو ملک بدری کی سزا دی۔ شریف پاشا نے وزارت بنائی تو اس کو واپس بلا کر وزارت تعلیم میں محکمہ تالیف و ترجمہ کا سربراہ بنا دیا پھر نمائندہ مجلس کا سکیرٹری۔ لیکن زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ ۲۸ سال کی عمر میں عین عالم شباب میں اس کا انتقال ہو گیا۔

مقام تاسف ہے کہ اگر یہ جماعت جو شخصی آزادی اور نمائندہ حکومت کا نعرہ لگا رہی تھی بغاوت میں حصہ لیتی تو بغاوت دوسرا رنگ اختیار کر لیتی۔ اور یہ سمجھا جاتا کہ عدل و انصاف کے حصول کے لئے قومی جدوجہد ہو رہی ہے۔ یہ بغاوت فوجیوں سے شروع ہوئی تھی۔ عرابی پاشا اس کے

سربراہ تھے جن کا مقصد چرکسیوں اور مصری سپاہیوں میں مساوات پیدا کرنا تھا۔ شورش زور پکڑتی گئی۔ تو اس کے مطالبات میں اضافہ ہوتا گیا۔ سلطان پاشا جو ریاض پاشا اور دستوری حکومت کی مخالفت کا نعرہ بلند کرتا تھا۔ شورش پسندوں سے مل گیا۔ بہت سے سربرآوردہ لوگوں اور علمائے ازہر نے ان کی تقلید کی۔ وطنی اخبارات اس شورش کو ہوا دے رہے تھے۔ ان سب کا قائد عبداللہ ندیم تھا۔ اب فوجیوں کے مطالبات میں قومی مطالبات بھی شامل ہوتے گئے۔ فوجیوں میں مساوات کے علاوہ دستوری حکومت قائم کرنے اور شخصی حکومت کی برطرفی کا اصرار ہونے لگا۔

اس شورش و ہیجان سے شیخ محمد عبدہ بالکل علیحدہ رہے۔ وہ فوری نمائندہ حکومت کے قائل نہ تھے۔ اس کے علاوہ ریاض پاشا سے بھی ان کے تعلقات تھے۔ پھر وہ فوجیوں کو شورشی کا مرغنہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ عرابی پاشا سے متنفر تھے۔ کیونکہ وہ بلند بانگ اور ہیچ باطن تھا۔ اس کی باتیں عقل سے زیادہ جذبات کو اپیل کرتی تھیں اگرچہ وہ مخلص تھا۔ یہ کہنا بھی صحیح نہ ہوگا۔ کہ اس شورش کے شروع میں شیخ محمد عبدہ اس سے الگ تھلگ تھے۔ لیکن جب شورش پسندوں نے نمائندہ حکومت کا مطالبہ بھی پیش کر دیا تو وہ اس کے حامی بن گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے مسائل ہمیشہ منطق سے نہیں چلا کرتے۔ خاص کر بغاوت اور شورش کے ایام میں بہت سے بڑے لوگ عوام کے دباؤ کے تحت اپنے خیالات سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ شیخ محمد عبدہ نے بھی دیکھا ہوگا کہ اس تحریک کو قوم کی حمایت حاصل ہے۔ اس میں مسلمان قبطی اور یہودی یکساں طور پر شریک ہیں۔ اس عوامی تحریک سے خدیو توفیق پاشا کے حاشیہ نشین ہی علیحدہ تھے اور توفیق پاشا اس تحریک کو دبانے کے لئے اجنبی مداخلت کا سہارا ڈھونڈ رہے تھے۔ خدیو کا یہ موقف شیخ محمد عبدہ کی نظروں میں قومی وقار کے خلاف تھا۔ بالآخر یہ تحریک انگریزوں کے مقابلے میں قومی تحریک بن گئی اور شیخ محمد عبدہ کے لئے اس کی حمایت کرنا ضروری ہو گیا۔

پوچھا جا سکتا ہے کہ شیخ محمد عبدہ کا اس تحریک پر کیا اثر تھا۔ ان کے حامی و مخالف اور مقدمہ چلانے والے سب اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ان کا بہت زیادہ اثر تھا وہ ملکی اصلاح کے بارے

میں اخبارات میں مضامین لکھتے رہتے تھے۔ نجی مجالس میں بھی باتیں ان کی زبان پر رہتی تھیں۔ قوم اور ملک کی بدحالی دیکھتے ہوئے وہ اصلاح کی حاجت محسوس کرتے تھے۔ اگرچہ طریق علاج میں انہیں اختلاف تھا۔ ان کے دوست و دشمن اقرار کرتے ہیں کہ ان میں ملکی بھلائی کا بے پناہ جذبہ موجود تھا۔ الوقائع المصریہ کی ادارت کے زمانے میں وہ عمال حکومت کی نگرانی کیا کرتے تھے۔ حکومت کی مصلحتوں سے آشنا تھے۔ ریاض پاشا، علی مبارک، سلطان پاشا اور عرابی پاشا کے ہاں ان کی آمد و رفت رہا کرتی تھی۔ طلبہ سے ان کا میل جول تھا ...... خدیو سے بھی ان کے تعلقات تھے۔ ہر جگہ وہ اپنے معتقدات بیان کرتے ان کے لئے مناظرہ کرتے۔ لوگوں کو قائل کرتے اور قائل ہو جاتے تھے اور کام پر ابھارتے ..... رہتے تھے۔ عرابی پاشا کی بغاوت کے کئی اسباب تھے۔ ان اسباب میں وہ بھی ایک سبب تھے۔ اگرچہ ان کا دور سے تعلق تھا اور عبداللہ ندیم کا قریبی اس بنا پر اگر وہ متہم ہوئے اور ان پر مقدمہ چلا تو یہ غلط نہ تھا عرابی پاشا کی بغاوت میں شرکت کے الزام میں انہیں جیل خانہ بھیج دیا گیا۔ جہاں وہ تین ماہ الزام کی تحقیق اور پوچھ گچھ کے لئے پڑے رہے۔ اس عرصہ میں انہیں سخت تکلیف بے عزتی اور شماتت اعداء کا سامنا کرنا پڑا۔ دوستوں نے آنکھیں پھیر لیں جوابات کے لئے ان کو الگ تنگ کیا گیا۔ آخر میں وہ تین سال کے لئے ملک بدر کر دیئے گئے ۱۸۸۳ء میں وہ عازم بیروت ہو گئے اس وقت ان کی عمر ۳۴ سال تھی۔

بیروت آئے ہوئے انہیں زیادہ دیر نہ لگی تھی کہ پیرس سے سید جمال الدین کا دعوت نامہ ملا جسے انہوں نے قبول کر لیا۔ دونوں نے مل کر العروۃ الوثقیٰ نکالنا شروع کیا۔ سید جمال الدین افغانی موضوع سجھا دیتے تھے اور شیخ محمد عبدہ اس کو معانی و تحریر کے قالب میں ڈھال لیتے تھے۔ پیرس کی ایک عمارت کی اونچی منزل پر ایک چھوٹے سے کمرہ میں اخبار کا دفتر تھا۔ یہاں دوست و احباب بھی آ بیٹھتے تھے۔ تبادلہ افکار بھی ہوتا رہتا اور اخبار کا کام بھی جاری رہتا۔ اس چھوٹے سے کمرہ نے انگریزوں اور فرانسیسیوں کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔ اس کمرے سے جتنا وہ ڈرتے

تھے۔ شاید ہی کسی فوج اور اسلحہ سے اتنا ڈرتے ہوں جتنی اہمیت ملکیوں کو حاصل ہوتی ہے۔ اتنی مکان کو نہیں۔ شیخ محمد عبدہ لوگوں کی معیشت اور ان کے کاروبار سے مطلع ہو کر پیرس سے اتنا متاثر ہوئے کہ بال بڑھالئے۔ طربوش پہننے لگے اور جبہ اور قفطان کے استعمال میں پابندی کرنے لگے۔ انہیں فرانسیسی زبان سیکھنے کی مہلت نہ ملی۔ ان کا اور ان کے استاد کا سارا وقت غور و فکر اور اخبار کی تحریر اور اشاعت میں گذرتا تھا۔ خفیہ طریقوں سے عالم اسلام کے مختلف گوشوں میں اخبار پہنچانے کی فکر میں وہ مصروف رہا کرتے۔ ایک پڑھنے والا الوقائع المصریہ اور العروہ الوثقیٰ میں شیخ محمد عبدہ کے مقالات میں حرارت اسلوب و مقصد کا نمایاں فرق محسوس کر سکتا ہے۔

الوقائع المصریہ کے مقالات سے ان کے اجتماعی خیالات اور مرنجان ...... مرنج اسلوب بیان کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں عقلیت، احتیاط اور دھیراپن نمایاں ہے۔ العروہ الوثقیٰ کے مضامین میں عالم اسلام سے خطاب تھا۔ اگر مصر اور ہندوستان کا تذکرہ تھا تو بہ سبیل مثال تھا۔ وہ غیر ملکی تسلط کے جانی دشمن تھے اور اس کے لئے عوامی شورش و انقلاب کے نقیب تو صحیح دینی عقائد کی اشاعت سے قومی اقبال مندی کی روح کو بیدار کرنا چاہتے تھے۔ ناامیدی کی جگہ امید اور آرزو پیدا کرتے تھے۔ تمام مسلمان قوموں میں روابط اور تعلقات کی استواری سے وہ اسلامی دنیا کو اغیار کے تسلط سے نجات دلانا چاہتے تھے۔ ظالم شخصی حکومتوں سے لوگوں کو چھٹکارا دلانا ان کے اغراض و مقاصد میں شامل تھا۔ دینی، سیاسی اور اجتماعی زندگی کو اسلام کے اوّلین اصولوں پر قائم کرنا چاہتے تھے۔ طاقت کا طاقت سے مقابلہ کرنے کی دعوت دیتے تھے بدعات سے اسلامی تعلیمات کو جدا کرتے تھے۔ ہر چیز کو قضا و قدر کے فیصلہ کے سپرد کرنے کے خلاف تھے۔ لوگوں کو سمجھاتے تھے کہ صحیح اسلام تمدن کے منافی نہیں ہے وہ جس طرح دیگر اقوام نے ترقی کی ہے اس طرح ترقی کرنے اور آگے بڑھنے سے ہرگز نہیں روکتا۔

ان مطالب اور معانی نے شیخ محمد عبدہ کے اسلوب بیان میں وہ زور پیدا کر دیا ہے۔

جوالوقائع میں مفقود ہے ۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ استاد کے اثر سے خود آتش زیر پا بن گئے تھے ۔ ان سے جدا ہوئے تو مزاج پھر دھیما پڑ گیا ۔ ہر چیز کو عقل اور منطق کی عینک سے دیکھنے لگے ۔

اس اثنا میں شیخ محمد عبدہ لندن بھی گئے تھے ۔ اس وقت مہدی سوڈانی نے سوڈان میں علم بغاوت بلند کر رکھا تھا ۔ مصر میں انگریزوں کے قدم اچھی طرح نہ جمے تھے ۔ ان سے مطالبہ ہوتا کہ مصر چھوڑنے کا وعدہ پورا کریں ۔ شیخ محمد عبدہ نے لندن کا سفر اس نیت سے کیا تھا کہ شاید انگریزی پارلیمنٹ کے ممبر حق و صداقت کی آواز پر کان دھرنے پر آمادہ ہو جائیں ۔ انہوں نے سیاسی مدبروں اور ارباب صحافت سے ملاقاتیں کی ۔ ان کو مصر چھوڑنے کا وعدہ یاد دلایا عرابی کی بغاوت کی اصلیت اور یورپی وسیسہ کاریوں سے آگاہ کیا اور کہہ دیا کہ مصری غیر ملکی حکومت پسند نہیں کرتے ۔ وہ شخصی حکومت کو اجنبی حکومت پر ترجیح دیتے ہیں ۔ انہیں اس خطرہ سے بھی آگاہ کر دیا کہ مصری مالیہ اور ٹیکس ادا نہیں کریں گے جس سے اجنبی حکومت کا چلنا مشکل ہو جائے گا خواہ یہ اجنبی حکومت انگریزوں کی ہو یا فرانسیسیوں کی ۔ مصری اگرچہ ناخواندہ ہیں ۔ لیکن ان میں وطنی شعور کا ہرگز فقدان نہیں ہے ۔ اس کے علاوہ اسلام جو اُن کے رگ و پے میں جاری و ساری ہے غیر ملکی حکومت کا فرمانبردار اور مطیع ہونا حرام قرار دیتا ہے ۔ لیکن سچائی کے سامنے طاقت کب جھکی ہے ۔ قومی مصلحتوں کو انسانیت کی خاطر کب قربان کیا گیا ہے ۔ اور شیر نے شکار کب چھوڑا ہے ؟ شیخ محمد عبدہ خالی ہاتھ پیرس لوٹے ۔ استعمار العروۃ الوثقیٰ کا نکلنا دو بھر کر دیا ۔ آٹھ ماہ میں اٹھارہ شمارے نکلے تھے کہ اخبار بند کرنا پڑا ۔ سید جمال الدین نے ایران کا رخ کیا اور شیخ محمد عبدہ بیروت چلے آئے ۔ العروۃ الوثقیٰ کو بخلاف امید کامیابی نہ حاصل ہو سکی ۔ اس کا پودا تناور درخت نہ بن سکا ۔ لیکن اس نے جو بیج بویا تھا اس سے آنے والی نسلوں نے فائدہ اٹھایا ۔

شیخ محمد عبدہ بیروت پہنچے تو سارا سیاسی شور و شر مدہم پڑ چکا تھا ۔ وہ سیاست سے الگ تھلگ ہو کر دینی اور عقلی اصلاح میں مصروف ہو گئے ۔ اس وقت حالات و ظروف کا بھی یہی تقاضا

تھا۔ عرابی کی بغاوت ناکام ہو چکی تھی۔ اخبار بند ہو گیا تھا۔ انگریزوں سے گفت و شنید بے نتیجہ رہی تھی۔ اب وہ بیروت میں مقیم تھے۔ یہ سلطان عبدالحمید کا عہد حکومت تھا۔ جس نے آزادی کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا تھا اور ہر طرف جاسوسوں کے کان لگے رہتے تھے۔

اب شیخ محمد عبدہ بیروت میں عالم اور معلم کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے فراغت کا یہ زمانہ تصنیف و تالیف میں گذارا۔ نہج البلاغہ اور مقامات بدیع الزمان کی شرحیں لکھیں۔ بیروت کی دو مسجدوں میں قرآن پاک کی تفسیر کا درس دینے لگے جو بعد میں مصر میں بھی جاری رہا۔ درس میں وہ کسی خاص تفسیر کے پابند نہ تھے۔ قرآن پاک کی آیت تلاوت کر کے اس کی تفسیر شروع کرتے اس کے لئے بعض تفاسیر اور اپنے غور و فکر سے کام لیتے۔ تفسیر بیان کرتے وقت حسب موقعہ محل مسلمانوں کی حالت پر بھی تبصرہ کرتے۔

بیروت کے مدرسہ سلطانیہ میں بھی درس و تدریس کی خدمات انجام دیتے رہے۔ مدرسہ بالکل معمولی سا تھا۔ لیکن انہوں نے جلد ہی اس کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ زیادہ وقت پڑھنے پڑھانے میں گذارتے۔ خود توحید، منطق، بلاغت، تاریخ اسلامی اور فقہ حنفی کا درس دیتے تھے۔ گھر میں ادبی مجلسیں قائم ہوتیں۔ علمی مسائل پر تبادلہ خیالات ہوتا۔ ان کی گفتگو اور تقریر سحر انگیز ہوتی تھی ......
...... جس کے مسلمان اور عیسائی یکساں طور پر شائق ہوتے۔ ان لیکچروں کا مجموعہ انہوں نے رسالۃ التوحید کے نام سے بعد میں مصر سے شائع کیا۔ منطق میں شرح البصائر النصیریہ اس قیام کی یادگار ہے۔

مختصر طور پر انہوں نے بیروت میں علمی تحریک کی بنیاد رکھی جس سے بہت سے لوگوں نے فائدہ اٹھایا۔ ساتھ ساتھ وہ ثمرات الفنون میں بھی مضامین لکھتے رہتے تھے جو الوقائع المصریہ میں چھپتے تھے ان میں نقد و تبصرہ کی دعوت ...... تھی کہ اس سے صواب اور ناصواب میں تمیز کی جا سکتی ہے۔

اس کے بعد وہ ممالک اسلامیہ کے مصالح عامہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ سلطان عبدالحمید نے شیخ الاسلام کی صدارت میں مدارس اسلامیہ کی اصلاح کے لئے ایک کمیٹی کے قیام کا فرمان صادر کیا تھا۔ شیخ محمد عبدہ نے اس کے لئے ایک لائحہ عمل مرتب کیا اور آستانہ میں شیخ الاسلام کی خدمت روانہ کر دیا

اس میں وضاحت سے بیان کیا تھا کہ مسلمانوں کی کمزوری کا سبب بد عقیدگی اور اسلام کے اصولوں سے عدم واقفیت ہے جس سے ان کے اخلاق بگڑ گئے ہیں۔ اس کا علاج صرف دینی تعلیم کی اصلاح سے کیا جا سکتا ہے۔ اس مناسبت سے انہوں نے اپنی تجاویز لکھ کر بھیج دی تھیں

دوسرا لائحہ عمل۔ بیروت کے حاکم کی خدمت میں پیش کیا جس میں شام کی اصلاحات کے متعلق اپنے خیال درج کئے۔۔۔۔ وہاں کے حالات کی ابتری بیان کی اور سیاسی انتشار کی وجہ اجنبی مدارس کو قرار دیا۔ قومی مدارس کے قیام اور فروغ اور دینی تعلیم کی اصلاح و توجہ کے بارے میں تجاویز پیش کی۔۔۔۔ اس اثناء میں انہوں نے عملی سیاست میں بالکل حصہ نہیں لیا۔ لیکن بعض حاسدوں کی وجہ سے اُن کو تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ حدت مزاج بھی مخالفت کا سبب ہوا کرتی تھی کیونکہ جب وہ غضب ناک ہوتے تو جرح شروع کر دیتے۔ جب انہوں نے مدرسۂ سلطانیہ کے ماحول کو بگڑا ہوا پایا تو علیحدگی اختیار کر لی۔

ان کی جلاوطنی کی مدت تین سال تھی لیکن وہ اس سے زائد عرصہ کے لئے وطن سے باہر رہے۔ خدیو توفیق ان سے ناراض ہو چکے تھے۔ کیونکہ ان پر الزام تھا کہ انہوں نے کھلے بندوں توفیق کی معزولی کا مطالبہ پیش کیا تھا۔ اس سبب سے ان پر مقدمہ بھی چلا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اس مطالبہ کا تکرار بعض انگریزی اخبارات کے رپورٹروں کے سامنے بھی کیا تھا۔ ایک رپورٹر نے خدیو توفیق کے متعلق ان کی رائے پوچھی تھی تو انہوں نے جواب دیا۔ کہ خدیو نے اغیار کو ملک پر مسلط کر کے ہم پر بڑا ظلم کیا ہے۔ جنگ کے زمانہ میں اس نے دشمنوں کا ساتھ دیا ہے۔ لہذا وہ ادنیٰ احترام کا بھی مستحق نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ اپنے کئے پر نادم ہو جائے تو اس کی غلط کاریوں کو بخشا جا سکتا ہے۔ ہم کو ان غداروں کی ضرورت نہیں جو شکل و صورت سے مصری ہوں لیکن دل کے لحاظ سے انگریز ہوں۔

اب مصر میں ان کی واپسی مشکل نظر آتی تھی۔ اتفاق سے ریاض پاشا کی وزارت برسر اقتدار آ گئی اور انہوں نے خدیو سے معافی کی سفارش کر دی۔ بیگم نازلی اور غازی مختار پاشا نے بھی ان کی واپسی

کی سفارش کی تھی۔ لارڈ کرومر کے ہاں دونوں مقبول شفاعت تھے۔ لارڈ کرومر نے اپنی کتاب جدید مصر میں اس کا تذکرہ بھی کیا ہے کہ شیخ محمد عبدہ کو برطانوی دباؤ کی وجہ سے معافی دی گئی۔ بعض اس معافی کا سہرا مختار پاشا کے سر باندھتے ہیں۔ لیکن واقف احوال جانتے ہیں کہ خدیو توفیق لارڈ کرومر کے دباؤ یا مرضی سے ان کو معاف کر سکتا تھا۔ اب سوال ہو سکتا ہے کہ درپردہ کیا معاملہ تھا۔ لارڈ کرومر صرف بیگم نازلی کو خوش کرنے کی خاطر یہ انتہائی قدم نہ اٹھا سکتا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ شیخ محمد عبدہ اور سید جمال الدین انگریزوں پر العروۃ الوثقیٰ میں سخت نکتہ چینی کیا کرتے تھے اور ان کو مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے۔

مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انکے دونوں دوستوں نے حکام کو باور کرا دیا تھا کہ اگر ان کو داخلہ کی اجازت دے دی گئی تو وہ عملی سیاست سے بالکل علیحدہ رہیں گے۔ وہ دکھ اور تکلیف برداشت کر چکے تھے۔ لیکن اس سے ان کی قوم یا عالم اسلامی کو کچھ فائدہ حاصل نہ ہوا تھا۔ اب وہ دینی اصلاح میں مصروف رہیں گے اس سے انگریزی موقف کو کسی قسم کا نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ تھا۔ شاید اس نظریہ کے پیش نظر لارڈ کرومر نے دوستوں کی سفارش منظور کر لی اور خدیو کو مجبور کیا کہ وہ معافی کے احکام صادر کر دے۔ شیخ محمد عبدہٗ بھی اس لائحہ عمل پر کاربند رہے۔ اس کی وضاحت آئندہ آئے گی۔

کیا ایک معترض شیخ محمد عبدہ کے اس موقف کو قابلِ ملامت سمجھ سکتا ہے؟ اس موقعہ پر اگر وہ سیاسی رہنما کا روپ دھار لیتے تو بے شک قابل ملامت ہو سکتے تھے۔ لیکن ان کی تاریخ حیات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ہمیشہ سیاست سے نفور رہے۔ بعض حالات سے مجبور ہو کر انہوں نے عرابی پاشا کی بغاوت میں حصہ لیا تھا۔ سید جمال الدین کے فیض صحبت سے ان میں شعلہ مزاجی بھی پیدا ہو گئی تھی لیکن وہ اپنے آپ کو قوم کا معلم حقوق اور واجبات کا سمجھانے والا۔ اسلامی عقیدہ کا مصلح اور اسلام کا حمایتی سمجھتے رہے یہ بغاوت میں حصہ لینے سے قبل کا حال ہے۔ بیروت میں بھی انہوں نے کسی قسم کی سیاست میں حصہ نہیں لیا تھا۔ ان کے دوستوں نے یہی بات لارڈ کرومر کو بتلائی تھی۔ لیکن اس سے سید جمال الدین اور شیخ محمد عبدہٗ کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو گئی۔

اس اثناء میں مصر کے زمین و آسمان بدل گئے تھے ۔ ہر شعبۂ حکومت میں انگریزوں کے مشیر اور انسپکٹر مقرر تھے حتیٰ کہ داخلی معاملات ۔ تعلیمات ازہر سے متعلق امور اور شرعی عدالتیں ان کے زیر اقتدار تھیں ۔ محکموں کے سکریٹری شطرنج کے مہرے تھے ۔ شہروں کے حاکم انگریز انسپکٹر کے تابع فرمان تھے ۔ انگریز ہائی کمشنر قبلہ حاجات تھا ۔ اس کے مقرب بارگاہ کی سفارش سنی جاتی تھی اس کو دنیاوی وجاہت حاصل تھی ۔ اس سے دور رہنے والا نہ صرف مردود سفارش سمجھا جاتا تھا ۔ بلکہ باغی متصور ہوتا تھا ۔ ان حالات میں خدیو توفیق کو انگریزوں سے صلح صفائی رکھنے سے کوئی چارہ نہ تھا ۔ وہ انکے مشوروں پر کاربند ہوتا ۔ یہاں تک کہ سوڈان کے تخلیہ کو بھی مان لیا ۔ ایک دفعہ لندن ٹائمز کے نامہ نگار سے اثنائے ملاقات کہا تھا کہ ان تین راستوں میں سے ایک راستہ مجھے اختیار کرنا پڑتا ہے ۔ ا۔ظاہر میں انگریزوں کا مشورہ قبول کرنا اور عملی طور پر ان کی مخالفت کرنا ۔ ۲۔ انکی اندھی اطاعت ۔۳۔ ان کی آراء پر کھلم کھلا نکتہ چینی کرنا ۔ اور اپنی آراء کا اظہار اگر انہوں نے میر تجویز مان لی تو سبحان اللہ ورنہ مجھے ان کی بات ماننی پڑے گی ۔ میں اس آخری شق پر کاربند ہوں اور مجھے کمزور سمجھا جاتا ہے لیکن میں کہاں تک ان کا مقابلہ کر سکتا ہوں ۔

شیخ محمد عبدہ کا اہم مقصد دینی عقیدہ اور اسلامی اداروں ازہر ۔ اوقاف اور شرعی عدالتوں کی اصلاح تھا ۔ اس اصلاحی پروگرام کو کامیاب بنانے کے لئے انہیں کسی طاقت کا سہارا لینے کی بھی ضرورت تھی ۔ ورنہ ان کی کون سنتا اور ان کی دعوت کا کون لحاظ کرتا ۔ سوال یہ تھا کہ وہ کس کا سہارا لیں ۔ خدیو توفیق سے وہ نفرت کرتے تھے ۔ اگر اس کا بس چلتا تو انہیں کبھی بھی واپسی کی اجازت نہ ملتی ۔ اب خدیو اختیارات سے بھی محروم ہو چکا تھا ۔ لیکن انہیں ہر قیمت پر اسلامی اداروں کی اصلاح منظور تھی ۔ اب لے دے کے انگریز رہ گئے تھے اگر یہ ان کی مدد و اعانت کریں تو ان کے اثر و نفوذ سے ان کی اصلاحی تحریک پروان چڑھ سکتی تھی ۔ لیکن اجنبی غاصبوں سے مدد مانگنا بھی ذلت کے برابر تھا ۔ اس کے علاوہ عوام بھی شک و شبہ میں مبتلا ہو سکتے تھے کہ ان کی اصلاحی دعوت انگریزی سایہ کے تحت پرورش پا رہی ہے ۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ انگریزوں نے ان کو مصر آنے کی اجازت دلائی

تھی۔ وہ ان کی دینی اصلاح کے مخالف بھی نہ تھے۔ اگر انگریز نہ ہوتے تو وہ جلا وطن ہی رہتے۔ ان کی اصلاحی دعوت انگریزوں کو کچھ نقصان بھی نہ پہنچا سکتی تھی۔ لہذا ان سے مدد مانگنے میں کوئی حرج نہ تھا۔

وہ قوم پر بھی بھروسہ نہ کر سکتے تھے۔ کیونکہ وہ اختلاف کی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اس کا قومی شعور مردہ ہو چکا تھا۔ بڑے بڑے لوگوں کا حال اس سے بھی ابتر تھا۔ ان کو یہ بھی خدشہ تھا کہ اگر انہوں نے دینی عقائد اور اسلامی اداروں کی اصلاح کی دعوت دی تو غرض مند لوگ بگڑ جائیں گے اور ان پر کفر و زندقہ کا الزام لگائیں گے۔ اب اصلاح کی کیا صورت رہ گئی تھی۔ میرے خیال میں اس قسم کے خیالات شیخ محمد عبدہ کے ذہن میں گردش کر رہے تھے جب کہ وہ مصر واپس آ رہے تھے۔

میرا گمان ہے کہ انہیں خدیو سے صلح صفائی اور انگریزوں سے مدد مانگنے کا خیال آیا تھا۔ اس کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ واپسی پر انہوں نے تعلیمی اصلاح کا منصوبہ بنایا اور لارڈ کرومر کی خدمت میں پیش کر دیا۔ وہ جانتے تھے کہ اب تمام طاقت اور حکومت ان کے قبضہ میں ہے۔ اس کے بعد وہ عمر بھر انگریزوں سے تعاون کرتے رہے۔ اس کی تہہ میں ایک پوشیدہ راز بھی تھا۔ وہ سمجھتے تھے۔ کہ انگریزوں کو مصر سے نکالنا ایک مشکل امر ہے۔ عوام کی بیداری اور سمجھ بوجھ ہی اس مشکل کو حل کر سکتی ہے جس کے لئے تعلیم کی اشاعت ضروری تھی۔ پھر وہ دیکھ رہے تھے کہ تمام دول یورپ کی موافقت سے مصر آزادی حاصل کر سکتا ہے۔ اب وہ سید جمال الدین پر بھی نکتہ چینی کرنے لگے تھے کہ وہ عوام کی اصلاح کو چھوڑ کر تمام تر سیاست کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ ان کو یہ بھی گلہ تھا۔ کہ بیگم نازلی نے بھی تمام تر کوششیں سیاسی میدان میں صرف کر دی ہیں۔ اس کو چاہیے تھا کہ نسوانی ترقی کے لئے انجمن قائم کر دیتی۔ جب بھی وہ بیگم نازلی کے ہاں جاتے تو سیاسی مسائل پر لب کشائی نہ کرتے لیکن اس کو سیاسی گفتگو ہی بھاتی تھی۔ اس وقت مصر میں دو گروہ تھے۔ ایک کا خیال تھا کہ حقیقی اصلاح ملکی آزادی کے بعد ہی سرانجام پا سکتی ہے۔ دوسرا سمجھتا تھا کہ داخلی اصلاح سے آزادی کی نعمت مل سکتی ہے۔ دوسری رائے کے حامی شیخ محمد عبدہ اور ان کے اصحاب تھے۔ پہلی رائے

پر مصطفیٰ کامل اور ان کے ساتھی کاربند تھے۔ دونوں میں سر پھٹول رہا کرتی۔ پہلی جماعت دوسری کو رعونت سے متہم کرتی تو دوسری جماعت پہلی کو رجعت پسندی اور کمزوری کا الزام دیتی فطری طور پر سیاسی مدبر رائے اوّل پر قائم تھے اور دینی مصلح۔ دوسرے نظریہ پر کاربند تھے۔ سچ بات یہ ہے کہ سید جمال الدین افغانی دونوں گروہوں کے سردار تھے۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ عقیدہ کی اصلاح اور سیاسی آزادی دول یورپ سے چھٹکارا حاصل کرنے سے ہو سکتی ہے۔ ان دونوں فکروں کا اجتماع ان کی ذات سے عبارت تھا۔ ان کی وفات کے بعد ہر ایک نے اپنے اپنے مزاج کے مطابق دعوت دی۔ عقیدہ کی اصلاح کی خلافت شیخ محمد عبدہ کے حصہ میں آئی اور سیاسی زعامت عبداللہ ندیم مصطفیٰ کامل اور سعد زغلول کو ملی۔

اگر ہم شیخ محمد عبدہ کے احوال و ظروف کو انصاف کی نظر سے دیکھیں تو وہ اس سمت میں منفرد نظر نہ آئیں گے۔ ہندوستان کے مصلح عظیم سر سید احمد خاں بھی ہندوستانی مسلمانوں کے اجتماعی اور دینی اصلاح کے لئے انگریزوں سے تعاون ضروری خیال کرتے تھے تاکہ وہ ان کی اصلاحی تحریک کی مخالفت نہ کر سکیں

اس نظریہ پر قانع ہو کر محمد عبدہ نے اصلاحی پروگرام پر عملدرآمد شروع کر دیا۔ ایک دفعہ غیر مسلموں سے موالات کے بارے میں ان سے فتویٰ مانگا گیا تھا۔ انہوں نے اس کا یہ جواب دیا "کہ کتاب و سنت اور سلف صالحین کے عمل سے یہ قطعی طور پر ثابت ہے کہ مسلمانوں کی بھلائی کے لئے غیر مسلموں اور غیر صالحین سے مدد مانگنا روا ہے۔ جو لوگ مسلمانوں میں اتفاق پیدا کرنے اور یتامیٰ کی تربیت کے لئے غیروں کی مدد کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ وہ آنحضرت صلعم اور ان کے اصحاب کے اسوہ حسنہ پر چلتے ہیں، جو ان مسلمانوں کو کافر یا فاسق کہے تو وہ خود کافر اور فاسق ہے۔ داعیوں پر لازم ہے کہ اپنی دعوت کی اشاعت میں کوشش کریں اور ملامت کرنے والوں کی ملامت کی پرواہ نہ کریں اور نہ ان کی گالیوں سے رنجیدہ ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کی کامیابی کا ذمہ دار ہے جب وہ حق و صبر کا دامن تھامے رہیں۔"

یہ فتوی ان کے مذہب اور موقف کا آئینہ دار ہے۔ اس فتوی کا پڑھنے والا استاذ کے غیظ و غضب کا اندازہ کر سکتا ہے۔ بہر حال ان کی سیاست ان خیالات سے سمجھ میں آسکتی ہے وہ عمر بھر تکالیف برداشت کرتے رہے۔ اصلاح میں وسیسہ کاریوں کا سامنا کرتے رہے۔ ان کی شخصیت اتہام کی نشانہ بنی رہی۔ دعوتِ اصلاح میں وہ بے شمار رکاوٹیں پاتے رہے۔

شیخ محمد عبدہ مصر واپس آئے تو انہیں امید تھی کہ ان کو دار العلوم کا نگران یا استاد مقرر کر دیا جائے گا۔ اور وہ دوبارہ اصلاحی تحریک کا آغاز کریں گے۔ اور طلبہ میں روشن خیالی پیدا کر سکیں گے۔ لیکن خدیو انہیں تدریسی فرائض سپرد کرنے پر تیار نہ تھا۔ اسے ڈر تھا کہ طلبہ ان کے اصلاحی خیالات سے متاثر ہوں گے اور ان کے رنگ میں رنگے جائیں گے۔ شاید انگریز بھی اسبات کے مخالف تھے اگر وہ چاہتے تو خدیو پر دباؤ ڈال سکتے تھے۔ بالآخر ان کی تقرری بطور قاضی کے محکمہ شرعیہ میں ہو گئی۔ اور وہ مختلف شہروں میں کام کرتے رہے۔ اس وقت ہر لکھا پڑھا محکمۂ انصاف میں ملازم ہو سکتا تھا۔ اس کے لئے کسی سند کی قید نہ تھی۔ جب وہ قاضی تھے تو انہوں نے دیکھا کہ بہت سے حاکم فرانسیسی قانون اور اس کی شروح سے استفادہ کرتے ہیں۔

ان کی غیور طبیعت نے یہ گوارہ نہ کیا کہ وہ دوسروں سے علم میں پیچھے رہ جائیں۔ اب جبکہ وہ عابدین میں قاضی تھے۔ اور ان کی عمر بھی چالیس سے متجاوز ہو چکی تھی تو انہوں نے فرانسیسی زبان سیکھنے پر کمر ہمت باندھی اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس میں درک حاصل کر لیا۔ فرانسیسی تصانیف کے مطالعہ نے زبان دانی کو مزید تقویت پہنچائی۔ ہربرٹ سپنسر کی انگریزی کتاب (التعلیم) کا فرانسیسی میں ترجمہ ہوا تو انہوں نے اس ـــــــ کا عربی میں ترجمہ کر دیا سوئٹزرلینڈ اور فرانس کی سیاحت سے انہیں فرانسیسی زبان کی تکمیل کا اور موقع ملا۔ بہت سے لیکچر سنے اور بہت سے ناموروں سے ملاقات کی وہ قانونی موشگافیوں کے بجائے حق و انصاف کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے تھے اس سے ان کی وسعت نظر اور شریعت اسلامیہ میں تبحر کا پتہ چلتا ہے بعض عہدہ داروں نے قانونی تقاضوں کو نظر انداز کرنے کی شکایت کی تو انہوں نے اس کا برملا اعتراف کر لیا

ط HERBRT SPENSER

اور اپنے نظریہ کی پوری حمایت کی۔

خدیو توفیق پاشا راہی ملک عدم ہوئے تو عباس اوّل کو وی آنا سے بلا کر تخت نشین کیا گیا۔ وہ حوصلہ مند اور اجنبی اثر و نفوذ کے سخت مخالف تھے۔ ان کا لائحہ عمل ان کے باپ سے علیحدہ تھا۔ اس کی جی حضوری انہیں ناپسند تھی۔ ان کے گرد بہت سے پرجوش نوجوان جمع ہو گئے تھے۔ عرابی پاشا کی بغاوت میں حصہ لینے والے سردار جو صورتحال سے مایوس نہ تھے ان کے دامن دولت سے وابستہ ہو چکے تھے ان کو ترکی اور فرانس کی حمایت حاصل تھی کیونکہ ان دونوں ملکوں کی آس بندھ چکی تھی کہ وہ عباس اوّل کے برسر اقتدار آنے سے اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر سکیں گے۔

عباس نے آتے ہی اپنے ہم خیال و ہم نوا اصحاب اکٹھے کر لیے - ملک کے حالات سے براہ راست واقفیت پیدا کر لی تھی۔ سرکاری عہدہ داروں اور سرداروں سے براہ راست رابطہ پیدا کیا کبھی کبھی محکمہ کے سربراہوں کی صدارت بھی کر لیتا۔ انگریزوں کو فکر لاحق ہوا کہ اس نوجوان کے ہاتھوں ان کے مفادات محفوظ نہ رہ سکیں گے۔ لہٰذا وہ موقعہ کی تاک میں رہنے لگے کہ کسی طرح خدیو کو نیچا دکھایا جا سکے۔

شیخ محمد عبدہ کی اصلاحی امیدیں عباس کی ذات سے بندھی ہوئی تھیں۔ اب وہ خدیو کے مقرب بارگاہ بننے کے وسائل پیدا کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریزوں سے بھی ان کے مراسم تھے۔ وہ دونوں طاقتوں سے استعانت کے خواہاں تھے۔ لیکن واقعات نے ظاہر کر دیا کہ یہ ان کا صرف خیال تھا۔ دونوں سے دوستی گانٹھنی آگ اور پانی کو جمع کرنا تھا۔ وہ ایک کو راضی رکھنے کی کوشش کرتے تو دوسرا ناراض ہو جاتا۔ بہر حال شیخ محمد عبدہ نے محمد ماہر پاشا کی وساطت سے خدیو تک رسائی پائی۔ خدیو نے ان کی خوب پذیرائی کی۔ اس کے بعد کھلے چھپے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ شیخ محمد عبدہ ازہر، اوقاف اور محاکم شرعیہ کی اصلاح کے دل و جان سے داعی تھے۔ یہ بے ضرر پروگرام انگریزوں کے خلاف بھی نہ تھا۔ اس میں قوم کی بھلائی بھی تھی۔ اور پھر اس سے خدیو کے ہاتھ بھی مضبوط ہو سکتے تھے۔ کیونکہ وہ انگریزوں کی نسبت ان اداروں کا انتظام بحسن و خوبی انجام دے سکتا تھا۔ خدیو نے شیخ

محمد عبدہ کو اصلاحی تجویز پیش کرنے کے لئے کہا۔ انہوں نے حسب الحکم مناسب تجویز بھی پیش کر دی۔ اس پر ازہر کی انتظامی مجلس کی تشکیل کا سرکاری فرمان جاری ہوا۔ جس کا صدر شیخ حسونہ تھا اور شیخ محمد عبدہ اور شیخ عبدالکریم سلمان سرکاری نمائندے تھے۔ اس انتظامی مجلس کی تشکیل سے شیخ محمد عبدہ کو زندگی بھر کی امید پوری ہوتی ہوئی نظر آرہی تھی۔

لیکن ازہر اور اس کی اصلاح کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس سے قبل تو کوئی بھی اس امتحان میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ کیونکہ اس سے پیشتر جو کوششیں ہوئی تھیں۔ وہ تمام تر سطحی تھیں۔ جڑ تک کسی کی بھی رسائی نہ ہو سکی تھی۔ دوسرے اس سے ارباب ازہر کی دشمنی مول لینا تھی۔ وہ قدیم سے اتنے مالوف ہو چکے تھے کہ اس کو داخل ایمان سمجھتے تھے ہر جدت کو کفر خیال کرتے تھے۔ لفظی نزاع، جملہ کی تشریح اور غلطی کی تاویل میں ان کی عمریں بسر ہو جاتی تھیں۔ وہ حقائق دنیا سے آنکھیں بند کئے ہوئے بیٹھے تھے جو کوئی اصلاح کا بیڑا اٹھاتا اس کے خلاف ماحول مسموم بنا دیتے۔ مذہب کی پناہ لے کر حکومت کو ڈراتے اور عوام کو بھڑکاتے اور اصلاح کی آواز کا گلا دبا دیتے۔ ان کی کوشش ہوتی کہ چند نوجوان جو اصلاح کی آواز بلند کر رہے ہیں اس کام سے دست بردار ہو جائیں۔ ایک دوسری جماعت بھی جو خلوص نیت سے قدامت پر قائم تھی ان کی تنگ نظری اور حق سے غفلت ان کو ہٹ دھرمی پر قائم کئے ہوئے تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی نسبت اہل حدیث کہا کرتے ہیں، "ہم ان کی دعوت تو قبول کر لیں گے لیکن ان کی شہادت قبول نہیں کریں گے"۔ یہ عناصر مل کر کھڑے ہو جاتے تو مصلح اگر غصہ ور ہوتا تو دعوت سے دست بردار ہو جاتا ورنہ صلح جوئی سے موجودہ حالت پر راضی ہو جاتا۔ اور حکومت بھی مجبور ہوتی کہ ازہر اور ارباب ازہر کو ان کے حال پر چھوڑ دے۔ اس نے تنگ آکر دارالعلوم اور مدرسۃ قضاء شرعیہ ایسی جدید درس گاہیں قائم کر دیں تاکہ ان کی تنظیم اور نگرانی خود کر سکے۔ لیکن اس سے حکومت کو پھر بھی چین نصیب نہ ہو سکا۔ طلبہ، علماء اور حکومت میں کبھی کبھی نزاع کی نوبت آجاتی۔ اس کے بعد اصلاح کا کام پھر ملتوی ہو جاتا۔ کیونکہ وقت گذرنے سے مشکل حل نہیں ہوا کرتی۔ کسی مشکل کے حل کے لئے اس کا شافی علاج ضروری ہے

شیخ محمد عبدہ مجلس کی انتظامیہ کو ازہر کی اصلاح پر آمادہ کرتے۔ اساتذہ کی تنخواہوں میں اضافہ کی تنظیم مساوی تشریف کیلئے لائحہ عمل و وظائف کی تنظیم طبی امداد اور امتحان کیلئے ضابطہ عمل وغیرہ سے اصلاحات کا آغاز کیا لیکن جب حقیقی اصلاح از قسم نصاب تعلیم۔ انتخاب کتب۔ طریقہ تدریس۔ تعلیمی پروگرام کے طے کرنے کا وقت آیا تو راستہ میں رکاوٹیں پیدا ہو جاتیں۔ بالآخر وہ تھک کر بیٹھ رہے۔ ان کا علاج سطحی تھا نہ کہ گہرا۔ حقیقت میں وہ ماحول بھی ناسازگار تھا۔ اس سے زیادہ کچھ اور ہو بھی نہ سکتا تھا۔

شیخ محمد عبدہ محکمہ قضا میں کام کرتے رہے اور ساتھ ہی ازہر کی مجلس انتظامیہ کو ۱۸۹۹ء تک اصلاح پر آمادہ کرتے رہے۔ اس وقت ملک میں شرعی عدالتوں اور ان کے فیصلوں کے خلاف عام شکایت تھی۔ محکمہ داخلہ کے انگریز نگران نے ان عدالتوں کے توڑنے اور دیوانی عدالتوں میں ان کے انضمام کا ارادہ کیا۔ لیکن وہ رائے عامہ سے بھی خائف تھے۔ انہوں نے اس عمل کو بالتدریج کرنا چاہا۔ خیال یہ تھا کہ محکمہ دیوانی کے دو عہدیداروں کو اعلیٰ شرعی عدالت کا ممبر بنا دیا جائے۔ لیکن جمال الدین آفندی جو مصر میں ترکی قاضی تھے۔ اس تجویز کے مانع آئے۔ شیخ حسونۃ النواوی۔ شیخ الازہر اور مفتی دیار مصریہ نے بھی اس تجویز کی شدید مخالفت کی۔ بلکہ انہوں نے ملازمت ہی چھوڑ دی۔ شیخ محمد عبدہ کا خیال تھا کہ ان کو شیخ ازہر اور مصر کا مفتی اعظم مقرر کر دیا جائے گا اور وہ ازہر کی اچھی طرح اصلاح کر سکیں گے۔ لیکن خدیو نے فوراً ہی شیخ عبدالرحمٰن القطب النواوی کو شیخ ازہر اور شیخ محمد عبدہ کو مصر کا مفتی مقرر کر دیا۔ اس سے شیخ محمد عبدہ نے یہ تاثر لیا کہ خدیو مصر ان سے کچھ مطمئن نہیں ہے لیکن ایک ماہ کے بعد شیخ عبدالرحمٰن نے بھی رحلت کی اور ان کی جگہ شیخ سلیم البشری، شیخ ازہر مقرر کر دیئے گئے۔ یہ بزرگ اصلاح کے مخالف تھے۔ اور سرکار کا چشم و ابرو پر ناچتے تھے۔ بہر حال شیخ محمد عبدہ کا مفتی اعظم ہونا خود اس عظیم الشان منصب کی جلالت قدر میں اضافہ کرتا تھا۔ اسی سال وہ مجلس شوریٰ القوانین کے ممبر بھی بنا دیئے گئے۔

خدیو اور ان کے تعلقات ظاہر میں خوش گوار تھے۔ جب انگریزوں اور خدیو کے درمیان کوئی مشکل آن پڑتی۔ تو شیخ محمد عبدہ سے مشورہ ناگزیر ہوتا۔ انگریز ترکی قاضی کی بجائے مصری قاضی کا تقرر چاہتے تھے۔ خدیو ترکی قاضی کے حامی تھے کیونکہ وہ ترکی سے تعلقات توڑنا نہ چاہتے تھے۔ اس طرح یوں فہمی ارمنی کا

معاملہ تھا جس پر الزام تھا کہ اس نے سلطانی مہر خود بنالی ہے۔ ان دونوں معاملوں میں شیخ محمد عبدہ کے حسن تدبیر سے خدیو کی عزت رہ گئی۔ لیکن وہ خدیو کی مطلق العنانی کو ناپسند کرتے تھے۔ انگریز بھی سلطنت در سلطنت کے حامی نہ تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ خدیو کیلئے ترکان احرار سے مخالفت مول لینی مہنگی پڑیگی کیونکہ یہ لوگ سلطان عبدالحمید کے استبداد اور ظلم و ستم کے جانی دشمن تھے۔ اور خدیو کو چاہئے کہ مصر میں علم پھیلائے۔ شرعی عدالتوں اور ازہر کی اصلاح کرے۔ خدیو تک یہ باتیں پہنچیں تو وہ سن کر خوش ہوتے اس کے بعد ازہر میں کسوۃ شریفہ کی جگہ خالی ہوئی۔ خدیو نے اس منصب پر شیخ محمد راشد کو مقرر کرنا چاہا۔ شیخ محمد عبدہ اس منصب کے لئے شیخ راشد کو موزوں نہ خیال کرتے تھے۔ اس بارے میں ان کی خدیو سے جھڑپ بھی ہوئی۔ جس سے خدیو کا دل مکدر ہو گیا اور اس نے شیخ محمد عبدہ سے بدلہ لینے کی ٹھانی۔

اس کے بعد ایک اور واقعہ ہوا۔ خدیو اپنی اراضی کا انتقال وقف کی اراضی سے کرنا چاہتا تھا۔ شیخ محمد عبدہ اور حسن پاشا عاصم نے خدیو کے اس اقدام کی بھی مخالفت کی اور اس کو وقف کی مصلحت کے خلاف سمجھا۔ ان کے مشورہ سے اوقاف کی مجلس اعلیٰ نے بھی خدیو کا مطالبہ نامنظور کر دیا۔

اس واقعہ کے بعد خدیو مصر شیخ محمد عبدہ کا کھلم کھلا دشمن بن گیا۔ ان کے خلاف سازشوں کا جال بچھایا گیا۔ انہوں نے تنگ آ کر برطانوی حکام کا سہارا لیا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ خدیو نے انہیں افتاء کے منصب سے معزول کرنا چاہا لیکن لارڈ کرومر نے ڈٹ کر مخالفت کی اور کہا کہ جب تک میں موجود ہوں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔

شیخ محمد عبدہ اس مخالفت سے ذرا بھی نہ گھبرائے بلکہ ازہر کی اصلاح میں کوشاں رہے۔ جمعیۃ الخیریۃ الاسلامیہ جو تعلیم کی اشاعت اور مفلوک الحال انسانوں کی مدد کے لئے ظہور میں آئی تھی۔ اس کی ترقی میں مصروف رہے وہ مجلس شوریٰ اور حکومت کے درمیان امن و سلامتی کے سفیر تھے۔ ان کو حکومت اور انگریز دونوں کا اعتماد حاصل تھا۔ ملکی معاملات میں ان سے مشورہ ہوتا۔ وہ خود تعلیم یافتگان میں دینی افکار پیدا کرتے اور سیاسی۔ اخلاقی اور اجتماعی اصلاح کی دعوت میں مصروف رہتے تھے۔

لیکن ان کے مخالف ریشہ دوانیوں میں لگے ہوئے تھے جس کی وجہ سے انکو چوکھی لڑائی لڑنا پڑی ۔ خدیو نے سید توفیق البکری کے ذریعہ ان کے اور ارباب ازہر کے درمیان ناچاقی پیدا کر دی اور مجلس انتظامیہ کو ترغیب دی کہ اگر شیخ محمد عبدہ مستعفی ہو جائیں تو ان کی جگہ ان کے مخالفوں کو دی جائے ۔ اور ان کی راہ میں روڑے اٹکائے جائیں ۔ ارباب ازہر کی بیشتر تعداد ان کو ناپسند کرتی تھی کیونکہ وہ ان کی محبوب قدامت پسندی کو نیست و نابود کرنے پر تلے ہوئے تھے اور ان کے تجدد جس سے وہ انہیں آشنا کرنا چاہتے تھے ۔ انہیں ہمدردی نہ تھی ۔ اس بنا پر عوام میں یہ لوگ ان کے کفر اور زندقہ کا ذکر پھیلاتے رہے ۔

حزب وطنی جس کے قائد مصطفیٰ کامل تھے ۔ ان سے برسرپیکار تھی ۔ ان کو وطن دشمنی کا طعنہ دیتی ۔ کیونکہ انگریزوں سے ان کی رسم و راہ تھی ۔ ان کے خلاف خفیہ رپورٹیں آستانہ بھیجی جاتیں ۔ جب وہ قسطنطنیہ پہنچے تو ان کا سرد مہری سے استقبال ہوا ۔ اگر اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم شامل حال نہ ہوتا ۔ تو دشمنوں نے ان کی ایذا رسانی کی جو تدبیریں کی تھیں وہ سب کامیاب ہو جاتیں

سزلیہ اخبارات اپنے کو مقبول عوام بنانے کے لئے ان کے خلاف ہرزہ سرائی میں مصروف تھے ۔ اس بارے میں ان کے دشمن ان اخبارات کی مالی امداد بھی کر دیا کرتے تھے ۔ اب ہر روز کوئی نہ کوئی نیا واقعہ پیش آتا ۔ ہر اخبار میں ان کا ذکر تھا ۔ ہر محفل میں ان کا تذکرہ تھا ۔ عوام کی زبان پر ان کا نام تھا ۔ ان کی جان عذاب میں پڑ گئی ۔ لیکن ان کے کوہ وقار میں لغزش نہ آئی ۔ اگرچہ وہ عصابی طور پر کمزور ہو رہے تھے ۔ اور ان کی صحت تباہ ہو رہی تھی ۔

اس زمانے میں ٹرانسوال کے بعض مسلمانوں نے ان سے فتویٰ پوچھا تھا ۔

۱ ۔ ایک جنگلی گائے کے سر پر تلوار ماری جاتی ہے جس سے وہ گر پڑتی ہے اور بسم اللہ پڑھے بغیر ذبح کر لی جاتی ہے ۔ کیا اس کا کھانا حلال ہے ؟

شیخ محمد عبدہ نے اس کے حلال ہونے کا فتویٰ دے دیا ۔ اس پر علماء نے قیامت برپا کر دی اور کہا یہ تو موقوذہ ہے جس کا کھانا حرام ہے ۔ شیخ محمد عبدہ نے جواب دیا کہ اس کا کھانا حلال ہے ۔ موقوذہ تو وہ ہے جس کو کند ہتھیار یا پتھر یا لکڑی سے مار دیا جائے ۔ لیکن اس گائے کو تو مرنے سے قبل

ذبح کر لیا تھا

سوال دوم ۔ اس ملک میں بعض لوگ بعض مصالح اور فوائد کے پیشِ نظر انگریزی ٹوپیاں استعمال کرتے ہیں۔ ان کا پہننا کیسا ہے؟ انہوں نے اس کے جواز کا فتویٰ دیدیا اور لکھا کہ اگر اس ٹوپی کا پہننے والا اسلام چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار نہیں کرنا چاہتا تو اس کو کافر کیسے سمجھا جائے گا؟ اس کا مقصد تو دھوپ اور جسمانی ضرر سے بچنا ہے۔ اس میں کوئی ناپسندیدہ بات نہیں ہے۔ اس پر الظاہر اور اللواء نے ان کے خلاف ہیجان بپا کر دیا۔ مخالفوں نے بعض فرانسیسی عورتوں کے ساتھ ان کا جھوٹ موٹ کا فوٹو بنا کر.... لارڈ کرومر کی خدمت میں پیش کر دیا کہ ایسا شخص منصب افتاء کے لائق نہیں ہو سکتا۔ لیکن برطانوی ہائی کمشنر نے ان کے قول پر کان نہ دھرا۔ اخبارات میں اس فوٹو کی نقلیں شائع ہوئیں تو ان کے ایڈیٹروں پر مقدمہ چلا اور ان کو قید کی سزا ہوئی۔

ان کے مخالفین کمینے حربوں کے استعمال سے باز نہ آتے تھے۔ ان کے بعض مخلص دوست مثلاً سعد زغلول۔ قاسم امین وغیرہ ازہر کی اصلاح کے بارے میں ان پر حرف گیری بھی کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اس طرح یہ کام ناممکن ہے۔ لیکن ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی۔ وہ اصلاح کے طور طریقے ساری رات جاگ کر سوچتے اور کہتے "میں دینی وجدان کی بنا پر ان مفاسد کو دیکھ کر چپ نہیں رہ سکتا۔ ان کے دیگر دوست خدیو کی ناراضگی مول لینے پر ان پر نکتہ چینی کرتے اور کہتے۔ کاش کہ یہ خدیو کی ہفوات سے آنکھیں بند کر لیتے اگر خدیو نے کسوۃ الشریف کی آسامی غیر مستحق کو دے دی تھی۔ تو ان کا کیا بگڑ جاتا یا ان کو چاہئے تھا کہ تبادلہ اراضی کے معاملہ میں چشم پوشی سے کام لیتے اس سے انکو اصلاحی عزائم کے بروئے کار لانے کا موقعہ مل سکتا تھا لیکن یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ جس شخص کی سیرت اور کردار حضرت علی مرتضیٰؓ جیسا ہو وہ امیر معاویہؓ جیسے خصال کیونکہ پیدا کر سکتا ہے۔ عمر فاروقؓ کے لئے عمرو بن العاص بننا بے حد مشکل تھا۔

بعض اصحاب نے ان پر حرف گیری کی ہے کہ انہوں نے خدیو عباس کی سیرت کے صرف ایک گوشہ کو دیکھا تھا۔ اس کی خوبیوں سے صرف نظر کر لیا تھا۔ حالانکہ وہ اجنبی اقتدار کا دشمن اور

وطن پر مرکوز تھا۔ شیخ محمد کی بعض سیاسی راہنماؤں سے بھی ان بن رہتی تھی۔ وہ ان پر تکبر اور خودرائی کا الزام دھرتے تھے۔ خود ان کے سیاسی عزائم زیادہ بلند نہ تھے۔ ان کی تصدیق ان دو مکتوب سے ہوتی ہے جو انہوں نے اپنے دوست مسٹر بلنٹ کو لکھے تھے اور ان کی وفات کے بعد شائع ہوئے تھے۔ ان کی سیاست سے خدیو مصر اور مصری احرار تو ایک طرف رہے بعض اعتدال پسند بھی متفق نہ تھے۔ ایک بڑے آدمی کی قدر وقیمت کا اندازہ لگانے کے لئے اس کی زندگی کے تمام گوشوں کو دیکھنا پڑتا ہے۔ شیخ محمد عبدہ سب سے پہلے دینی اور اجتماعی مصلح تھے۔ انہوں نے زبان وادب کی بھی بڑی اصلاح کی۔ ان کی شخصیت ان کے بلند افکار میں جلوہ گر تھی۔ وہ سب سے آخر میں سیاسی رہنما تھے۔ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ قوم کے وفادار اور مخلص دوست تھے۔ ان میں کسی قسم کا کھوٹ نہ تھا ان کا سیاسی مسلک عقیدہ کی بنا پر تھا اور وہ اسی میں قوم کی مصلحت سمجھتے تھے۔ ان سے غلطی اور بھول چوک کا بھی امکان ہو سکتا ہے۔

سچ بات یہ ہے کہ بہت سے سیاسی اکابر سیاست میں ان کے ہم رائے تھے جیسے سعد پاشا زغلول۔ فتحی پاشا زغلول۔ حسن پاشا عاصم اور محمود سلیمان پاشا وغیرہم لیکن انہیں سب سے زیادہ مخالفت کا نشانہ بننا پڑا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ خدیو مصر لوگوں کو ان کے خلاف برانگیختہ کرتے تھے۔ اور عوام بھی علماء کو سیاست سے کنارہ کش اور اجنبی تسلط کے حامی دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے۔

۱۹۰۵ء میں ازہر کی سطح بالکل ساکن تھی۔ ازہر کے شیخ سید علی ببلاوی تھے۔ جن کے شیخ محمد عبدہ سے مخلصانہ تعلقات تھے اور تمام امور حسب سابق سرانجام دیئے جا رہے تھے۔ کہ اچانک خدیو کے حاشیہ نشینوں نے شیخ ازہر اور مجلس انتظامی کے خلاف شکایات کا بازار گرم کر دیا۔ اس شور وغوغا کا یہ نتیجہ ہوا کہ سید علی البلباوی کو مستعفی ہونا پڑا۔ اور خدیو عباس نے شیخ عبدالرحمن الشربینی کو شیخ ازہر مقرر کر دیا۔ ان کے جمود اور رجعت پسندی کی وجہ سے شیخ محمد عبدہ ان کا ساتھ نہ دے سکے۔ شیخ شربینی کی تقرری پر ازہر میں تقریب منعقد ہوئی جس میں تقریر کرتے ہوئے خدیو نے شیخ محمد عبدہ پر شدید غیظ وغضب کا اظہار کیا اور کہا "ازہر دینی تعلیم کا مدرسہ ہے جس کی غرض وغایت مصر اور تمام

ممالک عربیہ میں علوم دینیہ کی اشاعت ہے۔ میری تمنا ہے کہ ازہر اور ازہریوں کی یہی شان امتیاز قائم رہے لیکن مقام تاسف ہے کہ اب لوگوں نے علم میں شورش اور دین میں شخصی مسائل کی آمیزش کر دی ہے۔ میری حکومت چاہتی ہے کہ ازہر کا ماحول پرسکون رہے۔ طلبہ اور علماء مفید علوم کے پڑھنے پڑھانے میں مصروف اور شورش سے دور رہیں۔ کیونکہ یہ مدرسہ سب سے پہلے دینی مدرسہ ہے۔ سید علی البیلاوی نے استعفیٰ پیش کر دیا اور میری حکومت کی عادت ہے کہ جو خدمت سے دستبردار ہونا چاہے اس کا استعفیٰ منظور کر لیا جائے۔ اب جو بھی تحریر و تقریر کے ذریعے وساوس واوہام اور ایہام پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس کو چاہیئے کہ وہ ازہر سے نکل جائے ان میں جو اجنبی ہے (اس سے مراد سید محمد رشید رضا مدیر المنار تھے) وہ اپنے ملک میں واپس چلا جائے وہاں جا کر جو کچھ چاہے وُہ کرتا پھرے۔"

ان حالات میں شیخ محمد عبدہ کو بھی مستعفیٰ ہونا پڑا اب وہ ازہر کی اصلاح سے مایوس ہو چکے تھے۔ اس حادثہ کے بعد ان پر بیماری کا حملہ ہوا اور وہ بغرض علاج یورپ کے سفر پر روانہ ہونے کا ارادہ کر رہے تھے۔ لیکن مجلس شوریٰ مجلس اوقاف اور جمعیۃ الخیریۃ الاسلامیہ کی ذمہ داریاں۔ امتحان دار العلوم اور مدرسۃ القضاء کے نظام الاوقات کی تیاری وغیرہ سدراہ بنی ہوئی تھیں۔ مرض بڑھتا گیا اطباء اس کی تشخیص میں مختلف الرائے تھے ان کو پتہ نہ چلتا تھا کہ یہ معدہ کی بیماری ہے یا جگر کی آخر سرطان کا مرض تشخیص ہوا۔ ڈاکٹروں نے سفر کی ممانعت کر دی ۔ اس بیماری سے انہوں نے بتاریخ ۱۱ جولائی ۱۹۰۵ء چھپن سال کی عمر میں اپنے دوست محمد بک راسم کے مکان پر سمندر کے کنارے سکندریہ میں انتقال کیا۔ سکندریہ اور مصر میں سرکاری اعزاز کے ساتھ ان کا جنازہ اٹھایا گیا۔ جنازہ میں انبوہ در انبوہ لوگ شامل تھے۔ اس وقت خدیو مصر سے باہر تھا جن لوگوں نے ان کی تکفین اور تجہیز میں حصہ لیا تھا ان کو سرزنش کی گئی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کا اصلاحی کارنامہ کیا تھا اس کے مبادیات کیا تھے اور ان کا قوم پر کیا اثر ہوا۔ ایک دفعہ سید جمال الدین افغانی نے ان کی غیرت، خودداری اور بلند نگاہی کو دیکھ کر کہا تھا۔ کہ یہ تو انسان کے پردے میں فرشتہ ہے!

اس عزتِ نفس کے ساتھ ان کا ضمیر بیدار تھا۔ مصیبت کے مارے ہوؤں سے ہمیشہ شفقت اور مہربانی سے پیش آیا کرتے تھے۔ ان کے پاس جو کچھ بھی ہوتا وہ ان پر خرچ کر دیا کرتے تھے آتش زدگی کے واقعہ پر اپنے دلی تاثر کا اس طرح حال بیان کرتے ہیں "جب میں نے اس کا حال پڑھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرا اپنا دل پاش پاش ہو جائے گا۔ مجھے ساری رات نیند نہ آئی۔ اور نیند کیسے آ سکتی تھی جب کہ میں تو راحت و آرام میں ہوں اور میرے دوسرے بہن بھائی سخت مصیبت سے دوچار ہوں۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکتا تھا وہ میں نے فوری طور پر کیا۔ لیکن یہ اونٹ کے منہ میں زیرہ کے برابر تھا۔ میں نے اعیان شہر کو جمع کیا تاکہ وہ تھوڑے سے وقت میں اس خیر و برکت کے کام میں حصہ لیں" اس طرح ان کے امدادی کام بے شمار ہیں۔

سید جمال الدین افغانی کے ان الفاظ میں ان کی تصویر کشی کی ہے! "ان کے کپڑوں میں بعض اوقات بجلی بھرا اٹھتا ہے" اس سے مراد ان کا مغلوب الغضب ہونا ہے۔ جیسا کہ خدیو کے بارے میں انہوں نے غیظ و غضب کا اظہار کیا تھا۔ درس میں کبھی ان سے غیر معقول سوال کیا جاتا تو وہ خفگی سے پیش آتے تھے۔ لیکن یہ غصہ قوت کا باعث بھی ہوا کرتا تھا۔ وہ حق کے معاملے میں غصہ ضبط نہ کر سکتے تھے۔ لیکن لوگوں کے دکھ اور تکلیف کو دیکھ کر منفعل بھی ہو جایا کرتے تھے۔ بسا اوقات یہ گرم مزاجی انہیں بارعب اور باوقار بنا دیتی تھی۔

اس ہیبت اور جلال کے علاوہ وہ نیک دل، دوستوں کے وفادار، خوش گفتار، رواداری اور انصاف پسند تھے۔ وہ لگی لپٹی رکھے بغیر سچ بات کہنے کے عادی تھے۔ اس صاف گوئی میں ان کا بھروسہ اپنے ایمان اور اپنے معبود پر ہوتا۔ اس عادت کی وجہ سے انہیں بعض دفعہ مصائب میں بھی گرفتار ہونا پڑا۔ جنہیں وہ صبر اور ثبات سے برداشت کر لیتے تھے۔ ان کی اہم خصوصیت اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ان کی غیرت مندی ہے یہ ان کے اعمال کا محور، مضمونوں کا سرچشمہ اور آرزوؤں کا ذریعہ تھی۔ میرے ایک دوست نے مجھے بتایا کہ میں ان کے ساتھ جنیوا گیا۔ ہم وہاں کی یونیورسٹی میں تقریریں سننے جایا کرتے تھے۔ اچانک اسلام اور مسلمانوں کا ذکر چل نکلا۔ شیخ محمد عبدہ نے کہا کہ اسلام کے عقیدہ

کی اصلاح اور اس کو اوہام اور خرافات سے پاک کرنے کیلئے میں نے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ علماء میں خرافات اور اوہام کے سوا اور کیا رہ گیا ہے اور اگر یہ خرافات اور اوہام بھی نہ رہے تو کیا باقی رہے گا۔ یہ سن کر ان کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا اور وہ اتنے ناراض ہوئے کہ میں نے ان کو کبھی اتنا مغلوب الغضب نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اپنے قول کی تاویل کی تو ان کا غصہ فرو ہوا۔ اس راہ میں انہوں نے بہت سی تکالیف برداشت کی تھیں۔ ان کو اتہام اور دشنام طرازی کا نشانہ بنایا گیا۔ ان کے خلاف سازشیں کھڑی کی گئیں۔ ان کے دوستوں نے ان کو اس راہ سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن ان کی غیرت نے اصلاحی کام چھوڑنا گوارا نہ کیا۔

شیخ محمد عبدہ نے اپنے طریق کار اور نصب العین کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے۔ میری دعوت دو اہم باتوں کے متعلق ہے۔ ۱۔ تقلید کی قید سے فکر کو آزاد کرنا۔ دین کو سلف صالحین کے طریقہ پر سمجھنا۔ دین کے اولین سرچشمہ کی طرف رجوع کرنا۔ عقل بشری سے اس کو پرکھنا ...... اس بنا پر ہم ان کو علم دوست، کون و مکان کے رموز کی تلاش پر برانگیختہ کرنے والے حقائق ثابتہ کے احترام کے داعی اور ادب نفس اور اصلاح عمل کے لئے ان کی پابندی کے طالب کہہ سکتے ہیں۔ ۲۔ عربی زبان کے اسلوب بیان کی اصلاح۔ مصر میں عربی انشاء کے دو طریقے تھے جو ذوق صحیح کے منافی اور لغوی لحاظ سے بھی نامانوس تھے۔ سرکاری مراسلات ایسی زبان میں لکھے جاتے تھے جو ناقابل فہم ہوتی اور جس کا دنیا کی زندہ زبانوں سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ دوسری قسم وہ تھی جو ازہر کے فاضل استعمال کرتے تھے۔ یہ زبان سجع اور اجناس سے بوجھل ہوتی۔ ذوق سلیم سے عاری ہوتی کانوں کو ناگوار گذرتی اور معنیٔ مقصود کو ادا کرنے سے قاصر رہتی۔

ایک جگہ لکھتے ہیں کہ میں ایک امر کی طرف لوگوں کو دعوت دیتا رہا ہوں جس سے وہ ناآشنا تھے لیکن اسی پر ان کی اجتماعی زندگی کا انحصار تھا۔ لوگوں کو پتہ نہ تھا کہ حکومت پر ان کا کیا حق ہے اور حکومت پر ان کے کیا واجبات ہیں۔ میں نے انہیں اس عقیدہ کی طرف دعوت دی کہ اگرچہ حاکم کی طاعت واجب ہے لیکن پھر بھی وہ انسان ہے۔ اس پر ہوائے نفس قابو پا سکتی ہے اس کی من مانی کاروائیوں کو قوم کی

خیر خواہی ہی رنگ لا سکتی ہے۔ ہم نے اس کی کھلے بندوں اشاعت کی حالانکہ شخصی حکومت کے جھنڈے گڑے ہوئے تھے۔ اور عوام غلاموں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس کے بعد میں نے حکومت اور عوام کے مسائل کو اللہ کے سپرد کیا۔" اس مختصر سی تحریر میں ان کی اصلاحی دعوت اس کے اغراض و مقاصد ان کی کامیابی و ناکامی کا بیان ہے۔ ان کے پیش نظر تین مقاصد تھے۔ (۱) دینی اصلاح زبان و ادب کی اصلاح اور سیاسی اصلاح اب ہم ان کا مختصر سا حال لکھتے ہیں۔

دینی اصلاح کے لئے الازہر ان کے پیش نظر تھا ان کا خیال تھا کہ اس کی اصلاح سے عالم اسلام کی بہت بڑی خدمت ہو گی۔ کیونکہ اس سے جو علماء فارغ التحصیل ہو کر نکلیں گے۔ وہ غیور اور ہوشمند ہوں گے اور وہ عالم اسلام کے گوشہ گوشہ میں ان کی دعوت پہنچائیں گے۔ اس بارے میں انہوں نے خدیو مصر۔ برطانوی ہائی کمشنر اور دوستوں سے مدد چاہی۔ اس ضمن میں انکی اصلاحی کوششوں کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ لارڈ کرومر نے ان کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ روشن دماغ۔ بلند نظر تھے لیکن عالم خیال میں رہنے والے تھے ان کی وطن پروری شبہ سے بالا ہے۔ اس کے باوجود ازہر کے بارے میں ان کی کوششیں بار آور نہ ہو سکیں۔ وہ اپنے پیچھے ایک ہم خیال طبقہ چھوڑ گئے جو ان کے افکار کا حلقہ بگوش تھا۔ گو اس میں ان جیسی سرگرمی اور غیرت مندی نہ تھی۔

عقیدہ کی اصلاح کے لئے انہوں نے قرآن پاک کی تفسیر کو ذریعہ بنایا۔ بیروت کی دو مسجدوں میں وہ قرآن پاک کا درس دیتے تھے۔ اس کے بعد جب وہ مفتی بن کر مصر آئے تو ازہر میں قرآن پاک کی تفسیر پڑھانے لگے۔ الجزائر میں انہوں نے سورۃ العصر کی تفسیر املا کرائی تھی۔ پارہ عم کی تفسیر جمعیۃ خیریۃ الاسلامیہ کے مدارس کے طلبہ کے لئے لکھی۔ یہ تمام تفاسیر رسالہ المنار میں عالم اسلام کے استفادہ کیلئے اشاعت پاتی تھیں۔

تفسیر کرتے وقت وہ پہلے آیت کی تلاوت کرتے اگر اس آیت کا عقیدہ سے تعلق ہوتا تو اس کی اچھی طرح تشریح کرتے۔ موضوع کے لحاظ سے جتنی آیات مذکور ہوتیں وہ سب بیان کرتے۔ اس کے بعد مسلمانوں کے عقیدہ میں جو مفاسد اور بدعات راہ پا گئی ہیں۔ ان کا ذکر کرتے اگر کوئی آیت اخلاق سے

متعلق ہوتی تو اخلاق فاضلہ کا جو اثر قوم کی اصلاح پر ہوتا ہے۔ وہ بھی بیان کرتے۔ جب کوئی آیت اجتماعی حالت کے بارے میں ہوتی تو قوموں کی زندگی میں اس حالت اجتماعی کا ذکر کرتے واقعات عالم ثبوت میں پیش کرتے۔ ان کا فصیح و بلیغ اور دل میں اتر جانے والا طرز بیان اس پر مستزاد ہوتا۔ ان کی تفسیر عملی اور واقعاتی ہوتی۔ چونکہ اسلام کے مبادیات پر عمل کی دعوت دیتی۔ اس سے پتہ چلتا کہ صرف اسلام ہی ہر زمانہ میں سعادت کا سرچشمہ رہا ہے اور وہ روحانی اعتبار سے نفس انسانی کو اوج کمال پر پہنچا دیتا ہے۔ مسلمانوں کے عقائد میں جو شرک۔ مزارات کی پرستش۔ اہل قبور سے شفاعت چہلم اور سالانہ رسومات نذر و نیاز وغیرہ کی جو بدعات داخل ہو گئی ہیں۔ ان کا ذکر کر کے خالص توحید بیان کرتے۔ اسلام کے اصلی اصولوں کی طرف رجوع کی دعوت دیتے۔۔۔۔۔ ان کی تعلیمات وہابیوں سے مشابہت رکھتی ہیں۔ ان کی طرح وہ بدعات۔ خرافات اور اوہام سے عقیدہ کو صاف رکھنا چاہتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ جدید تمدن کی ان چیزوں کو قبول کرنے کی دعوت دیتے تھے جو اسلام کی تعلیمات سے مطابقت رکھتی ہوں۔

اسلام دین توحید ہے اس میں کسی قسم کا شرک نہیں۔ یہ اور تجسیم سے پاک ہے۔ اس کا مدار عقل پر ہے۔ جس سے سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ اس جہان کو بنانے والا وہی اکیلا عالم اور قادر ہے۔ دین کے لئے عقل بھی ضروری ہے جو اس کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔ مذہب بھی عقل کے لئے ضروری ہے۔ جس سے وہ پختہ اور مکمل ہوتی ہے۔

اسلام کا سینہ علم کے لئے کھلا رہتا ہے اور وہ اس کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اس علم سے کون و مکان کے اسرار و رموز کھلتے ہیں۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی معرفت اور جلالت کا پتہ چلتا ہے۔ وہ تفسیر کرتے وقت اسلام اور جدید تمدن کے نظریات کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتے اس کے لئے بعض دفعہ انہیں تاویل کا سہارا لینا پڑتا۔

ان کی تفسیر جذبات کو بیدار کرتی۔ مشاعر میں حرکت پیدا کرتی اور علم و عقل سے زیادہ دل کو اپیل کرتی کیونکہ وہ مذہب سے زیادہ متاثر تھے۔ فلسفہ اسلامیہ میں ان کی معلومات حیرت انگیز تھیں۔

انہوں نے جدید تمدن کو بھی قریب سے دیکھا تھا۔ اور اس کے بعض اصولوں کا مطالعہ کیا تھا۔ یورپ کے سیر و سفر میں وہاں کے اعاظم الرجال اور فلاسفروں سے تبادلہ خیال کیا تھا اور ان کے خطبات سے استفادہ کیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے مسلمانوں کی حالت پر نظر ڈالی تو انہیں عوام کے عقائد اور اعمال میں بگاڑ نظر آیا اور انہوں نے قرآن پاک کی تفسیر کو جملہ اصلاحی اعمال کا محور قرار دیا۔

اس طرح وہ نو سال تک ازہر میں قرآن پاک کا درس دیتے رہے۔ ان کے درس میں قوم کے سربراہ۔ بڑے بڑے قاضی، سرکاری عہدہ دار۔ ازہر کے نوجوان اور مدارس عالیہ کے طلبہ حاضر ہوتے اور ان کے خیالات سے متاثر ہو کر نکلتے۔ ان کا خیال تھا۔ کہ یورپی تقلید اور عقلی اصلاح کے بجائے دین کی راہ سے مسلمانوں کی اصلاح آسان ہے اس طریق اصلاح کو مسلمانوں کے تمام مصلحین اختیار کر چکے تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "سب کی غرض مقصود عقائد کی اصلاح ہے۔ دین کے نصوص کی فہم میں جو غلطیاں شامل ہو چکی ہیں۔ ان کا ازالہ کرنا ہے۔ اگر عقائد بدعات سے پاک ہو سکیں تو اعمال خود بخود درست ہو جائیں گے۔ افراد کے معاملات سنور جائیں گے۔ دینی اور دنیوی علوم کے مطالعہ سے ان میں بصیرت پیدا ہو گی۔ ان کے اخلاق سدھر جائیں گے۔ جس سے ساری قوم کی اصلاح ہو گی۔ جب کہ مذہب تہذیب اخلاق۔ اصلاح اعمال اور سعادت مندی کے لئے ضامن ہے تو اس کو چھوڑ کر دوسرا ذریعہ ڈھونڈنا بے معنی ہے۔"

اس فکری اساس پر وہ مدارس کے نصاب تعلیم کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ تاریخ اسلام کے عمیق مطالعہ اور عقائد صحیحہ کی تبلیغ سے عوام کی اصلاح ہو سکے۔ وہ ہر موقعہ پر تعلیمی اصلاح کا مطالبہ پیش کر دیتے۔ عرابی پاشا کی بغاوت سے پہلے جب وہ الوقائع المصریہ کی ادارت کرتے تھے تو ان کی کوشش و سعی سے مجلس برائے اعلیٰ تعلیم کی بنیاد پڑی اس کے وہ سرگرم ممبر تھے۔ جب وہ بیروت میں جلاوطنی کے ایام گذار رہے تھے تو انہوں نے ایک جامع منصوبہ بنا کر شیخ الاسلام کی خدمت میں قسطنطنیہ روانہ کیا۔ مصر واپس آئے تو لارڈ کرومر کے پاس یہی تجویز پیش کی۔ جب اس پر کچھ عمل درآمد نہ ہو سکا تو ان کو امید تھی کہ انہیں دارالعلوم کا پرنسپل بنا دیا جائے گا اور وہ طلبہ میں اپنی اصلاحی روح۔

پھونک سکیں گے۔ جب اس سے بھی مایوس ہو گئے تو انہوں نے جمعیۃ الخیریۃ الاسلامیہ کو اپنے اعمال کا مرکز بنالیا۔ وہاں کے طلبہ کے لئے نصاب تعلیم وضع کیا تیسویں پارے کی تفسیر لکھی۔ ان اقدامات سے وہ اپنے تعلیمی اغراض ومقاصد کی تکمیل کرنا چاہتے تھے۔ ان تعلیمات کی اشاعت کے علاوہ وہ مذہب اسلام کی حمایت میں بھی مصروف رہتے تھے۔ اگر کوئی اسلام پر نکتہ چینی کرتا۔ تو وہ سخت غضبناک ہوجاتے اس کے ثبوت میں دو واقعات لکھے جاتے ہیں۔

سنہ ۱۹۰۰ء کے اوائل میں موسیو ہانوتو نے اسلامی ممالک میں فرانس کی سیاست کا ذکر کرتے ہوئے ایک مقالہ اسلام پر لکھا تھا۔ اس میں اسلامی اور مسیحی تمدن کا موازنہ اور اللہ تعالیٰ کی ذات اور قضاء و قدر کے معاملہ میں دونوں مذاہب کا مقابلہ کیا تھا اور یہ رائے ظاہر کی تھی کہ عیسائیوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کے عقیدہ تثلیث اور تصعید باری تعالیٰ درباره الانسان نے ان کو انسانی مرتبہ سے اونچا اور ذات الٰہیہ سے ۔ ۔ ۔ قریب کر دیا ہے۔ اور اسلامی عقیدہ جو توحید کی دعوت دیتا ہے اور اللہ تعالےٰ کو بشریت سے منزہ کرتا ہے مسلمانوں میں کمزوری اور ہمت شکنی پیدا کرتا ہے۔ مسیحی عقیدہ انسان اور اس کے ارادہ کی حریت کا قائل ہے۔ اس کو عمل اور کوشش پر برانگیختہ کرتا ہے لیکن قضاء و قدر کے بارے میں اسلامی عقیدہ جمود اور بے عملی پیدا کرتا ہے۔

اس مقالہ کا ترجمہ المؤید میں شائع ہوا تو اس کو پڑھ کر شیخ محمد عبدہ کی نیند حرام ہوگئی۔ انہوں نے اس کا رد لکھا جس کا پہلا نمبر دوسرے دن شائع ہوا اس طرح قسطوار ان کا جواب شائع ہوتا رہا۔ اس میں انہوں نے اسلام کی فضیلت اور فکری لحاظ سے عقیدۂ توحید کی برتری بیان کی تھی۔ اور کہا تھا کہ اسلام نے جبریت کی دعوت بالکل نہیں دی جو ہانوتو نے غلطی سے سمجھ لیا ہے۔ قرآن پاک میں ۶۴ آیتیں ارادہ کی آزادی کے بارے میں آئی ہیں۔ ان مقالات کا مجموعہ بعد میں "الاسلام والنصرانیۃ" کے نام سے شائع ہوا۔

دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ فرح انطون نے الجامعہ میں ایک مضمون ابن رشد پر لکھا تھا جس میں یہ ثابت کیا تھا کہ جہاں تک علم اور فلسفہ کا تعلق ہے۔ عیسائیت اسلام کی نسبت زیادہ روادار اور فراخ حوصلہ رہی ہے۔ شیخ محمد عبدہ نے اس کے جواب میں مقالات کا سلسلہ شروع کیا۔ اور ثابت کیا کہ جس طرح اسلام اور مسلمانوں نے فلسفہ، اہل علم اور دوسرے مذاہب کی خدمت کی ہے۔ اس کی نظیر دیگر مذاہب

پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

یہ ان کی دینی خدمات کا مرقع ہے۔

انہوں نے لغوی اور ادبی اصلاح کی ابتدا اپنے اسلوب بیان سے کی پہلے وہ الازہر میں ازہری علماء کی طرح لکھتے تھے۔ ان کا طرز تحریر فلسفہ اسلامیہ کی کتابوں سے متاثر تھا اور اسی مسجع اور مقفیٰ طرز تحریر کا ملک میں بھی چلن تھا۔ موضوع شروع کرنے سے پہلے لمبی چوڑی تمہید ہوتی۔ اس کے بعد ان کے طرز تحریر میں پختگی آتی گئی۔ زور بیان انہوں نے اپنے استاد سید جمال الدین افغانی سے حاصل کیا تھا۔ العروۃ الوثقیٰ کے مقالات اس پر شاہد ناطق ہیں۔ غزارت معنی سلاست بیان اور طرز ادا کی سادگی اسلام والنصرانیہ میں نمایاں ہے۔ ارباب صحافت کو وہ نکھے اسلوب بیان کی طرف توجہ دلاتے تھے اور ان کو اس کا معیار بلند کرنے کے لئے کہتے۔

بیروت کے مدرسہ سلطانیہ میں وہ انشاء سکھاتے تھے اس زمانہ میں انہوں نے مقامات بدیع الزمان اور نہج البلاغۃ کی شرحیں لکھیں اور چھپوا کر شائع کرائیں تاکہ نومشق ان کو دیکھ کر جدید اسالیب بیان سے آشنا ہو سکیں۔

جب وہ مصر واپس آئے تو علم بلاغت کا درس دینا شروع کیا۔ ان کے درس بلاغت میں فلسفہ کی آمیزش نہ ہوتی۔ جس نے علم بلاغت کا ستیاناس کر دیا ہے ان کا درس ادبی ہوتا جس سے ذوق سلیم کی پرورش ہوتی اور اسلوب بیان نکھرتا۔ انہوں نے امام عبد القاہر الجرجانی کی کتابیں دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغۃ کا بھی درس دیا۔ ان کو چھاپ کر شائع کرایا۔ اس سے پہلے لوگ علم بلاغت کے صحیح مفہوم سے آشنا نہ تھے۔

۱۳۱۹ھ میں ان کی سرکردگی میں جمعیۃ احیاء الکتب العربیہ کی بنیاد پڑی۔ اس جمعیۃ کا پہلا کام یہ تھا کہ لغت کی مشہور کتاب المخصص شیخ محمد محمود الشنقیطی کی تصحیح سے شائع کرائی۔ اس کے بعد شیخ محمد عبدہ نے مدونہ امام مالک کے قلمی نسخے۔ تونس اور فاس سے منگوائے اور تصحیح اور ترتیب کے بعد اس کتاب کو چھاپ کر شائع کیا۔ شیخ محمد محمود الشنقیطی لغت عرب کے بہت بڑے عالم تھے۔ لوگوں کو ادب کی تعلیم دیتے اور مشکل کتابیں تصحیح سے چھاپتے۔ انہوں نے شیخ محمد عبدہ کی وجہ سے مصر میں قیام کیا۔ وہ لغوی تحقیقات کی اشاعت میں لگے رہتے جو کہ ان کے تبحر علمی پر دال تھیں۔

انہوں نے مبرد کی کتاب الکامل اور اہتمام کے حماسہ کی تعلیم کے لئے ازہر میں استاذ سید المرصفی کو مقرر کیا۔ اس سے پہلے ازہر والے ان کتابوں سے نا آشنا تھے۔ اس سے ادبی اور لغوی تحریک کی ترقی میں بڑی مدد ملی۔ بہت سے ادیب اور ان کے تلامذہ اس تحریک سے متاثر ہوئے اگر ہم کہہ دیں کہ انہوں نے مسجع اور سخیف طرز عبارت کو سادہ اور آسان زبان سے بدل دیا جس میں معانی اور زور بیان ساتھ ساتھ چلتا تھا تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔

جب سے وہ مجلس شوریٰ کے ممبر مقرر ہوئے تھے۔ وہ اس کے سرگرم کارکن تھے مجلس شوریٰ میں ان کی کارکردگی کو ان کے دوست حسن عاصم اس طرح بیان کرتے ہیں "۱۸۹۹ء میں شیخ محمد عبدہ مجلس شوریٰ کے ممبر نامزد کئے گئے۔ اس وقت ممبروں اور ارباب حکومت میں اختلاف رائے تھا۔ جس سے حکومت نے مجلس کی بہت سی قراردادوں کو جن میں قوم کی بھلائی تھی معطل کر رکھا تھا۔ شیخ محمد عبدہ ممبر بنے تو انہوں نے بصیرت کی نظر سے تمام معاملات کو دیکھا اور سمجھ لیا کہ اس سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ انہوں نے اختلاف رائے کے اسباب کو دور کرنے کی کوشش کی اور حکومت کو سمجھایا مجلس شوریٰ نے بھی دیکھ لیا کہ حکومت بھی عوام کی ترقی اور بھلائی میں مخلص ہے۔ ان کی وجہ سے دونوں نے ایک دوسرے کا نقطہ نظر سمجھا اور بہت سے پیچیدہ معاملات سلجھ گئے۔

یہ تو ان کا سرکاری کردار تھا۔ اب قومی کارنامہ سنیئے۔ اس کا ذکر انہوں نے ان الفاظ میں کیا ہے۔ "سب سے پہلے رائے عامہ کی بیداری ضروری ہے تاکہ عوام اپنے حقوق اور واجبات اچھی طرح سمجھ لیں۔ حاکم بھی ایک بشر ہوتا ہے جس سے بھول چوک کا امکان ہے۔ جب وہ قول و فعل میں حد سے تجاوز کر جائے تو رائے عامہ کی بیداری ہی اس کا ہاتھ پکڑ سکتی ہے۔ بیداری کے لئے تعلیم کی اشاعت ضروری ہے۔ اس کے لئے اجتماعی تعلیم اور صحت مند صحافت نہایت ضروری ہے۔ مجلس شوریٰ کے ممبروں کی تربیت بھی لازمی ہے تاکہ وہ مسائل پیش آمدہ کا اچھی طرح مطالعہ کر کے۔ خلوص نیت اور امانت سے اظہار رائے کر سکیں۔

سیاست میں وہ سیاسی پختہ کاری کی بنیاد تربیت اور تعلیم پر رکھتے تھے اس کے لئے ان کا پروگرام عقلی تھا نہ کہ جذباتی۔ لیکن سیاسی امور میں وہی شخص کامیاب ہوتا ہے جو جذبات کو مشتعل کر سکے۔ لہذا عبداللہ ندیم اور مصطفی کامل بطور سیاست دان کے ان سے زیادہ کامیاب رہے ہیں۔

ان کو اپنی سیاسی ناکامی کا احساس بھی تھا۔ حاکم اور محکوم کے بارے میں ایک دفعہ انہوں نے کہا تھا۔ "میں نے ان معاملات کو قدرت کے سپرد کر دیا ہے۔ ان کا علم اب اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے" اس میں ناکامی کی صدا سنائی دیتی ہے۔

ان کی اصلاحی۔ دینی اور سیاسی دعوت نے بہت سے دشمن بھی پیدا کر دیئے تھے۔ ان کی دینی دعوت کے دشمن جامد علماء تھے۔ جو اولیاء، قبور، اور نذر و نیاز، محافل میلاد کے معتقد تھے۔ جن کا علم اور فتویٰ کا مدار فقہائے متاخرین کے اقوال پر تھا۔ ظروف اور احوال کو دیکھ کر کوئی بھی اجتہاد نہ کر سکتا۔ نہ دین کے اوّلین اصولوں سے احکام مستنبط کر سکتا تھا۔ دوسرا گروہ حسد سے ان کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تھا کیونکہ اس گروہ کا بازار سرد ہونے لگا تھا۔ ان کے نقائص اور عیوب روز روشن کی طرح عیاں تھے۔ انہوں نے دین کا نام لے کر ان کے خلاف طوفان بدتمیزی کھڑا کر دیا۔ ان میں بعض خدیو عباس کے آلہ کار تھے۔ جو شیخ محمد عبدہ کی سیاست کو ناپسند کرتا تھا۔ لیکن ان کو میدان سیاست سے ہٹانے کے لئے بعض علماء سے کام لیتا تھا۔ بعض دشمن شریف طبیعت تھے۔ ان کی بیشتر تعداد نے یورپ میں تعلیم پائی تھی۔ ان کی رائے میں شیخ محمد عبدہ نیک دل اور بھلائی پسند تھے۔ ان یورپ زدوں کو شیخ محمد عبدہ کی معتدل سیاست ایک آنکھ نہ بھاتی تھی جو اجتماعی اصلاح کے بطریق مذہب قائل تھے۔ یہ لوگ صرف عقلی نقطۂ نظر سے اجتماعی اصلاح کے کوشاں تھے۔ یورپین نظام حکومت اور مختلف سیاسی اور اقتصادی نظاموں میں ملک کی بھلائی محدود سمجھتے تھے۔ یہ لوگ ان کی دینی اصلاح کے مخالف بھی تھے۔ اس مخالفت نے ان کے قوی اور ملکات کو اور مضبوط کر دیا۔

سیاست میں وہ حزب الوطنی کے بھی زیادہ قائل نہ تھے۔ کیونکہ یہ گروہ سب سے پہلے انگریزوں کو مصر سے باہر نکالنا چاہتا تھا جس کا دارومدار عقل سے زیادہ جذبات پر تھا۔ یہ گروہ تعاون کی بجائے ترک موالات کا حامی تھا۔ ان دونوں دینی اور سیاسی جماعتوں نے مل کر عوام کو شیخ محمد عبدہ کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا۔ عوام کی نظروں میں ان کو گرانے کی کوشش کی۔ ایک ان کے خلاف دینی کفر تو دوسرا سیاسی کفر کا فتویٰ دیتا۔

شیخ محمد عبدہ اللہ کو پیارے ہو گئے تو یہ شور و غوغا بھی مٹ گیا لیکن ان کے نفع بخش کارنامے باقی رہ گئے

انہوں نے مسلمانوں کے دینی جذبات گرمائے۔ انہیں غفلت کی نیند سے بیدار کیا۔ تاکہ وہ نفوس کی

اصلاح اور اپنے نفس کی تکمیل کر سکیں۔ اپنے ماضی پر فخر نہ کریں بلکہ حاضر اور مستقبل کی نیئے سرے سے بنیاد رکھیں۔ انہوں نے عقل کی فرمانروائی کی تلقین کی۔ اجتہاد کا مدار دین اور عقل کو بتلایا تاکہ وہ جدید تمدن کے نئے مسائل کا اچھی طرح سے سامنا کر سکیں۔ اس کی اچھی باتوں کو اپنا سکیں۔ کیونکہ مسلمان الگ تھلگ رہ کر زندہ نہیں رہ سکتے۔ ان کو دشمنوں کے ہتھیاروں سے مسلح ہونا ہوگا۔ اس دنیا میں بہترین اسلحہ علم ہے۔ اخلاق کا سہارا مذہب پر ہے۔ اور خوش قسمتی سے اسلام نے اپنا سینہ علم کے استقبال کے لئے کھولا ہوا ہے۔ وہ علم کی تحصیل کے لئے اپنے پیروؤں کو آمادہ کرتا ہے اس کی انہیں ترغیب دیتا ہے۔ عقل سے کام لینے کی تحریص دیتا دیتا ہے۔ اور جدید تمدن بھی اخلاق فاضلہ کی دعوت دیتا ہے

انہوں نے اپنے پیچھے ایک مدرسہ فکر چھوڑا ہے۔ جو ان کی تعلیمات اور افکار پر ایمان رکھتا ہے بعض ان کے براہ راست فیض یافتہ تھے۔ بعض لوگ مختلف ممالک اسلامیہ میں ان کے مضامین اور تصانیف کے مطالعہ سے ان کے عقیدت مند ہو گئے تھے۔ اس مدرسہ فکر کا اثر نمایاں طور پر ظاہر ہے۔ ہم بغیر کسی شک و شبہ کے یہ حکم لگا سکتے ہیں کہ جن اکابر نے ان کے بعد دینی۔ اجتماعی اور سیاسی اصلاح کی دعوت دی۔ وہ تمام پر ان کے شاگرد یا متاثر ہونے والے دوست تھے۔

ان کے اثر کی قوت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کی دعوت نظری نہ تھی جس کا انحصار خطبات اور مقالات پر ہوتا ہے جیسا کہ بعض مصلحین کا حال ہے بلکہ تمام تر عملی تھی۔ وہ حقیقی زندگی کے معرکہ میں گھس جاتے تھے تاکہ اپنے اصلاحی پروگرام کو بروئے کار لا سکیں۔

اگر وہ مر گئے اور ان کے دل میں احساس ناکامی تھا تو ان کے صبر کے لئے یہ کافی ہوتا کہ ان کے افکار زندہ جاوید رہیں گے جن کا ان کی وفات کے بعد بھی عمل جاری اور ساری رہے گا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ،

○

خاتمۂ کلام

ان مصلحوں کی دعوت نے قوم پر بھاری اثر چھوڑا۔ اس کو ہمہ جہت ترقی ملی اور پہلے کی نسبت حالات کافی سدھر گئے۔

ان کی زندگی میں مغرب نے مشرق پر اپنا تسلط جما لیا تھا۔ سیاسی استیلاء کے ساتھ اس کا تمدن بھی ہمراہ آیا۔ مادی تمدن جیسے ریلوے لائن کی تعمیر۔ آلات صناعیہ۔ مخترعات جدیدہ کے علاوہ فکری اور معنوی تمدن از قسم عقائد۔ عادات اور نظم ہائے حکومت نے بھی یورش کی۔ مادی تمدن کو تو عالم اسلام نے آسانی سے قبول کر لیا۔ کیونکہ اس کی نفع رسانی بالکل عیاں تھی۔ اور پھر یورپ بھی ہر ممکن وسائل سے ان کو فروغ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیونکہ اس کی اشاعت میں اس کا فائدہ تھا۔ ریلوے لائن کی تعمیر سے اس کے اثر و نفوذ کو تقویت ملتی تھی۔ حکومت میں آسانی رہتی تھی۔ مخترعات کی اشاعت سے ان کی صناعت کے فروغ میں مدد ملتی تھی۔ اب تمام ایجادات و آلات قوم کے سب طبقوں میں پھیل چکے تھے۔ قصر امیر کے علاوہ غریب کی جھونپڑی بھی ان ایجادات سے متاثر ہو رہی تھی۔ اب غریب کسان کی دسترس میں بھی بہترین لیدین کپڑا آچکا

لیکن معنوی تمدن از قسم افکار اور عقائد کو ڈرتے ڈرتے قبول کیا گیا۔ ان کی وہ پذیرائی نہ ہو سکی جو مادی تمدن کے وسائل کی ہوئی تھی۔ کیونکہ بعض اوقات یہ معنوی تمدن موروثی افکار اور تقالید سے متصادم ہوتا تھا۔ بعض اونچے طبقے کے لوگ یا جدید تعلیم یافتہ ان یورپین افکار اور عقائد سے متاثر ہو سکے اور اخبارات کی راہ سے عوام کے محدود حلقہ میں راہ پانے لگے۔ جدید افکارات سے نبرد آزما ہونا ان مصلحین کا سب سے مشکل کام تھا۔ ہر ایک مصلح اپنے مذاق اور طبیعت کی مناسبت سے اپنی راہ عمل متعین کرتا۔ ان میں کوئی تو غیر ملکی حکومت کے تعاون سے اشاعت تعلیم میں مصروف ہو جاتا۔ تاکہ قوم آزادی کی طلب کے قابل ہو سکے۔ ان میں۔ سر سید احمد خاں۔ خیر الدین تونسی۔ علی پاشا مبارک اور شیخ محمد عبدہ کا شمار ہے۔ بعض کا یہ عقیدہ تھا کہ قوم کی بھلائی کے لئے ملکی آزادی ضروری ہے۔ داخلی اصلاح ثانوی چیز ہے۔ کیونکہ جب تک اجنبی

غاصب موجود ہیں۔ داخلی اصلاح ناممکن ہے کیونکہ وہ شاطرانہ چالوں سے داخلی اصلاح کو ناکام بنا دیتے ہیں۔ اس سے ان کے مستعمرات پر زد پڑتی تھی۔ مصلحین کے اس طبقہ میں سید جمال الدین افغانی اور عبداللہ ندیم آتے ہیں۔

پھر یہ جدید افکار اور خیالات اور علوم ادبیہ اپنے اندر آزادی کا بے پناہ جذبہ رکھتے تھے۔ ان کے مطالعہ سے انسان کو اپنے حقوق کی سمجھ آتی ہے۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ چاہے اس نے اندرون ملک میں تعلیم پائی ہو۔ یا بیرون ملک میں۔ مغربی تمدن کا مطالعہ کرتا اور دیکھتا کہ دوسری قوموں نے کس طرح آزادی حاصل کی ہے۔ حقوق کے حصول کے لئے کن دشوار گذار راہوں سے قوموں کو گذرنا پڑتا ہے۔ اور وہ آزادی سے ہمکنار ہو کر کس طرح اپنے معاملات کا انتظام وانصرام کرتے ہیں۔ یہ افکار اور خیالات ترجمہ ہو کر عوام تک پہنچتے۔ ان کے قومی شعور کو گرماتے اور حقوق طلبی کا داعیہ ان میں پیدا کرتے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں اکثر اسلامی ممالک یورپ کے زیر اقتدار آ چکے تھے۔ پھر ان ممالک میں سیاسی بیداری کی لہر اٹھی جس سے غیر ملکی حاکموں کو حکومت چلانا مشکل ہو گیا۔

جدید نسل جس نے غیر ملکی حکمرانی میں نشوونما پائی تھی مغربی افکار کو آسانی سے قبول کرنے لگی۔ لیکن اس کا قومی شعور بھی بیدار ہونے لگا تھا۔ باپ اور بیٹے کے خیالات میں زمین وآسمان کا فرق پیدا ہونے لگا۔ اب دونوں کا اثر نمایاں تھا۔ یہ تفاوت۔ کپڑوں۔ نظام تعلیم وتربیت۔ عدالت ہائے دیوانی اور شرعی۔ سبب اور مسبب۔ علمی تجارت پر عمل اور تقدیر پر ایمان میں نمایاں تھا۔

اس فکر ونظر کے اختلاف نے عقلیات کو بھی متاثر کیا۔ ان اختلافات کو ختم کرنے کے لئے مصلحین سرگرمی سے مصروف عمل رہے ہیں۔ تاکہ مفید باتیں باقی رہ جائیں اور غیر نفع بخش مٹ جائیں

مشرق میں مغربی تمدن کے مظاہر کی تطبیق میں یوں بھی مشکل پیش آئی کہ مغرب میں تمدن کی نشوونما بتدریج ہوئی تھی۔ اور تاریخ۔ طبعی ظروف واحوال سے اس کا رشتہ پیوستہ تھا۔ لیکن مشرق کو اس کا دفعتاً سامنا کرنا پڑا۔ یہ مغربی تمدن۔ ہماری عادات۔ تقالید اور موروثی افکار کے متباین تھا۔ مشرق کے مزاج اور اخلاق کے مخالف تھا۔ اس میں ضرر رساں اور نفع مند دونوں چیزیں تھیں۔ اس سے فکری نزاع پیدا ہوا۔ نفع مند سے ضرر رساں عناصر کو علیحدہ کرنے کیلئے گہرے سوچ بچار کی ضرورت تھی۔

انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں مشرق نے گہری نیند سے انگڑائی لی۔ ہر ملک میں سیاسی ماحول

کا ظہور ہوا۔ جنہوں نے قوم کو آزادی کا سبق دیا اور سمجھایا کہ دوسروں کو ان کے اوپر حکومت کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ یہ سیاسی راہنما اجنبی تسلط کی ہر ممکن طریقے سے مخالفت کرتے اور اس کی راہ میں روڑے اٹکاتے تھے۔ بیسویں صدی میں آزادی کی تحریکوں نے زور پکڑا۔ لیکن بجائے اس کے کہ یورپ۔ ان جذبات کی قدر کرتا اور سیادت سے دست بردار ہو جاتا۔ اس نے آزادی کے مطالبہ کی سختی سے مخالفت کی۔ اس طرح مشرق کو مغرب سے نفرت ہو گئی۔ دونوں میں اختلاف کی خلیج وسیع ہوتی گئی۔ ان ایام میں بعض اجتماعی مصلحین بھی پیدا ہوئے تھے۔ جو داخلی اصلاح کی دعوت دیتے تھے۔ لیکن ان کی آواز سیاسی ہنگاموں میں دب کر رہ گئی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مصر میں قاسم امین کے بعد کوئی دوسرا اجتماعی مصلح پیدا نہیں ہوا۔ اگرچہ سیاسی لیڈروں کی کمی نہ تھی۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ عوام اجتماعی مصلحین کی بجائے سیاسی لیڈروں کی آواز پر زیادہ کان دھرتے ہیں۔

مشرق کے حصے بخرے کرنے کے لئے یورپین اقوام میں سرپھٹول رہا کرتی تھی۔ اسکا نتیجہ پہلی جنگ عظیم کی صورت میں نمودار ہوا۔ جوں جوں لڑائی کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہر فریق یہ کوشش کرتا کہ جیسے بھی بن پڑے۔ وہ لڑائی میں کامیاب رہے۔ اس کے لئے مشرقیوں سے وعدے ہوئے کہ مدد کی صورت میں ان کی آرزوؤں کی تکمیل کی جاسکے گی۔ اس ضمن میں بلند بانگ تقریریں کی گئیں۔ محکوم قوموں کی آزادی کے حق میں نئے نئے دلائل پیش کئے گئے لیکن جب جنگ ختم ہوئی اور جلسوں اور کانفرنسوں کا دور آیا تو تمام وعدے فراموش کر دیئے گئے۔ اس سے مشرق کی عزت وقار کو ٹھیس لگی اور اس کی ناراضگی ناقابل بیان تھی۔

اس مایوسی کا یہ نتیجہ نکلا کہ آزادی کی جنگ زور شور سے لڑی گئی۔ غیر ملکی حکومت سے تعاون کرنے والوں کی آواز پست ہوتی گئی اور ترک موالات کرنے والوں ....

کا شور و غوغا بڑھتا گیا۔ دوسری جنگ عظیم کا موقعہ آیا تو حالات بدل چکے تھے۔ مشرق پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ اس کا بازو زور آور ہو گیا تھا۔ بعض مشرقی ملکوں نے آزادی حاصل کر لی تھی۔ بعضوں نے نیم آزادی بعض اس نعمت سے محروم تھے۔ کیونکہ ہر ملک کے حالات جدا جدا تھے۔ بہر حال ترقی یافتہ ملک غیر ترقی یافتہ کی ہمت بندھاتا۔

دوسری جنگ عظیم نے عالمی قلق و اضطراب کو بے نقاب کر دیا تھا۔ جدید تمدن کے بہت سے اصول

اکھڑ چکے تھے۔ مختلف سیاسی اور اجتماعی مذاہب ایک دوسرے سے الجھے ہوئے تھے۔ حکمرانی کے اصول متزلزل ہو رہے تھے۔ جہاں قدیم روش سے بیزار تھا۔ دل پسند جدید طور طریقوں کی طرف اس کی رسائی نہ ہو سکی تھی۔ یہ شک و اضطراب آج بھی قائم ہے۔

اس عدمِ اطمینانی میں مشرق بھی شریک ہے اس کو اپنے مستقبل کی فکر ہے۔ وہ اس سوچ میں ہے کہ مغرب کے مقابلہ میں اسکا کیا موقف ہوگا۔ اس بے چینی اور اضطراب نے مشرق کو بڑے بھاری خطرات سے دوچار کر دیا ہے۔ اس کے راہنما امن و سلامتی کے راستہ کی تلاش میں ہیں۔

مشرق کی اجتماعی مشکلات سیاسی مشکلات سے کم نہ تھیں۔ مشرق میں زراعت، صنعت اور تجارت پرانی ڈگر پر قائم تھی۔ یہاں قدیم طریقوں کے مطابق کاشت ہوتی تھی جسکا علم و فن سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ابھی تک قدیم آلات سے کام لیا جاتا تھا۔ ملکی صنعت بھی بالکل سادہ تھی۔ اگر کوئی نئی چیز پیدا ہوتی تو وہ امیروں کے کام آتی۔ تجارت معاملات کے طور طریقوں اور لین دین پر قائم تھی۔ مغربی تہذیب کا سیلاب آیا تو پرانی قدریں یکسر بدل گئیں۔ زراعت ایک مستقل بالذات علم بن گیا جسمیں جدید آلات سے کام لیا جاتا تھا۔ صناعت کا پہلے انسان کے بازو اور حیوان کی طاقت پر مدار تھا۔ اب بھاپ اور بجلی کی کارفرمائی تھی۔ ان سے سالوں کی پیداوار ایک دن میں ہونے لگی۔ صنعتی ترقی سے قیمتیں گرنے لگیں۔ مغربی مصنوعات سے مشرق کے بازار بھر گئے تجارت کا بھی یہی حال تھا۔ اس کی ترقی کے لئے جدید اسالیب سے مدد لی گئی۔ افراد کی بجائے کمپنیاں قائم ہونے لگیں۔ اب انفرادی سرمایہ کی بجائے مشترکہ اور بھاری سرمایہ سے کام ہونے لگا۔ لین دین کے معاملات میں جدید طور طریقے استعمال ہونے لگے جو فتح مند قوموں کے ساتھ مشرق میں آئے تھے۔

مشرق میں یورپی تاجر علم اور تجربہ کی بنا پر فوقیت رکھتے تھے۔ لہٰذا دیسی دوکانداروں کو انکے خوانِ نعمت کے ریزے ہی مل سکتے تھے۔

بالآخر ان معاملات میں بھی مشرق کا شعور بیدار ہونے لگا۔ زراعت کے جدید آلات استعمال میں آنے لگے۔ یورپ کی صنعتی برتری ان کی سمجھ میں آنے لگی۔ اور وہ اس کی تقلید کرنے لگے۔ لیکن ان کو جلد ہی پتہ لگ گیا کہ صرف زراعت ہی قوموں کی زندگی کے لئے ناکافی ہے۔ وہ صنعتی آلات سے بھی فائدہ اٹھانے لگے۔ ملکی صنعت کے تحفظ کے لئے درآمدی اشیاء پر محصول بڑھا دیا گیا۔ تجارت اور مالی معاملات میں بھی یہی حال تھا۔ مشرق نے مغرب کے اصولِ تجارت اختیار کر لئے۔ اس کے لئے کمپنیاں بنائی گئیں

اس سے صنعت اور تجارت کی گرم بازاری ہونے لگی۔ لوگوں نے یہ گر سمجھ لیا تھا کہ سیاسی آزادی اقتصادی آزادی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ لیکن ابھی تک مشرق منزل مقصود سے دور ہے۔ زراعت کی بنیاد اب بھی علم پر مبنی نہیں ہے۔ صنعتوں میں پختگی اور پائیداری نہیں ہے۔ مالی معاملات کو اچھی طرح نہیں سمجھا گیا۔ اور نہ ان سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ ہمیں اب تک ماہروں کا انتظار ہے۔

انیسویں صدی عیسوی سے مشرقی اقوام کی زندگی دو مختلف عناصر پر مبنی رہی ہے۔ قدیم افکار جو ورثہ میں ملے ہیں۔ جدید افکار جو مغربی تمدن کی پیداوار ہیں۔ اس کا ظہور ملبوسات، مکانات، محافل اور نئے خیالات کی صورت میں ہوا ہے یہ دونوں عناصر مل کر عجیب و غریب عمل کر رہے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ایک آدمی جبہ۔ قبا اور طربوش پہنے ہوئے ہے۔ وہ انگلستان کے بنے ہوئے ٹیلیفون سے بات چیت کرتا ہے اس کی جیب میں سوئٹزرلینڈ کی گھڑی ہے۔ ہے۔ گھر میں عجمی سجادہ اور امریکی ریڈیو... ہے۔ ایک ہی مجلس میں گنڈے تعویذ کی باتیں ہوتی ہیں۔ ساتھ ہی ڈارون کے نظریہ نشو و ارتقا اور آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت پر بھی بحث ہوتی رہتی ہے۔ بعض لوگ ہر پرانی چیز کی پرستش کرتے ہیں اور نئی سے نفرت کرتے ہیں۔ بعض نئی چیزوں کے جان دادہ ہیں اور قدیم ان کو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ یہ عناصر ہر مشرقی ملک میں اپنا کام کر رہے ہیں۔ اگرچہ مختلف قوموں میں ان کی مقدار عمل کم و بیش ہے۔ نادار طبقہ میں قدیم عنصر نمایاں ہے۔ اونچا طبقہ اس کے برعکس ہے۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ مغربی افکار و خیالات سے زیادہ متاثر نظر آتا ہے۔ ان پڑھ عوام اور قدیم یافتہ طبقہ پرانے خیالات کا حامل ہے۔ ان دونوں عناصر کی ترکیب اور امتزاج سے محاسن و معائب ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ قدیم و جدید دونوں میں بھلائی اور برائی ہے۔ اب کس حد تک ان دونوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اس پر مصلحین غور و فکر میں مصروف ہیں۔

انیسویں صدی تک عورتیں پردہ میں رہا کرتی تھیں۔ اندرون خانہ ان کی تعلیم و تربیت ہوتی۔ گھر سے باہر کی دنیا کا انہیں پتہ نہ ہوتا۔ ان کی عقل و فکر محدود ہوتی۔ بچوں کی تربیت اور نگہداشت سے انہیں سروکار ہوتا۔ جدید تہذیب کا زمانہ آیا تو لڑکیوں کی تعلیم کے لئے مدارس کھولے گئے۔ اس سے اجتماعی ترقی ہوئی۔ عورتیں اپنے حقوق اور آزادی کا مطالبہ کرنے لگیں۔ آخر کار وہ بہت سے حقوق حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ لیکن حق حریت کو وہی اچھی طرح استعمال کر سکتا ہے۔ جس نے اس راہ میں تکالیف کا سامنا کیا ہو اور جسے اس کے استعمال کا بخوبی پتہ لگ گیا ہو۔ مصر میں قاسم امین اور ہندوستان میں سید امیر علی عورتوں کے حقوق کے مدعی

اور حامی تھے۔ عورتوں کے حقوق کے ناقد بھی تھے۔ لیکن عورت اب زندگی کے ہر گوشہ میں آگے بڑھ رہی ہے۔ نقاب کو خیر باد کہا جا چکا ہے۔ تعلیم کے علاوہ مساوات کے لئے قانون سازی کا مطالبہ جاری ہے۔ وہ ہر کام میں مردوں کی برابری چاہتی ہیں۔ اس سے مشکلات کا پیدا ہونا ناگزیر تھا جن کے حل کرنے کیلئے مصلحین اور مصلحات کی ضرورت ہے۔

ساتھ ہی اس گھرانے کی مشکلات بھی پیدا ہوئیں۔ گھر میں پہلے باپ کی حکومت ہوا کرتی تھی۔ گھر کے تمام افراد اس کے تابع فرمان ہوتے۔ باپ ہی گھر کی مالی، اقتصادی اور اجتماعی حالت کا ذمہ دار ہوتا۔ مغربی تمدن نے مشرق پر یورش کی تو اپنے ساتھ آزاد خیالات بھی لایا۔ عورت نے پردہ ترک کر دیا اور گھر کے انتظام میں مرد کی شرکت ہونے لگی یعنی آمدنی اور خرچ کی نگران بننے لگی۔ اب گھر کے تمام معاملات عورت کے مشورہ سے طے پاتے ہیں۔ سینما اور تھیٹر کی بھی زیارت ہوتی رہتی ہے۔ اب لڑکے اور لڑکیاں بھی خانگی امور میں رائے زنی اپنا حق خیال کرتی ہیں۔ ان کے آراء و نظریات میں تصادم بھی ہو جاتا ہے۔ عورت کا مطالبہ ہے کہ شادی کی عمر مقرر کر دی جائے۔ اور آدمی کے حق طلاق کو محدود کر دیا جائے۔ تعدد ازدواج کو روک دیا جائے۔ ان میں سے بعض مطالبات منظور ہو چکے ہیں اور باقی ماندہ کے لئے اصرار جاری ہے۔ مختصر طور پر عائلی زندگی میں کئی مشکلات پیدا ہو چکی ہیں۔

تعلیم طرز قدیم پر دی جاتی تھی۔ ہم علی مبارک پاشا اور سر سید احمد خاں کے حالات میں بیان کر چکے ہیں کہ تعلیم کے نئے طریقوں کو اپنا لیا گیا تھا۔ لیکن اس سے بھی تعلیمی مشکلات کا سدباب نہ ہو سکا۔ عوام کی بیشتر تعداد ابھی تک ناخواندہ اور کندۂ ناتراش ہے۔ یورپی تعلیم کے بعض اصول مشرقی حالات سے میل نہیں کھاتے۔ ملک ابھی تک دو طبقوں: تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ میں منقسم ہے۔ یہ افسوسناک حالت اصلاح کی محتاج ہے۔

عالم عرب کی سب سے بڑی مشکل دو زبانوں کا استعمال ہے۔ عامی اور علمی زبان دونوں میں حیرت انگیز تفاوت ہے۔ عامی زبان گھروں اور بازاروں میں بولی جاتی ہے۔ مجالس میں اسی سے کام لیا جاتا ہے۔ علمی زبان لکھنے پڑھنے کے کام آتی ہے۔ ایک کو دوسرے کے قریب کرنے کی کوئی بھی کوشش کامیاب نہیں ہو سکی۔ علمی زبان اس لحاظ سے تہی مایہ ہے کہ اس میں روزمرہ کے استعمال کی طاقت اور قوت پیدا نہیں ہو سکی۔ عامی زبان شعراء اور ادباء کے نتائج فکر سے محروم ہے۔ اس مشکل کے حل کے لئے

بھی مصلحین کی ضرورت ہے۔

پھر غربت تمام مشکلات کی جان ہے۔ مشرقی اقوام کا سوادِ اعظم سدِ رمق سے محروم ہے۔ وہ تنگ و تاریک گھروندوں میں رہتا ہے۔ گندے کپڑے پہنتا ہے۔ غربت، جہالت اور بیماری ایسے عناصر ہیں جن کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ قوم کے طبقات میں نمایاں فرق ہے۔ ملک کے حالات امن اور اطمینان سے طے پاتے تھے۔ جب کہ کسان، مفلوک الحال اور غریب کاریگر تقدیر پر شاکر تھا...... زندگی کے مطالبات محدود تھے۔ ہر طرف ارزانی تھی۔ اس کے بعد زندگی کے تقاضے بڑھنے لگے۔ بہت سی غیر ضروری چیزوں کو ضروری سمجھا جانے لگا۔ مغرب کے مزدوروں کی اصلاح و درستی کی خبریں مشرق میں آنے لگیں۔ اب کسانوں اور کاریگروں کو بھی خیال آنے لگا کہ اچھی زندگی گزارنا ان کا بھی حق ہے۔ اس سے اضطراب اور انتشار پیدا ہونے لگا۔ حکومتیں فقر و فاقہ کے اسباب اور اس کا علاج ڈھونڈنے لگیں۔ لیکن ابھی تک خاطر خواہ کامیابی نہیں حاصل ہو سکی

پہلی جنگ عظیم کے بعد مغرب میں مختلف سیاسی نظریات کا ظہور ہوا۔ نازی ازم۔ اشتراکیت۔ کمیونزم اور جمہوریت۔ ان میں ہر ایک کا سیاسی، مالی اور اجتماعی نظام علیحدہ علیحدہ تھا۔ یہ نظریات ایک دوسرے کے بدترین دشمن بھی تھے۔ ان کے پیروکار اپنے نظریہ کی حمایت و اشاعت اور دوسرے کی تشہیر اور عیب جوئی میں خوب پراپاگنڈہ کرتے۔ دوسری جنگ کے زمانہ میں ان کی پیکار میں اور اضافہ ہوا۔ بعض نے یہ شگون لیا کہ اب دنیا میں امن و اطمینان کا دور دورہ ہوگا۔ لیکن ان کی امیدیں غلط ثابت ہوئیں۔ فکری آویزش بڑھتی چلی گئی۔ یہ فکری نزاع مشرق میں منتقل ہوئی تو یہاں بھی ہیجان بپا ہوا جس سے راہنماؤں کو فکر لاحق ہوا اور وہ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ اس تنگی سے نکلنے کا کونسا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ اب اطمینانِ خاطر کیسے حاصل ہوگا؟!

مغرب کے تمدن کی چھاپ سراسر مادی ہے۔ مغرب والے صرف مادہ کے پرستار ہیں۔ علم ہے تو مادی وسائل کی پیداوار کے لئے اور جو مادی نہیں وہ صرف خیالی ہو سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی نظروں میں اخلاقی، دینی اور فنی قدریں محض اعتباری ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ لوگ کیمسٹری اور فزکس کی عبادت کرتے ہیں۔ علم النفس کو بھی مادی لباس پہنا دیا گیا ہے۔ افکار اور تحریکات جو کہ نفس کے مختلف مظاہر ہیں یہ سب جسمی مادہ کے نتائج ہیں۔ کون و مکان کے حوادث کی مادی تفسیر کی جاتی ہے۔

برخلاف اس کے مشرق اپنے مذہب پر نازاں تھا۔ اسے اپنی روحانیت پر غرور تھا۔ اس نے یہ مادی افکار سنے تو اس کے غصہ کی کوئی حد نہ رہی۔ بعض مصلحین از قسم سید جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ دین کی خوبیاں بیان کرتے تھے۔ ملحدوں کا رد کرتے تھے۔ اس سے مومنوں اور ... منکروں کے درمیان خوب جھگڑا ہوا۔ بیسویں صدی آئی تو مادہ اور اس کی تکوین میں تحقیقات نے بڑی ترقی حاصل کر لی تھی۔ بہت سے علماء اس کے قائل تھے کہ صرف مادی تفسیر سے کون و مکان کے اسرار و رموز کی تشریح نہیں ہو سکتی۔ ناچار انہوں نے پھر مذہب اور روحانیت کا سہارا لیا۔ اب الحاد کے بعد ایمان کا دور دورہ ہوا۔ مشرق تو ہمیشہ سے مذہب سے متاثر رہا ہے۔ تمام مذاہب مشرق کی پیداوار ہیں۔ مشرقیوں کا اعتقاد ہے کہ مذہب زندگی کا سہارا اور زندگی کے بعد اس کی امیدوں کا ملجا و ماویٰ ہے۔ پھر سچا مذہب علم کا مخالف نہیں ہو سکتا۔ اس کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ خصوصیات ہیں۔ لیکن دین اور علم کی کیا حدود ہیں۔ وقت گذرنے سے مذہب میں بہت سے اوہام اور خرافات شامل ہو چکے ہیں۔ بعض عقائد صحیح اصولوں کے متناقض ہیں۔ لیکن یہ تطہیر اور صفائی کیسے ہو سکے؟ یہ بھی مصلح رہنماؤں کا کام ہے۔

یہ مشرق کی مشکلات کا چلتا سا بیان ہے۔ زمانہ نے ہمیں سکھلایا ہے کہ زندگی کی تجدید ہوتی رہتی ہے۔ اسی نسبت سے اس کی مشکلات بھی نئی شکلوں میں ظہور پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ جوں جوں تمدن کا احاطہ وسیع ہوتا جائے گا۔ ان کی مشکلات میں بھی روز افزوں اضافہ ہوتا رہے گا۔ جب کوئی قوم اندھیری رات میں حیران ہو کر دوراہے پر کھڑی ہو جاتی ہے تو اس کے رہنما اس کا ہاتھ پکڑتے ہیں اور ایک ہوشیار اور ماہر ملاح کی طرح مشکلات کی تیز و تند ہواؤں سے قوم کی کشتی کو بچا کر سلامتی کے کنارے پہنچا دیتے ہیں۔ مصلح راہنما کا کام سب سے مشکل اور اہم ہوتا ہے۔ اُسے گہرے غور و فکر کی ضرورت پڑتی ہے۔ تاکہ وہ مشکلات کی تمام جوانب کو اچھی طرح سمجھ لے۔ پھر غور و فکر کی روشنی میں نظام عمل وضع کرے اور دعوت کی قبولیت کے لئے رائے عامہ ہموار کرے اور اس میں غرض مقصود کے حصول کے لئے جوش عمل پیدا کر دے۔ اس راہ میں صعوبتیں اور دشواریاں پیش آتی ہیں۔ اصلاح کی راہ میں جا بجا کانٹے بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ اصلاح نئی چیز کی دعوت دیتی ہے جس سے عوام مالوف نہیں ہوتے وہ قدیم پر ہٹے ہوئے ہوتے ہیں نئی چیزوں سے بدکتے ہیں اور آمادہ پیکار ہو جاتے ہیں۔ جب مصلح اپنی دعوت میں سرگرمی دکھاتا ہے۔ تو مخالفوں کی دشمنی بھی بڑھتی جاتی ہے۔ یہ دشمنی ایذاء کا رنگ اختیار کر

لیتی ہے۔ مصلح کی عقل۔ امانت اور شرافت اور عزت کو متہم کیا جاتا ہے۔ جب آنحضرت صلعم نے ورقہ بن نوفل کے پاس اپنی دعوت پیش کی تو اس نے کہا۔ "تم جیسے دعوت دینے والوں کو ہمیشہ ستایا گیا ہے۔" ہم نے کتاب میں مصلحین کا ذکر کرتے ہوئے ان کی ایذا رسانی کے واقعات بھی لکھے ہیں۔ ان میں کوئی تو ملک بدر کیا گیا کوئی قید کیا گیا اور کسی کو جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ مصلح اسوقت تک صحیح معنوں میں مصلح نہیں ہو سکتا۔ جب تک وہ اپنی دعوت کی صحت پر پختہ ایمان نہ رکھے۔ اس اصلاح کے مبادیات اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہوں۔ وہ ظلم و ستم پر صبر کرے۔ تکالیف کو جرأت سے برداشت کرے۔ یہاں تک کہ اس کی دعوت کے اغراض و مقاصد پورے ہو جائیں۔

ہر زمانہ میں ہر نسل کی علیحدہ علیحدہ مشکلات ہوتی ہیں۔ اس کے مزاج اور زمانہ کی ضروریات کے پیش نظر مصلحین کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔ ایک مصلح رہنما کے لئے ضروری ہے کہ اپنی قوم کے حالات سے باخبر ہو۔ اس کی زندگی کے چھپے ہوئے گوشے اس کی آنکھوں کے سامنے ہوں۔ قوم کی نفسیات کا ماہر ہو۔ توجیہات کے مختلف طریقوں کو جانتا ہو۔ قوم کو اس کی زبان میں اچھی طرح مخاطب کر سکتا ہو اس کی باگ ڈور سنبھال سکتا ہو ان میں محبوبی اور شیفتگی پیدا کر سکتا ہو۔ اس کے لئے لازم ہے کہ ذاتی طور پر اس میں کوئی نقص اور عیب نہ ہو۔ بلکہ خوبی اور اچھائی میں وہ ساری قوم سے بڑھا ہوا ہو۔ ان بزرگوں نے اصلاح کا بیج بویا تھا۔ اور ہم نے اس کا پھل پایا۔ جزا اور وفا کا تقاضا ہے کہ ہمارے نوجوان بھی اصلاح کے کام میں ان کے نقش قدم پر چلیں اور آئندہ نسل کے لئے نیک کام کا بیج بوتے جائیں۔ (احمد امین)

---

۵ ذی الحجہ ۱۳۸۲ھ
مطابق ۳۰ اپریل ۱۹۶۳ء

نذیر حسین۔

(پاکستان ٹائمز پریس لاہور)